

تذکرہ  
میرزا محمد رفیع

تصانیف  
میرزا محمد رفیع

تصانیف

میرزا محمد رفیع  
تصانیف

# تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ  
نامور مصاحبین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف  
ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ

پبلشرز: مجلس نشریات اسلام

نور آباد - فتح گڑھ - سیالکوٹ  
مفتی اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریات اسلام

۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن: ناظم آباد کراچی ۱۵

جملہ حقوق طباعت و اشاعت پاکستان میں  
بحق فضل ربی ندوی محفوظ ہیں۔

## مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس نظامی و مجلس دارالضیفین عظیم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیہ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق ڈیزمنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب	تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ اول)
تصنیف	مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت	شکیل پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت	۳۶۴ صفحات

ٹیلیفون : ۶۲۱۸۱۴

سناکٹ : مکتبہ ندوۃ تاسم سینٹر، دو بازار کراچی

ناشر

فضلہ ربیہ ندوی

مجلس نشریات اسلام، کے۔ ۲، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰

# تالیخ دعوت و عزیمت

(حصہ اول)

عربی \_\_\_\_\_ کویت و بیروت  
 انگریزی \_\_\_\_\_ لکھنؤ، کراچی  
 اردو \_\_\_\_\_ لکھنؤ  
 اردو \_\_\_\_\_ کراچی

# فہرست

## تاریخ دعوت و عزیمت

### حصہ اول

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۴	حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بانشینی	۹	دیباچہ طبع دوم
۳۵	خلافت کے بعد ان کی زندگی	۱۱ - ۱۶	پیش لفظ
۳۷	ان کی انقلابی اصلاحات		مقدمہ
۳۸	اعمال و اخلاق کی طرف توجہ		اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل
۳۹	تدوین علوم اور اجائے سنن	۱۷ - ۳۰	
۴۰	چند خطوط و قراین	۱۷	زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے
۴۸	تبلیغ و اشاعت اسلام کی طرف توجہ	۱۸	امت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے
۴۹	ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا رد عمل	۱۸	اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات
۵۰	ان کی زندگی کا جوہر	۱۹	اسلام کے قلب و جگر پر حملے
۵۱	حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات	۲۰	دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی
	دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت حسن بصری	۲۶	مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت
	۵۳ - ۶۸	۲۷	ہر نئے فتنے اور نئے خطرے کے لئے انہی شخصیت و طاقت
۵۳	امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف	۲۸	تاریخ کے گم شدہ مآخذ
۵۴	تابعین کی دعوتِ ایمانی	۲۹	اسلام کی میراث
۵۵	حضرت حسن بصری		پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیز
۵۵	حسن بصری کی شخصیت ان کی داعیہ صلاحیتیں		۳۱ - ۵۲
۵۷	حسن بصری کے مواعظ	۳۱	عہدِ اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات
۶۳	ان کی حق گوئی و مہربانی	۳۲	عہدِ اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر
۶۳	اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین	۳۳	انقلابِ حکومت کی ضرورت اس کی مشکلات

۹۶	واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے	۶۵	تفاق و منافقین کی نشاندہی
۹۹	بے نظیر عزیمت و استقامت	۶۷	حسن بصری کی وفات اور ان کی مقبولیت
۱۰۰	امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ	۶۷	انقلاب حکومت کی کوششیں
فتنہ الاعتزالی اور ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو ۱۱۸-۱۰۳		خلافت عباسیہ اور دینی دعوت و تذکیر ۷۲-۶۹	
۱۰۳	معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات	۶۹	خلافت عباسیہ اور اس کے اثرات
۱۰۴	سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت	۷۰	یقین کے داعی الی اللہ
۱۰۵	امام ابوالحسن اشعری	تدوین حدیث و فقہ ۸۳-۷۳	
۱۰۶	امام ابوالحسن اشعری کا جذبہ تبلیغ و احقاق حق		
۱۰۶	ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات	۷۳	امت کی دو فوری ضرورتیں
۱۰۸	ان کا مسلک اور ان کی خدمات	۷۵	تدوین حدیث
۱۱۳	ان کی تصنیفات	۷۵	محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی
۱۱۴	عبادت و تقویٰ	۷۶	فن اسرار الرجال
۱۱۶	وفات	۷۷	محدثین کی احتیاط و امانت
۱۱۶	امام ابو منصور ماتریدی	۷۸	قوت حافظہ اور استحضار
۱۱۶	اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر	۷۹	مجالس درس میں سامعین کا ہجوم
علم کلام کا انحطاط فلسفہ اور باطنیت کا فروغ		۷۹	صحاح ستہ
اور ایک نئے متکلم کی ضرورت ۱۱۹-۱۲۹		۸۰	تدوین فقہ
		۸۱	ائمہ اربعہ اور ان کی خصوصیات
		۸۲	ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین
۱۱۹	علم کلام کا انحراف و انحطاط	۸۲	تدوین فقہ کا فائدہ
۱۲۰	فلسفہ کا رواج	فتنہ خلق قرآن اور امام احمد بن حنبل ۸۴-۱۰۲	
۱۲۱	فلسفہ یونان کے عرب ناقل و شارح		
۱۲۱	جماعت اخوان الصفا اور اس کے رسائل	۸۴	فلسفہ الہیات اور ذات و صفات کی بحثیں
۱۲۲	معتزلہ و فلاسفہ کا فرق	۸۵	معتزلہ کا عروج
۱۲۳	باطنیت کا فتنہ	۸۶	امام احمد بن حنبل
۱۲۴	ظاہر و باطن کا معالطہ	۹۴	فتنہ خلق قرآن
۱۲۶	نبوت محمدی کے خلائق بنیاد	۹۶	امام احمد ابتلاء و امتحان میں

۱۹۶	بعداد کے دو دوائی	۱۲۸	ایک نئی شخصیت کی ضرورت
	حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ۱۹۷-۲۲۲		امام غزالیؒ ۱۳۰-۱۹۶
۱۹۷	تعلیم و تکمیل	۱۳۰	تعلیم اور علمی عروج
۱۹۸	اصلاح و ارشاد اور رجوع عام	۱۳۱	گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات
۱۹۸	محامد و اخلاق	۱۳۷	فلوت سے جلوت کی طرف
۲۰۱	مردہ دلوں کی سببائی	۱۳۱	امام غزالیؒ کا تجدیدی کام
۲۰۲	تعلیمی مشاغل و خدمات	۱۳۱	فلسفہ پر عمل جراحی
۲۰۳	استقامت و تحقیق	۱۳۵	تہافت الفلاسفہ کا اثر
۲۰۴	تفویض و توجید	۱۳۵	باطنیت پر عمل
۲۰۵	خلق خدا پر شفقت	۱۳۶	زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ
۲۰۶	حضرت شیخ کا عہد اور ماحول	۱۳۶	احیاء علوم الدین
۲۰۸	مواعظ و خطبات	۱۳۸	تفقید و احتساب
۲۰۸	توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی	۱۳۹	علماء و اہل دین
۲۱۲	فگتہ دلوں کی تکمیل	۱۵۶	حکام و سلاطین
۲۱۳	دنیا کی صحیح حیثیت	۱۶۲	مسلمانوں کے دوسرے طبقے
۲۱۵	خلفاء اور حکام وقت پر تنقید	۱۶۷	ایک اصلاحی و تربیتی کتاب
۲۱۷	دین کے لئے دل سوزی اور فکر نندی	۱۶۸	احیاء العلوم اور فلسفہ اخلاق
۲۱۸	بیعت و تربیت	۱۶۸	حب جاہ
۲۲۱	زمانہ پراثر	۱۷۷	محاسبہ نفس
۲۲۱	وفات	۱۸۲	احیاء کے ناقد
	علامہ ابن جوزیؒ ۲۲۵-۲۵۱	۱۸۲	امام غزالی اور علم کلام
۲۲۵	ابتدائی حالات اور تحصیل علم	۱۸۷	تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت
۲۲۶	کتابت حدیث میں انہماک	۱۹۰	بقیہ زندگی اور وفات
۲۲۶	ذوق مطالعہ	۱۹۲	امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں
۲۲۷	تصنیف و تالیف اور تبحر علمی	۱۹۲	امام غزالی کا عالم اسلام پراثر
۲۲۷	تقویٰ اور ذوق عبادت	۱۹۵	عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت و اصلاح عام اور بغداد کے دہائی الی
			داعی کی علمی صلاحیتیں

۲۶۶	فتح بیت المقدس	۲۲۹	ظاہری محاسن و اوصاف
۲۶۸	اسلامی اخلاق کا مظاہرہ	۲۲۹	بلند سمی اور جامعیت کا شوق
۲۶۹	صلیبی سیلاب	۲۳۲	محاسن و عطا اور تاثیر
۲۷۰	صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل	۲۳۳	ان کی ناقذانہ تصانیف
۲۷۳	وفات	۲۳۳	کتاب الموضوعات
۲۷۴	درویش سیرت سلطان	۲۳۴	تلبیس ابلیس
۲۷۷	محاسن اخلاق	۲۳۴	مختلف طبقات پر تنقید
۲۷۹	مردانہ اوصاف	۲۳۹	صید الخاطر
۲۸۱	علم و فضیلت	۲۴۰	عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج
۲۸۲	فاطمی حکومت کا زوال اور سلطان صلاح الدین	۲۴۲	واقعات زندگی اور نفس سے مکالمہ
	کا دوسرا کارنامہ	۲۴۶	سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت
	شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام	۲۴۷	صلوئے امت کی سیرت
	۲۸۷ - ۳۰۲	۲۴۷	تاریخ کی اہمیت
۲۸۷	علمی عظمت	۲۴۹	تاریخی تصنیفات
۲۸۹	سلاطین کو صلاح نیک اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی	۲۵۰	ادبیت و خطابت
۲۹۱	بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت	۲۵۱	وفات
۲۹۳	شیخ عز الدین مصر میں		
۲۹۳	فتح کی حق گوئی و بیباکی		
۲۹۵	فرنگیوں سے جہاد	۲۵۲	نور الدین زنگی اور صلاح الدین الیوبی
۲۹۵	مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام	۲۵۴	۲۵۲ - ۲۸۶
۲۹۶	امراء سلطنت کا نیلام	۲۵۵	صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ
۲۹۷	شیخ عز الدین اور سلاطین مصر	۲۵۶	اتابک عماد الدین زنگی
۲۹۸	سکرام اخلاق	۲۵۹	الملك العادل نور الدین زنگی
۲۹۹	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور شیخ کا مسلک	۲۶۱	نور الدین کے محامد و اوصاف
۳۰۱	شیخ کی تصنیفات	۲۶۲	شوق جہاد اور ایمان و یقین
۳۰۲	شیخ کی وفات	۲۶۳	سلطان صلاح الدین الیوبی
	فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش ۳۰۳-۳۳۳	۲۶۴	زندگی میں تبدیلی
۳۰۳	تاتاری حملے اور اس کے اسباب	۲۶۵	جہاد کا مشق
			خطین کی فیصلہ کن جنگ
			سلطان کی دینی حیثیت



۳۵۴	رفقار کے انتخاب کا سبب	۳۱۴	اسلام کے شرقی ممالک تاتاریوں کی زد میں
۳۵۵	مولانا کی وفات	۳۱۷	بغداد کی تباہی
۳۵۷	اخلاق و خصوصیات	۳۲۲	تاتاریوں میں اسلام کی اشاعت
۳۵۷	ریاضت و مجاہدہ		مولانا جلال الدین رومیؒ ۳۳۵ - ۴۰۰
۳۵۸	نماز کی کیفیت		
۳۵۹	زہد و قناعت	۳۳۵	علم کلام و عقلیت کا بحران
۳۵۹	قیاضی و ایثار	۳۳۷	صاحبِ دل مشکلم کی ضرورت
۳۵۹	بے نفسی اور فنائیت	۳۳۷	مختصر حالات
۳۶۰	کسبِ حال	۳۳۸	خاندان اور والدین
۳۶۰	اہل دنیا سے کیسوی	۳۳۸	مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم
۳۶۰	مثنوی معنوی اور اس کا علمی اور اصلاحی مقام و پیمانہ	۳۳۹	والد کی بلخ سے ہجرت
۳۶۰	مثنوی معنوی	۳۴۰	مولانا قونیہ میں
۳۶۲	عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید	۳۴۱	آپ کے تعلیمی سفر اور شاغل
۳۶۸	دعوتِ عشق	۳۴۳	انقلابِ حال
۳۷۳	جہانِ دل	۳۴۳	شمس تبریزی
۳۷۵	مقامِ انسانیت	۳۴۴	مولانا کی ملاقات اور تغیرِ عظیم
۳۷۹	دعوتِ عمل	۳۴۶	شورشِ عام
۳۸۲	عقائد و علم کلام	۳۴۶	شمس کی غیبت
۳۸۳	وجودِ باری	۳۴۷	مولانا کی بے قراری اور شمس کی واپسی
۳۸۶	نبوت اور انبیاء	۳۴۸	شمس کی دوبارہ غیبت
۳۸۹	سعاد	۳۴۹	مولانا کی بیتابی
۳۹۲	جبر و اختیار	۳۵۱	سفر شام اور سکونِ خاطر
۳۹۳	علت و معلول	۳۵۱	شیخ صلاح الدین زرکوب
۳۹۷	مثنوی کا اثر	۳۵۳	پہلی حسام الدین
۴۰۱	اشاریہ (انڈکس) از مجدد غیاث الدین ندوی	۳۵۴	مثنوی کی تحریک

## دیباچہ طبع دوم

”تاریخ دعوت و عزیمت“ حصہ اول کے دوسرے ایڈیشن پر نیا چیز مصنف کتاب الشرب مبارک و تھانے کے حضور میں بہ ہزار زبان ثنا خواں اور پاس گزار ہے۔

اس حصہ کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت کئی سال کے وقفہ کے بعد آرہی ہے، لیکن اس کی وجہ کتابوں کی نایابی، طباعت کی دشواریوں اور مصنف کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے سوا کچھ نہیں، ورنہ یہ کتاب بے صغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں میں جس طرح مقبول ہوئی، اور جس طرح اہل علم، اور اہل قلوب نے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اور اس کے پہلے ایڈیشن کے ختم میں جتنا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اس سب کا قدرتی تقاضا تھا کہ اس وقت تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہوتے، لیکن اردو کتابوں کی طباعت میں اب جو دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں، اور جن کا اندازہ کچھ مصنفین ہی کو ہے، انھوں نے اس کتاب کی اشاعت دوم میں غیر معمولی تاخیر پیدا کر دی، اس کے لئے مصنف کتاب تأسف بھی ہے اور محذرت خواہ بھی۔

کتاب کے مضامین و مواد میں تعداد و عنوانات کے لحاظ سے کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوا، لیکن جو کچھ ہوا وہ واقع اور قابل لحاظ ہے، اور اس سے کتاب کی قیمت و افادیت میں ضرور اضافہ ہوتا ہے، ان میں دو اضافے ضرور قابل ذکر ہیں، ایک عنوان ”فتنہ تاتارا اور اسلام کی ایک نئی آزمائش“ کے تحت تاتاری حملہ اور اس کے اسباب کے مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے، اس میں (مصنف کی معلومات کی حد تک) اس وقت کے عالم اسلام کے اخلاقی، معاشرتی،

دینی، روحانی اور سیاسی حالات کا پہلی مرتبہ جائزہ لیا گیا ہے اور اس فتنہ عالم آشوب اور طوفان بلاخیز کے باطنی اور غیبی اسباب کو قرآن مجید کی مشعل ہدایت لے کر اور الہی قانون مجازہ کی مدد سے معلوم کرنے اور ان کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مواد اور وقت دونوں کی کمی اور مصنف کی بعض معذوریوں کی بنا پر اس باب میں اضافہ اور ترقی کی بڑی گنجائش ہے، لیکن یہ ایک ابتدائی کوشش اور ایسا ہی فکر و نظر کا ایک نمونہ ہے جس کو بہت آگے بڑھایا جاسکتا ہے، پائیں ہمہ وہ اس موجودہ حالت میں بھی عبرت و بصیرت اور درس و مواعظت سے خالی نہیں، دوسرا اضافہ مقدمہ کتاب میں دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی کے زیر عنوان کیا گیا ہے جس میں مسیحیت اور ہندومت کی اصلاح و تجدید کے بارے میں کچھ نئے معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، ان دو اضافوں کے علاوہ اس ایڈیشن میں صرف پہلے ایڈیشن کے اغلاط کی تصحیح اور قلیل التعداد جزوی ترمیمات ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف کی یہ سعی مقبول ہو، اس سلسلہ کی ترتیب میں جو مقاصد پیش نظر رہے ہیں اور جن کا تذکرہ پیش لفظ میں کیا گیا ہے ان کی تکمیل ہو۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔

ابوالحسن علی ندوی

دارۃ شاہ علم الشریعہ رائے بریلی

۳۲ صفر المظفر ۱۳۸۹ھ  
۲۱ اپریل ۱۹۶۹ء دو شنبہ

## پیش لفظ

محرم ۱۴۴۲ھ میں لکھنؤ میں جماعت دعوت اصلاح و تبلیغ کی طرف سے انتظام کیا گیا کہ فقہاء کے سامنے ضروری عنوانات اور پہلوؤں پر تقریریں کی جائیں اور ان کی واقفیت اور ذہنی تربیت کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ ان تقریروں اور مضامین کا سلسلہ ایک ہفتہ جاری رہا، اس تربیتی ہفتہ میں ایک طویل اور مسلسل عنوان "اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں" تھا، یہ عنوان راقم سطور کے حصہ میں آیا تھا، اور تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر عرض کیا جاتا رہا، اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی جس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے، اجاب اس کا خلاصہ اپنے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔

بعد میں اشاعت کی نیت سے جب اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ کام بڑی توجہ اور اظہان سے کرنے کا ہے اور یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے جس پر (ہمارے محدود علم کے مطابق) کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں، اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلا ہے جس کو جلد پر ہونا چاہئے، اس خلا کے موجود ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کئی کئی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں جنہوں نے حالات سے کشمکش کی اور جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں جو فکری اور عملی

حقیقت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی و علمی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷-۸ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور بالویسی ہے، جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت و عزیمت کو پیدا کرتی رہی ہے اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک حساس کہتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

لیکن نتیجہ بے سبب نہیں، بد قسمتی سے تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرہ میں یا تو وہ کتابیں ملتی ہیں جن کو واقعات کی "فہرست" کہنا صحیح ہے اور جن کی مرکزی شخصیت بادشاہوں کی ذات ہے، یا چند نمایاں شخصیتوں کا سوانح (تراجم و تذکرے) مگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ نہیں، جن میں ان تمام شخصیتوں کی تحریکوں کا تعارف ہو، جنہوں نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اسلام کی بروقت حفاظت یا تجدید و تقویت کی خدمت انجام دی ہے، غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سدباب کیا ہے اور اسلام کے فکری اور علمی ذخیرہ میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہے، درحقیقت اسلام کے سلسلہ دعوت و اصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب و تالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پر کرنا وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی و علمی خدمت ہے۔

اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح و دعوت کی تاریخ مرتب ہو جائے گی، بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری و علمی

انحطاط و ارتقار کی تاریخ بھی وجود میں آجائے گی۔

لیکن جب اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ یا رسالہ کا مضمون نہیں ہے، یہ ایک اہم اور ضخیم تصنیف کا موضوع ہے، اس کے لئے تاریخ کو دوبارہ پڑھنا ہوگا، اور اس کو ایک خاص انداز سے مرتب کرنا ہوگا، اس کے لئے صرف تاریخ عام کا جائزہ لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ مذاہب و فرق، علوم و فنون کی تاریخ اور تراجم و تذکرے

کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھنا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون جس سکون و اطمینان اور فرصت کا طالب ہے، وہ اس

پریشان اوقات کی زندگی میں بہت کیاب ہے، پھر بھی ضرورت کے احساس نے اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور طبیعت کی افتاد سرسری طور پر گزرنے سے مانع ہوئی۔

یہ بات ناظرین کرام کے پیش نظر رہے کہ اس کتاب میں ہمیں اصطلاحی تجدید سے بحث کرنا نہیں ہے، نہ ان اشخاص کا تعین کرنا ہے، جو اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں، اور جن کی واحد ذات، نہ دینی انقلاب برپا کر دیا، اور تجدید کے شرائط پورے کئے، یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلابِ حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے، اور ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشان دہی کرنی ہے، جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے، اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے، اور مسلمان اس وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، اس مضمون میں متعدد ایسے اشخاص کا تذکرہ آئے گا، جو انفرادی طور پر تو مجدد نہیں کہے جاسکتے، مگر دین کی تجدید، احیاء اور اصلاح و انقلاب کے مجموعہ میں ان کا ضرور حصہ ہے، اور مسلمان ان کے احسان سے کبھی سیکڑوش نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے:-

(۱) کسی دعوت یا شخصیت کے حالات و مقاصد معلوم کرنے کے لئے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی گئی ہے، اگر اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی، اور خلا رہ گیا، تو اس کے رفقاء و ملازمہ اور معاصرین کی تصنیفات و بیانات کو ترجیح دی گئی ہے، آخری صورت میں بعد کے مستند ماخذوں پر اعتماد کیا گیا ہے، اس بارے میں کسی زبان یا زمانہ کی تخصیص نہیں، جہاں کوئی کام کی بات دیکھی گئی، اخذ کی گئی، اور اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

(۲) شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلہ میں ان کے گرد و پیش، اس زمانہ کی علمی و فکری سطح، اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے، اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جاسکے، کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لا کر اپنے زمانہ کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے

ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فرود گذشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے جس سے کتاب سطحی نظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیح بن جاتی ہے، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی نا انصافی اور کوتاہ نظری ہے، اس لئے کہ آدمی اپنے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور اس عہد کے میدانِ عمل کے حدود کے لحاظ سے کامیاب و ناکامیاب کہا جاسکتا ہے ورنہ عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جاسکتی ہے اور نہ صرف اسلامی تاریخ، بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جاسکتی۔

(۲) کسی صاحبِ دعوت یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے چند مختصر اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی کہ اس سے اس کے مقاصد، اس کے علمی مرتبہ اور اس کے ذہن کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہو سکتا، اور قارئین اس کا لطیف صحبت اور شرفِ ملازمت حاصل نہیں کر سکتے، اس کتاب میں ممتاز صاحبِ دعوت، مصلحین، مصنفین اور اصحابِ فکر کی تصنیفات و خطابات کے اتنے مختلف اور مبسوط اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا کچھ وقت ان کی صحبت میں گزارا، اور اس کو اطمینان کے ساتھ "دید و شنید" کا موقع ملا ہے، اس کے لئے خود مؤلف کتاب نے اپنے وقت کا ایک معتدبہ حصہ ان حضرات کی تصنیفات و مواعظ اور ان کے علمی و فکری آثار کے ماحول میں گزارا اور کوشش کی ہے کہ ان کا تذکرہ اور تعارف کرانے کے زمانہ میں وہ اپنا وقت خالص اسی ماحول میں گزارے اور ان اثرات و کیفیات کو اپنے اوپر طاری ہونے کا موقع دے، جو ان کے معاصرین اور ہمنشینوں پر طاری ہوتی تھیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں مؤلف کتاب کا قلبی رجحان صاف معلوم کر سکیں گے، اور ان کو زبان میں بھی تغیر اور صاحبِ ترجمہ کی زبان و ادب کے مناسب نظر آئے گی، یہ بات اگر کسی نقاد کی نگاہ میں قابلِ اعتراض اور کتاب کی کمزوری شمار کئے جانے کے قابل ہے، اور اس کے نزدیک مورخ کو اپنے قلم کی طرح "چوب خشک" اور ناقص لے ضمیر ہونا چاہئے تو مصنف اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے، اور اس کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

(۴) تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات، تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ

ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ اولاً تو یہ متقدمین اہل دعوت و اہل فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور عملی انہماک کے ساتھ عبادت و انابت الی اللہ کا ذوق خاص رکھتے تھے، اور ان کی کامیابی و مقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے اور اس کے تذکرہ کے بغیر ان کا تذکرہ نامکمل رہتا ہے، دوسرے اس ضخیم تصنیف اور تاریخ کے اس وسیع دفتر کے پڑھنے والے کا یہ حق اور اس کی محنت اور دقت کا یہ خاموش مطالبہ ہے کہ وہ اس سے صرف تاریخی معلومات ہی اٹھانے نہ کرے، بلکہ قلب و روح کی تازگی اور ذوق عمل کا حصہ بھی پائے۔

(۵) کسی شخصیت کے تہاوت کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل و کمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اگر اس کے منصف و محتاط معاصرین یا صاحب نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات و افکار پر تنقید کی ہے تو اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے، اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے تو اس کو بھی پیش کر دیا گیا ہے، لیکن تاریخ کو ناقدرانہ تالیف ثابت کرنے کے لئے بے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

یہ کتاب کی پہلی جلد ہے، پہلے خیال تھا کہ یہ جلد شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر تمام ہوگی، اس طرح اس حصہ میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کی تاریخ دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کی روداد آجاتی لیکن ابن تیمیہ کا تذکرہ (ان کے زمانہ کی اہمیت اور ان کے کام کی وسعت کی بنا پر) اتنا بسوٹا ہو گیا کہ اس کو کتاب کا ایک مستقل حصہ بنانا پڑا، جو اس سلسلہ کی دوسری جلد ہوگی، کتاب کا تیسرا حصہ (اور شاید چوتھا بھی) ہندوستان کے اہل دعوت و عزیمت کے ساتھ مخصوص ہوگا، جو پچھلی صدیوں میں عالم اسلام میں اصلاح و تجدید کے علمبردار اور فکر و تحقیق کا منبع و سرچشمہ تھے۔

آخر میں مولف کو صاف اعتراف ہے کہ اس کتاب کے لئے جتنی طویل مدت تصنیف، جیسا سکون خاطر،



جناب سید عتیق مطالعہ اور جیسا وسیع اور متنوع علم درکار ہے، مصنف اس سے بہرہ مند نہیں، لیکن جو کچھ بھی

اس عرصہ اور ان حالات میں ہو سکا، اور جو ناظرین کے سامنے ہے، وہ مصنف کی پریشان خاطر ہی، انتشار ذہنی اور

علمی بے بضاعتی کے پیش نظر محض تائید الہی اور توفیق خداوندی ہے، وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ

اللّٰهِ۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ حضرت شاہ علم السُّرَّاءِ بریلی

۲۴ ربیع الاول ۱۳۷۴ھ

## مقدمہ

### اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل

#### زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور کمال و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَارْتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا

نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا

اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت

(المائدہ - ۳) سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اس کا

شباب ہر وقت قائم ہے۔

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سد جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر

جس دین کو بھیجا ہے، اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی حقائق و حقائق" پر ہے، مگر وہ زندگی سے پڑھے اور حرکت اس کی

رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے، اور

ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے، جو

(اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے جو علیم و حکیم صالح کی صنعت کا

بہترین نمونہ ہے۔

ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (الانعام ۱۲) یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا۔

مَنْعَ احْتِلَالِ الَّذِي اتَّعَنَ كُلَّ شَيْءٍ (النمل ۸۸) کارگیری الشریکی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

## اُمّتِ اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے، اور یہ امتِ آخری اور عالمگیر اُمّت ہے، اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا، اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے، وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے، اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے، وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

## اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور مکان و زمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا آسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے، (اور اس وقت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا، جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور محبوباً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخِ عالم میں

جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے۔

بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی، اور زہر کو جس "تربیان" کی حاجت تھی، وہ اس امت کو عطا ہوا۔

## اسلام کے قلب و جگر پر حملے

مشرع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرے مذاہب ان کی تاب نہیں لاسکتے، دنیا کے دوسرے مذاہب جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی، اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہارہ سکے، اور انہوں نے اپنی استی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی، اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا، ایک طرف باطنیت اور اس کی شائیں، اسلامی روح، اور اس کے نظام عقائد کے لئے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے صلیبیوں کی پورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھودیتا، اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کرنے لگا، اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی، بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجیبی اثرات، شرکانہ اعمال و رسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد و لادینیت، اور عقلیت پرستی، کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا، اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لاسکے، اور ان کے سامنے سپردال دے، لیکن امت مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا، اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی، ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے تحریفات و تاویلات کا پرہ چاک کر دیا، اور حقیقت اسلام اور دین خالص کو اجاگر کیا، بدعات اور عجیبی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پُر زور حمایت کی، عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردید اور شرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانہ کے "مترفین" کی سخت مذمت کی، اور جاہر سلاطین کے سامنے

اپنے منکر و تمرد اور مستغنی آسودہ حال اور فخر البال لوگوں کو قرآن مجید "مترفین" کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔

کلمہ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی، یہ افراد داعی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے، اور طاقتور اور دلاویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لئے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "ید بریضا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا، اور حق روشن ہو گیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور امت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

## دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات و بدعات کے ترغیب سے نکالے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقت ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پُر زور صدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لئے کمر بستہ ہو کر میدان میں آجائے، اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانیوں سے اس مذہب کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دے۔

اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے، وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی میں ایسی تحریف کا شکار ہوئی، جس کی نظیر اس دور کی تاریخ مذاہب میں کہیں نہیں ملتی، وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب کے ایک ایسے مشرک مذہب میں تبدیل ہو گئی، جس کو یونانی اور بوردھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰-۶۷ء) کے ہاتھوں ہوا، یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے

تو دوسری روح، ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایسی جست یا چھلانگ کے مترادف تھی جس میں

یہی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا، ایک مسیحی فاضل (ERUSET DE BUNSEN) اس

تغیر و انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول و عمل سے کبھی نہیں دی تھی

اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں و مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے اس کی ذمہ داری حضرت مسیحؑ کے سر نہیں ہے

بلکہ یہ سب اس یہودی عیسائی بے دین پال کا کوشمہ ہے، نیز صحف مقدسہ کی تمثیل و تبیین کے طریقہ پر تشریح اور ان صحیفوں کے

پیش گوئیوں اور مثالوں سے بھرنے کا نتیجہ ہے، پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہب یسائی (ESSENIO)

کا داعی ہے، حضرت مسیحؑ کے ساتھ بہت سی بودہ رسوم و آداب کو آج انجیل میں جو تضاد کہانیاں اور واقعات ملتے

ہیں، اور جو حضرت مسیحؑ کو ان کے مرتبہ سے بہت فزور شکل میں پیش کرتے ہیں، وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں، حضرت

مسیحؑ نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پارہوں اور راہبوں نے اس سائے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے

جس کو آرتھوڈوکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے“

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا، اور

اس پوری مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا، جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر حقیقی نظام کے

خلاف قلم بناوت بلند کرے، اور اس نقطہ کی طرف واپسی کی کوشش کرے، جس نقطہ پر حضرت مسیحؑ اور ان کے مخلص

خلفاء اور تبعین چھوڑ کر گئے تھے، صدیوں پر صدیاں بیت گئیں، اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا، جو مسیحیت کے ان نئے

اور بیرونی اجزاء کو علیحدہ کر سکے، آخر کار پندرہویں صدی مسیحی میں مارٹن لوتھر (M. LUTHER) جرمنی میں پیدا ہوا، اور

اس نے بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قسم کی اصلاح کی، یہ کوئی جوہری یا عمومی اصلاح نہ تھی، اور نہ مسیحیت کے غلطانہ

اور اس کے انحراف کے خلاف کوئی بغاوت، گویا مسیحیت کی تاریخ کی تقریباً پندرہ صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب

اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہیں، اور اس عرصہ میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، مسیحی

فضل اور کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں سچی دنیا میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی، جو مسیحیت کی اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. BASSMULLINGER) لکھتا ہے:-

اگر ہم اس کے اسباب تلاش کریں کہ سولہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں ترقی کا یہابی بھی کیوں نہ ہوئی تو بلا کسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب قرون وسطیٰ کے ذہن کی ماضی کی مثالوں کی غلامی تھی۔  
دوسری جگہ لکھتا ہے:-

پیرچ کے اصلاح کی کوئی جامع تجزیہ کرنے کے کارخانے کی ان کی سلسل کوششوں کی ناکامی یورپ میں تاریخ کی ایک جانی بڑھی حقیقت ہے۔

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے:-

سولہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں، متعدد اور بعض بہت یادگار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں، لیکن بلا استثناء ان سب کو کلیسا کی لعنت و ملامت کا شکار ہو جانا پڑا تھا۔

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو کلیسا کے خرافات و اوہام اور اس کی زبردستیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا، اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لو تھر نے (اپنے مخصوص دائرہ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔  
غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی جس کو اس نے اپنے لئے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے سرخونپ دیا گیا تھا، کلیسا کا اثر کم پڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا، یورپ میں مادیت کی حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور مغرب کے ہر مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا، جو اس مادیت کا مقابلہ کرتا، اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا یا

ENC. BRITANNICA-ED. IX VOL. XX P. 320  
ARTICLE BY J.B. MULLINGER.

۳۲ ایضاً ۳۲ ایضاً

عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرنا، ان سب میں وہ روحانی و اخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے ان زبردست تھیسٹروں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکے، جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی عقائد پر قائم ہو اور جہاں نئے زمانہ کے سوالات، عصر جدید کے مسائل کا حل اس کی روشنی میں ممکن ہو، اس کے برعکس یہ ہوا کہ عیسائی مفکرین، مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے خود بالواس ہو گئے، اور لادینی مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس بہتری پیدا ہو گیا۔

یہی قصہ مشرق کے مذاہب کے ساتھ بھی پیش آیا، ہندو مذہب بھی اپنی اصل راہ سے بالکل ہٹ گیا، اس نے اپنی سادگی اور خالق کائنات سے براہ راست روحانی نسبت بالکل کھودی، اخلاقی قوت بھی مفقود ہو گئی، اور اپنی پیچیدگی کی وجہ سے وہ محض ایک دقیق اور غیر عملی فلسفہ بن کر رہ گیا، اور رفتہ رفتہ عقائد میں توحید خالص اور معاملات میں مساوات دونوں اہم چیزوں کا سرشتہ اس کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا، اور یہی وہ دوا ہم بنیادیں تھیں جن پر کوئی ایسا مذہب قائم ہو سکتا ہے جس کی جڑیں باطن میں مضبوط ہوں، اور شاخیں ظاہر میں پھیلی ہوئی ہوں۔

اپنی شد کے مصنفین نے بہت کوشش کی کہ اس فساد کا تدارک کریں، چنانچہ انھوں نے ان رسوم کو جو ہندو مذہب اور ہندو سماج پر پوری طرح چھا گئی تھیں، مسترد کر دیا، اور اس کی جگہ ایک ایسے فلسفیانہ اور تصوراتی نظام کو پیش کیا، جو کثرت میں وحدت کے نظریہ پر قائم تھا، یہی تصویر ہندو مذہب کے علمی حلقوں میں تو ضرور پسند کی گئی، اس لئے کہ ان کا رجحان شروع ہی سے وحدۃ الوجود ہمراہی کی طرف تھا، لیکن عوام نے جن کی فکری سطح پست تھی، اور جو عملی نظام اور عملی تعلیمات کے خواہشمند تھے، اس بات کو قبول نہ کیا، اور اس طرح ہندو مذہب رفتہ رفتہ اپنی قوت و تاثیر کھوتا رہا، اس کی طرف سے بے اعتمادی اور بے اطمینانی روز بروز بڑھنے لگی، ہندو سماج کی یہی بے اطمینانی اور بے چینی تھی جس نے آگے چل کر بودھ کی شخصیت میں جنم لیا، یہ مرحلہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سامنے آیا۔

بودھ نے ایک نیا فکر یا ایک نیا مذہب (اگر اس موقع پر لفظ مذہب کا استعمال درست ہو) پیش کیا جو ترک

نیا، تہذیب نفس، خواہشات سے مقابلہ، رحم دلی و ہمدردی، خدمت و عمل اور رسوم و عادات اور طبقائی کشمکش



کی تردید و مخالفت پر قائم تھا جو ہندو سماج میں آخر زمانہ میں بہت نمایاں ہو گئی تھی، یہ فکر یا یہ مذہب بہت سرعت

کے ساتھ پھیلا اور ایشیا کے جنوبی اور شرقی حصہ پر جو بکر ہند اور بکر الکابل کے درمیان واقع ہے اس کا تسلط قائم ہو گیا۔

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ زبردست مذہبی تحریک بھی اپنے راستے سے ہٹ گئی اور تحریف کا شکار ہو گئی، موزنیا

اور رسوم وغیرہ جن کے خلاف اس مذہب نے علم بغاوت بلند کیا تھا، اس پر پھر سے حملہ آور ہوئے یہاں تک کہ اس کے آخر

دور میں وہ بھی شرک اور سورتی پوجا کا مذہب بن کر رہ گیا، جو اپنے پیشرو ہندو مذہب سے سورتیوں کی اقسام اور ان کی

تعداد کے سوا کسی اور چیز میں مختلف اور بہتر نہ تھا، اس کی اخلاقیات کو بھی زوال ہوا، افکار و خیالات میں سچدگی اور

بڑھ گئی، نئے نئے فرقے اور مذہبی گروہ قائم ہو گئے، پروفیسر ایشوراپٹی اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں:-

"بودھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور سورت پرتی کا درد دورہ دکھلائی

دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی، اس میں بدعتیں اور حدیں کے بعد دیگرے نظر آ رہے تھے۔"

پینڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں بودھ مت کے بگاڑ اور

تدریجی زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنایا، اور بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دو ٹوند ہو گئے، اور ایک خاص عبادت

کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا، عبادت کے طریقوں میں سحر اور اہام داخل

ہو گئے، اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تشریحی شروع ہو گیا، اس عہد

میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی، (MRS. RHYB DAYIS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

"ان مریضانہ خیالات کے گہرے سایہ میں اگر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہو گئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور

اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لی اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضائیں

لے بودھ مت کے لئے لفظ مذہب کے استعمال میں مجھے تردد اس لئے ہے کہ اس میں خالق اور مبداء و معاد کے سلسلے میں کوئی عقیدہ یا نظریہ

نہیں ملتا، اور اکثر مصنفین و مؤرخین کی یہ رائے ہے، دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا لفظ بودھ (BUDDHA)۔

ہندوستانی تمدن (اردو) ایشوراپٹی۔

ذہن کی ان پُر فریب تخلیقوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور بانی مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان انہیاتی موٹگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔

مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہو گئی اور ان میں اکثر بتذل رسم داخل ہو گئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، اس وسیع بودھ دنیا میں اور اس کی حکمرانی کی اس طویل مدت میں کوئی ایسا مصلح سامنے نہ آیا، جو حقیقی بودھ مت کی طرف دعوت دے اور اس جدید اور منحرف مذہب کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے اور اس کا گذشتہ دور شباب اور اس کی گم شدہ سادگی اور صفائی پھر سے واپس لے آئے۔

عرض قدیم ہندو مذہب بودھ مت کے سامنے بالکل نپٹ نہ سکا، یہاں تک کہ آٹھویں صدی مسیحی میں شکر آچاریہ نے بودھ مت کی مخالفت اور قدیم ہندو مذہب کی اشاعت کا علم بلند کیا، اور آخر کار اس کو اس ملک سے تقریباً باہر ہی کر دیا، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حیثیت ہندوستان کے بہت سے مذاہب میں ایک قدیم رُو بزوال اور محدود مذہب کی رہ گئی، شکر آچاریہ نے اپنی ذہانت، مذہبی جرأت اور جوشِ عمل سے یہ تو کیا کہ بودھ مت کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا، لیکن وہ اس باب میں کامیاب نہ ہوئے (بلکہ شاید اس کا انہوں نے سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کہ قدیم ہندو مذہب کو اس کی پہلی اور حقیقی شکل پر واپس لے آئیں، اس میں توحید کا عقیدہ، خالق کائنات براہ راست اتصال، بندہ اور خدا کے درمیان واسطوں کی نفی، اجتماعی انصاف اور طبقاتی مساوات کی رُوح پیدا کریں، چنانچہ آج تک یہ دونوں ہندوستانی مذاہب اپنی بدلی ہوئی ہئیت پر قائم ہیں اور دورِ انحطاط کی میراثِ رسوم و عادات اور صورتوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، مذاہب و اخلاق کے انسائیکلو پیڈیا (ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS) کے مقالہ نگار (V.S. GHATE) جو الفسٹن کالج بمبئی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے، اوپر ہندوستان کے قدیم مذاہب و فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، شکر آچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”اس کا زندگی کا سب سے بڑا مقصد اس نظام مذہب اور فلسفہ کا زندہ کرنا تھا، جس کی اوجھڑ میں تسلیم دی گئی ہے،

”لہذا ہندو مذہب ۲۰۲۰ء ایضاً ۲۰۲۱ء میں شکر آچاریہ آٹھویں صدی کے نصفِ آخر میں گزرا ہے، ۳۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔“

اس نے مطلق وحدۃ الوجود کے عقیدہ کو رائج کر دیا، اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ یہ بتائے کہ "اوپنیشد" اور بھگوت گیتا میں قانون پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مکمل وحدۃ الوجود کی تعلیم ہے، شکر آچاریہ نے بت پرستی کی ذمہ نفاقت کی اور نہ حملہ کیا، اس کے نزدیک بت ایک رمز اور منظر ہیں، شکر آچاریہ نے رسمیت (RITUALISM) اور کرما کی مذمت کی، لیکن مقبول عام دیوتاؤں کی پرستش کی طرف سے مدافعت کی، اپنے نشوونما کی ایک خاص منزل میں بت پرستی ہماری فطرت کی ایک ضرورت ہے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے تو پھر بت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی ہے، علامتوں اور رموز کو ترک کر دینا چاہیے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے، شکر نے بتوں کی اجازت دی، بحیثیت ایک علامت کے ان لوگوں کے لئے جو ایسے برہمنوں کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکے، جو صفات سے آزاد اور ناقابل تبدیل ہوں۔

بہر حال وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، جو شکر آچاریہ سے لے کر دیانند سرسوتی اور گاندھی جی تک کی گئیں، اور جن کا مقصد اس مذہب کا اس کی ان صحیح بنیادوں پر اجیاد تھا، جو نبوت کی دعوت انسان کی فطرت سلیم اور تغیر پذیر عہدہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو، ان دونوں مذاہب نے آخر کار مادیت و لادینیت کے سامنے بالکل سپردال دی ہے، اور زندگی سے کنارہ کش ہو کر عبادت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں پناہ لی ہے، اور رسوم و عادات اور ظاہری اشکال میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسی طاقتور دعوت نہیں جس کا نعرہ اور جس کا منشور یہ ہو، پھر سے مذہب کی طرف آؤ، اس کے برعکس ایسی تحریکیں بہت بیدار اور طاقتور ہیں، جن کا نعرہ اور اصول یہ ہے کہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرو، اور ہندوستان کی قدیم تاریخی زبان "سنسکرت" کو پھر سے ملک میں رائج کرو۔

## مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں

لے، لہذا مقالہ شکر آچاریہ باختصار انتخاب ملاحظہ ہو۔

رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں، جو اپنے غیر معمولی یقین اور حاکمیت بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ داعی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح بھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوت عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جوان ہیں، مادیت کا درخت نہ اہل ہمارے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتہً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُر جوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنہوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔ ع

اگرچہ پیر ہے مومن جوان ہیں لات و مستات

اس کا مقابل جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا، اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی ہے گی، تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہر نئے فتنہ اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت و طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کے اس طویل اور پُر آشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت ایسی نہیں پائی جاتی، جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی، حقیقت اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امت اسلام کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو، اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب بھی اسلام کے لئے کوئی فتنہ نمودار ہوا، اس کی تخریب اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی، یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی، جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا، اور اس کو میدان سے ہٹا دیا، بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں، جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے، کتنے آدمی ہیں، جو قدرت، جہیت، اعتزال، خلق قرآن

وحدة الوجود اور اکبر کے دین الہی کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد تھے اور مذہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جدوجہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنی اسلام کی تاریخ، اور ایسا ہی سلسل ہے، جیسی مسلمانوں کی زندگی۔

## تاریخ کے گم شدہ ماخذ

لیکن اس کی ذمہ داری صرف مورخین پر عائد نہیں ہوتی، اس کے ذمہ دار وہ تمام لوگ ہیں، جو تاریخ کی اصطلاحی اور سرکاری حیثیت کے سوا کوئی اور حیثیت ماننے پر تیار نہیں، اور کسی ایسی کتاب کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے جو کسی کتب خانہ میں تاریخ کی الماری کے اندر نہ ہو، یا فن تاریخ کے تحت درج نہ ہو، حالانکہ ایسی بہت سی کتابیں اپنے اندر تاریخ کا بہت قیمتی ذخیرہ رکھتی ہیں، اور ان کو بہت اہم ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے، یہ وہ ادبی اور دینی کتابیں ہیں، جن میں ان داعیوں اور مصلحین امت نے اپنی دلی احساسات و کیفیات کو بے نقاب کیا ہے، اور اپنی زندگی کے اہم واقعات اور تجربے درج کئے ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں، جن میں شاگردوں اور مریدوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ کے نصائح و لفظوں اور حقائق و معارف قلم بند کئے ہیں، اور ان کی پڑاؤ اور بابرکت مجلسوں کی روداد پیش کی ہے، یہ مکتوبات اور مواعظ کے وہ مجموعے ہیں، جن سے ان کے خیالات و افکار اور جذبات و کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں جو احتساب سوسائٹی پر تنقید اور بدعات و منکرات کے رد و ابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی ماخذ تک وسیع ہو سکتا اور کوئی وسیع النظر نگاہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر جم کر کام کر سکتا تو ایک مربوط و مکمل تاریخ اصلاح و تجدید پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ

دعوت و عزیمت دونوں چیزیں اس امت کے ہر دور اور ہر مرحلہ میں اس کا ساتھ دیتی رہیں اور انہوں نے کبھی اس کو بالوں اور محروم نہیں کیا۔

## اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہمارے ہاتھ میں پہنچی (اور جس کو ہم میراث) کے معنی میں نہیں بول رہے ہیں جو اہل مغرب کا مفہوم ہے، اس لئے کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، ہم میراث سے وہ دولت اور ثروت مراد لیتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، علم راسخ، محفوظ و مضبوط عقائد، طاقتور ایمان، سنتِ سنیت، اخلاقِ عالیہ، فقہ و شریعت اور شاندار اسلامی ادب کی ثروت، اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاجِ خلافت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے خصائص مٹ گئے تھے، ان کو اُجاگر کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اس لازوال ثروت میں ہر اس شخص کا اضافہ تسلیم کیا جائے گا جس نے اس دین پر اس کے آخذا اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سر نو استوار کیا، نو وارد فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس... امت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لئے اس کے دین اور مصادر دین کی حفاظت کی، حدیث و فقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا، اور امت کو تشریح کا خزانہ عامہ اور زندگی و معاشرہ کا منظم قانون عطا کیا، جس نے معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا، اور اس کے انحراف اور کج روی پر کھل کر تنقید کی، اور صحیح حقیقی اسلام کی بر ملا و آشکارا دعوت دی، جس نے شکوک و شبہات کے دور اور اضطراب عقائد کے زمانہ میں علمی طرز استدلال اختیار کر کے دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی، جس نے دعوت و تذکیر اور انذار و تنبیہ میں انبیاء علیہم السلام کی نیابت کی، اور ایمان کی دہلی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ جو الہ کی حرارت و حرکت بخشی، جس نے مادہ پرستی کے شند و نیز دھار کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تیزی و بلاخیزی کم کی، اور خدا کی مخلوق کو اس دھارے میں بہ جانے یا اس میں دب جانے

سے محفوظ رکھا جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے درپے خارجی حملوں کو سہارا لینے کی قوت عطا کی جس نے اپنی حکیمانہ دعوت اور اپنے دایم محبت سے اس دشمن کو شکار کیا، جو زورِ شمشیر اور نوکِ خنجر سے بھی زیر نہ ہو سکا تھا، اور جس نے عالم اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا، جس نے اپنے طاقتور ایمان اور اپنی روحانی قوت سے ایسے دشمنوں کو حظیرہٴ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا شرف بخشا، جس نے اپنے طاقتور ادب اور دل گداز و بیخ اشعار سے ان ذہنوں کو اسیر و ام کیا جو علمی بحث اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے، یہ پورا ایک سلسلہ ہے اور اس میں ہر شخصیت کا ایک خاص حصہ اور مرتبہ ہے، تاریخ دراصل امانت کی ادائیگی اور حق شناسی اور اعتراضِ حقیقت کا نام ہے، ان میں ہر شخص اسلام کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے تزکیش کا ایک قیمتی تیر تھا، اگر ان لوگوں کی مخلصانہ کوششیں نہ ہوتیں، جن کو آج ہم تاریخ کی دور بین سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو ہم تک یہ مجبوسہ نہ پہنچ پاتا، جس میں ہمارے لئے عزت، عبرت اور مواعظت کا دوا فرسا مان موجود ہے، اور جس کی موجودگی میں ہم اقوام عالم کے سامنے بجا طور پر اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

اس مسلک اور ان خطوط پر جو مصنف کے نزدیک منصفانہ اور عادلانہ مسلک ہے، اس نے آئندہ صفحات میں ان اہم شخصیتوں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جنہوں نے دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کے میدان میں کوئی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ **وبیдахلله التوفیق**

# پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

## عمر بن عبدالعزیز

### عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات

خلافت راشدہ کے اختتام اور بنی امیہ کی حکومت کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید و انقلاب کی قوری ضرورت پیدا کر دی، قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت و تربیت اور خلافت راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا، کتاب و سنت نہیں رہا، بلکہ عربی سیاست اور مصالح ملکی "بن گیا" تفاخروں اور عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے شہر بدر کر دیا تھا، اور جو بادیہ عرب میں پناہ گزیں تھی، پھر واپس آ گئی، قبائلی غرور، خاندانی جنبہ داری، اعزہ پروری جو خلافت راشدہ میں سخت عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی، ہنزاؤں محاسن بن گئے، اعمال و اخلاق کے محرکات (بجائے اجر و ثواب کے) جاہلی ناموری، مدح و تعریف اور تفوق ہو گئے،

لہٰذا اس سلسلہ میں جاہلیت کا جذبہ مسابقت اور شہرت و عزت پورے طور پر زندہ اور بیدار ہو گیا تھا، اس ذہنیت کا اندازہ اس دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہے جو ابو الفرج اصفہانی نے اثنالی میں نقل کیا ہے کہ عہد اموی کے دو عرب سرداروں کو شب اور عکرمہ کے درمیان عرصے سے اس بات کا مقابلہ تھا کہ کس کے یہاں کھانا زیادہ تیار ہوتا ہے اور مہمان زیادہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں جو شب کا پورا اکثر بھاری رہتا، ایک عرصہ بعد عکرمہ نے اپنے حریف کو زک دینے کے لئے تدبیر کی کہ صد ہجریوں آئے کی خریدیں اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کر دیں کہ آٹا گوندھ لیا جائے اس گندھے ہوئے آٹے کو اس نے ایک بڑے گڑھے میں بھر دیا اور اوپر سے گھاس ڈال دی اور اس کا انتظام کیا کہ جو شب کا گھوڑا اس گڑھے میں گر جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ گھوڑا گندھے ہوئے آٹے کی اس خندق میں جا پڑا اور آٹے میں لت پت ہو گیا، اور دھوم مچ گئی کہ عکرمہ کے یہاں اس مقدار میں آٹا گندھتا ہے کہ گھوڑا اس میں گر گیا، لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے دیکھا تو گھوڑے کا سر اور گردن باہر نکل گیا اور سارا جسم (باقی صفحہ پر)



بیت المال (جو مسلمانوں کے پیسے سے جمع ہوتا تھا) خلیفہ کی ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا تھا۔ پیشہ ور شعراء خوشامدی درباریوں اور آبرو باختر مصائبین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جس پر مسلمانوں کی دولت بیدار نہ ہوئی تھی اور ان کی بے عنوانیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی، گانا سننے کا ذوق اور موسیقی کا انہماک حد کو پہنچ گیا تھا۔ حکومت کی غلط روی اور اہل حکومت کی بے دین زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہو رہی تھی اور مترفین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کے اخلاق قدیم مترفین سے ملتے جلتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حریف سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے اور چالیس برس کا حساب ایک دن میں پورا کرنا چاہتی ہے۔

### عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر

بنی امیہ کے اس مادی اقتدار اور اس کے قدرتی اثرات کے باوجود اس عہد تک دین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا جو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے اور اپنی تلہیت، اخلاص، پاکیزہ نفسی اور علم و تفقہ میں مشہور و معروف تھے، حکومت و انتظام کے دائرہ سے باہر انہی حضرات کا اثر و اقتدار تھا، اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے اور مادیت کے سیلاب میں بالکل بہ جانے سے رکھے ہوئے تھے، ان دینی شخصیتوں میں سب سے بااثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ وعلی آباءہ السلام) کی تھی، جو عبادت و تقویٰ اور زہد و تسبیح میں اپنی نظیر نہیں

(باقی صفحہ ۳۱ کا) ڈوبا ہوا تھا، ریلوں اور بلیوں سے اس کو بڑی مشکل سے نکالا گیا، عام طور پر اس واقعہ کی شہرت ہوئی اور شعرائے اشعار کہنے اس طرح حکمران نے اپنے حریف کے مقابلہ میں فتح حاصل کرنی اور اپنا تفوق تسلیم کروایا (ازدونات الثالث جلد ۱ ص ۱۳۹، ۱۴۰)۔  
 ۱۷۔ اموی عہد کا مشہور صیالی شاعر (خطی م ۹۵) خلیفہ عبد الملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آنا کہ گلے میں سونے کی صلیب تھی اور داڑھی کے بالوں سے شراب کے قطرے چمکتے، اور کوئی اس کو ٹوکنے والا نہ ہوتا (اغالی ج ۷ ص ۱۷۸)۔  
 ۱۸۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک مرتبہ عراق کا مشہور معنی خین اپنے ہم پیشہ لوگوں کی دعوت پر مدینہ منورہ آیا، اور ایک مکان میں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، سننے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ چھت بیٹھ گئی اور خود خین دب کر مر گیا۔  
 (اغالی ج ۲ ص ۱۲۲، ۱۲۳)

رکھتے تھے، مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں طواف کے لئے آیا، شدتِ ہجوم کی وجہ سے وہ حجرِ اسود تک نہیں پہنچ سکا، اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام کرے، اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے، ان کا آنا تھا کہ مجمع کا اُ کی طرح چھٹ گیا، اور انھوں نے باسانی طواف و استلام کیا، وہ جدھر سے گزرتے، لوگ حتر اُمارتہ چھوڑ دیتے تھے، ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہدِ اموی کے مشہور شاعر فرزدق نے برجستہ اشعار میں اس کے تجاہلِ عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایانِ شان تعارف کرایا۔

اسی طرح دوسرے فضلاءِ اہل بیت حضرت حسن المثنیٰ، اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ المحض نیز دوسرے فضلاءِ تابعین حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت سعید بن المسیب حضرت عروہ بن الزبیرؓ مسلمانوں کے لئے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے، انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی، حق گوئی، اور بے باکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمتِ دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا، حکومت کے بڑھتے ہوئے ہر گہر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا، اور کبھی کبھی عین دنیاوی انہماک میں بھی اصلاحِ حال کا جذبہ ابھرتا تھا۔

## انقلابِ حکومت کی ضرورت، اس کی مشکلات

رفتہ رفتہ سیاسی انقلاب کے اثرات وسیع اور گہرے ہونے چلے گئے، ان دینی شخصیتوں میں بھی کمی آنے لگی، جو اسلام

لے حجرِ اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے چھونا، ۱۲۱ھ یہ قصیدہ اب بھی عربی ادب میں یادگار ہے، اس کا مطلع ہے۔

هَذَا الَّذِي تَعْرِفُ الْبَطَاءَ وَطَائِهَ وَالْبَيْتَ يَعْرِفُهُ وَالْحِجْلُ وَالْحَرَمَ

محققین کا خیال ہے کہ اس قصیدہ میں بہت سے اشعار بعد میں اضافہ ہوئے ہیں۔

یہ مفصل حالات و تراجم کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، صفحہ ۱۰۰۰ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

کے اصلی اخلاق و اوصاف کی محافظ اور قرن اول کی یادگار تھیں، حکومت کا دائرہ اثر وسیع اور مستحکم ہو گیا، اب اخلاقی و دینی انقلاب اس کے بغیر مشکل تھا کہ خود حکومت میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جاسکتی تھی، اس وقت کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ایسی نہ تھی، جو اس کو میدان جنگ میں شکست دے سکے، باضی قریب میں دو بڑی کوششیں ایک بیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مخلصانہ و سرفروشانہ اقدام، دوسرے حضرت عبداللہ بن زبیر کا دلیرانہ و منظم مقابلہ ناکام ہو چکا تھا، کسی فوجی انقلاب کی کامیابی کے قریبی امکانات و آثار نہ تھے، شخصی و موروثی حکومت نے اصلاح و تبدیلی کے دروازے بند کر دیئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لئے مسلمانوں کی قسمت پر ہر لگ چکی ہے، اس وقت اسلام کو غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت تھی، اور وہ معجزہ ظاہر ہوا۔

## عمر بن عبدالعزیز کی جانشینی

یہ معجزہ حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی ذات ہے، جو خود بانی خاندان (مروان) کے پوتے اور ان کی ماں (ام عاصم) فاروق اعظم کی پوتی تھیں، فاروقیت اور امویت کا یہ سب جوگ لے لے ہوا تھا، کہ بنی امیہ کے خاندان میں ایک خلیفہ ارشد پیدا ہو، جو حالات میں انقلاب برپا کرے۔

عمر بن عبدالعزیز ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے، وہ خلیفہ وقت سلیمان بن عبدالملک کے چچا زاد بھائی تھے، اور اس کے پیشرو ولید بن عبدالملک کے اور اس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے حاکم (گورنر) تھے، ان کی جوانی اور امارت کو ان کی خلافت

لے اس رشتہ کی تاریخ یہ ہے کہ حضرت عمر بن زید نے سادہی کر والی تھی کہ دودھ میں پانی نہ ملا جائے، اسی زمانہ میں ایک رات وہ گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آئی کہ کوئی عورت کہہ رہی ہے، بیٹھی صبح ہو رہی ہے، دودھ میں پانی ملائے، لڑکی نے جواب دیا کہ لانا آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین نے اس کی ممانعت کیا ہے؟ عورت نے کہا کہ امیر المؤمنین اس وقت کہاں ہیں، ان کو کیا خبر؟ لڑکی نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین کو خبر نہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہے، حضرت عمر نے اس گھر کو نظر میں رکھ لیا، اور اپنے صاحبزادہ عاصم سے کہا کہ تم اس لڑکی کو پیام دو، مجھے امید ہے کہ اس کے لطن سے ایسا جو انور پیدا ہوگا جو سارے

عرب پر حکومت کرے گا، عاصم نے اس سے نکاح کر لیا، عمر بن عبدالعزیز اس کے نواسے ہیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۸۱۷)

کے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحبِ ذوق امیرانہ مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس رات سے گزرتے تھے، دیر تک اس کی بہک بتلاتی تھی کہ ادھر سے عمر گزے ہیں، ان کی چال مشہور اور نوجوانوں کا فیشن تھی، سوائے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیک مزاجی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں اتنا اہم کام انجام دیتے والے ہیں۔

لیکن ان کی ذات سر تا پا اسلام کا اعجاز تھی، اور وہ جس طرح منصبِ خلافت پر آئے، وہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، موروثی نظام حکومت میں ان کی خلافت کا کوئی موقع نہ تھا، اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے، تو امارت سے زیادہ ان کا کوئی حصہ نہ تھا، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا، سلیمان بن عبد الملک بیمار ہوا، اس کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے، اس نے ان کو لابی لابی قبائیں پہنائیں، اور ہتھیار باندھے کہ وہ کچھ بڑے معلوم ہوں، مگر وہ آنکھوں میں نیچے، اس نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا، اور کہا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے، جس کے لڑکے بڑے بڑے ہوں، زجاج بن حیوہ نے جو اسی انتظار میں تھے، حضرت عمر بن عبد العزیز کی جانشینی کا مشورہ دیا، جو منظور ہوا، رجا کا یہ کارنامہ (جو دینی انقلاب کا ذریعہ بنا) بڑے بڑے مجاہدات اور سالہا سال کی عبادت پر بھاری ہے۔

## خلافت کے بعد ان کی زندگی

عمر بن عبد العزیز نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر ان چند عمال حکومت کو معزول کیا، جو سخت ظالم اور ناخدا ترس تھے، ان کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا، اس کو بیت المال میں داخل کیا، اور اسی گھڑی سے ان کی سیرت کیس بدل گئی، اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے، بلکہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جواری او باندیوں کو تحقیق کے بعد ان کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کر دیا، مظالم کا تصفیہ کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسریٰ و قیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی، سنت اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور مطابق سنت بنا دیا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کر دی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انھوں نے ایسی زاہدانہ

زندگی اختیار کی جن کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقرا میں بھی ملنی مشکل ہے، لباس میں ایسی کمی

کی کہ بعض اوقات کڑتا سوکھنے کے انتظار میں جمیے میں تاخیر سے پہنچنا ہوتا، بتی امیہ جو ساری سلطنت کو اپنی جاگیر اور بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، اب اپنا نپا تلا حصہ پاتے، خود ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے، وہ منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، روک فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سن کر وہ بھی رو پڑیں، اس وقت جبکہ وہ روتے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران تھے، ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکر سے جو ان کا سچا رفیق تھا، پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا کہ دس بارہ دینار، کہا کہ اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارک باد دی، اور کہا کہ حج کا سامان آگیا، فرمایا ہم نے اس مال سے بہت دنوں فائدہ اٹھایا ہے، اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر اس کو بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان کے دو وقت کھانے کا حساب دو درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر سرکاری شمع جل رہی ہوتی اور کوئی ان کی خیریت دریافت کرنے لگتا، یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنی ذاتی شمع منگوانے، بیت المال کے باورچی خانہ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی ان کو حاضر از تھا، بیت المال کے مشک کو سونگھنا بھی گوارا نہ تھا۔ ان کی احتیاط تنہا اپنی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنے عمال حکومت کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تھے اور ان سے توقع کرتے تھے کہ وہ بھی حکومت کے معاملہ میں اسی قدر محتاط اور جززس ہوں گے، والی مدینہ ابو بکر بن حزم نے سلیمان بن عبد الملک کو درخواست دی تھی کہ حسب دستور سابق ان کو سرکاری موم بتیاں اور قندیلیں ملنی چاہئیں، سلیمان کے انتقال کے بعد یہ پرچہ عمر بن عبد العزیز کے ملاحظہ میں آیا، آپ نے لکھا کہ ابو بکر مجھے یاد ہے کہ تم اس عہدے سے پہلے جائے کی اندھیرا راتوں میں بے شمع و موم بتی کے نکلنے تھے، تمہاری وہ حالت اس حالت سے بہتر تھی، میرے خیال میں تمہارے گھر کی موم بتیاں

۱۰ سیرت عمر بن عبد العزیز (محمد بن عبد الحکم ص ۵۵) ۱۱ سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۵۵

اور قندیں کافی ہیں انہی سے تم کو کام لینا چاہئے، اسی طرح کی ایک درخواست چرس میں سرکاری کام کے لئے کاغذ طلب کیا گیا تھا، لکھا کہ۔

• قلم باریک کر دو اور گٹھا ہوا لکھو، اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لئے کہ مسلمانوں کو ایسی لمبی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خواجہ ادبیت المال پر بار پڑے!

## ان کی انقلابی اصلاحات

اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انہوں نے حکومت کی روح ہی بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انہوں نے حکومت کا نقطہ نظر بدلا اس وقت تک حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا، جس کو جمہور کے اخلاق و عقائد، سیرت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انہوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرے سے کہ۔

• محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے!

حکومت کا مزاج اور نقطہ نظر ہی تبدیل کر دیا، اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا، ان کی ساری مدت خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انہوں نے ملکی مصالح و منافع کے مقابلہ میں ہمیشہ دین و اصول و اخلاق کو ترجیح دی، اور دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پروا نہیں کی، ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی، روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، اہلکاران سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلانی اور تشویش کا اظہار کیا، انہوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا عین مقصد ہے، ایک دوسرے عہدہ داز کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیہ کی

آندی بند ہو جانے کی وجہ سے) ہم تم دونوں کھینتی کر کے اور ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں، مین میں خراج کی ایک متعین مقدار مقرر تھی

خواہ فصل اچھی ہو یا بُری، حاکم نے اطلاع دی، آپ نے فرمایا کہ فصل کے مطابق رقم وصول ہونی چاہئے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ  
سائے مین سے ایک مٹھی غلہ وصول ہو، میں اس پر راضی ہوں، تنگی ساری مملکت سے معاف کر دی، اور عمال کو لکھا کہ وہ  
نفس ہے، اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:-

وَلَا تَغْتَسِبُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا

اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو، اور زمین میں

فِي الْأَرْضِ مِنْ مَّقْسِدِينَ ۝ (ہود - ۸۵) فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

لوگوں نے اس کا نام بدل کر اس کو جائز بنا لیا ہے، چند شرعی محاصل کے علاوہ ہر طرح کے ناجائز محاصل اور  
میسوں ٹیکس جو سابق فرمانرواؤں اور عمال حکومت نے ایجاد کئے تھے، یکسر معاف کر دیئے، خشکی اور سمندر کے راستوں کو  
کھولنے کی ہدایت کی، اور ہر طرح کی پابندیاں اٹھا دیں۔

مملکت میں ایسی اصلاحات کیں، جن کے نتائج بہت دور رس تھے، ساری مملکت کے لئے یکساں سپاہی مقرر  
کئے، جس میں فرق نہیں ہو سکتا تھا، حکام و عمال سلطنت کو تجارت کی ممانعت کی، بیگار کو قانوناً ممنوع قرار دیا، سلطنت کی  
زمین کا خاصا رقبہ امرار اور شاہی خاندان کے افراد و حکام نے اپنی شکار گاہ یا چراگاہ کے لئے گھیر کر بیگار بنا رکھا تھا، حکم دیا کہ وہ  
عوام کی ملکیت ہے، عمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی ممانعت کی اور فرمایا کہ اگر وہ کبھی تحفہ تھا، تو اب رشوت کے سوا کچھ نہیں  
حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اپنے تک پہنچنے اور نکالیاں پہنچانے کے پورے مواقع اور بہولتیں ہتیا کریں، حج کے موقع پر اعلا  
ہوتا تھا کہ جو کسی ظلم کی اطلاع یا کوئی نیک مشورہ دے گا، اس کو سوسے لے کر تین سو دینار تک انعام ملے گا۔

### اعمال و اخلاق کی طرف توجہ

اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم و بادشاہ ہوتا تھا، اس کو لوگوں کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کرنے کی

لہ مناقب عمر بن عبدالعزیز ص ۶۴ (طبع یورپ) ۷۵ سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۲۶ ۷۶ ایضاً ص ۹۹ ۷۷ ایضاً ص ۹۸ ۷۸ ایضاً ص ۹۹

۷۹ ایضاً ص ۹۸ ۸۰ ایضاً ص ۹۹ ۸۱ ایضاً ص ۱۰۰

نے فرصت تھی، نہ اہلیت نہ اس کا منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے دے، ان کے اخلاق و رجحانات کی نگرانی کرے، اور وعظ و نصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علماء و محدثین کا سمجھا جاتا تھا، عمر بن عبدالعزیز نے اس دونی کو مٹایا اور اپنے کو حقیقی معنی میں "خلیفہ" ثابت کیا، انھوں نے زمام خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عمال حکومت اور امراء اجناد (فوجی افسروں) کو طویل طویل خط اور فرمان لکھے، جو انتظامی سے زیادہ دینی و اخلاقی ہیں، اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ مشورہ و نصیحت کی روح ہے، ایک خط میں انھوں نے سابق اسلامی زندگی (عہد نبوت و خلافت) اور اس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے، اور اسلامی نظام مالیات اور طرز حکومت کی تشریح کی ہے، ان خطوط میں وہ امراء اجناد (فوجی افسروں) کو وقت پر نمازی پڑھنے، اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر و اشاعت کی تاکید کرتے ہیں، عمال کو تقویٰ و اتباع شریعت کی وصیت فرماتے ہیں، اپنے اپنے علاقہ اور حلقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں، اور اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا مقصد بتلاتے ہیں، ان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کرتے ہیں، اور بتلاتے ہیں کہ اس فریضہ کے ترک ہو جانے کے کیا نقصانات ہیں، اور اس کا کیا وبال پڑتا ہے؟ عمال سلطنت کو سزا و عقوبت میں اعتدال و احتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اسلام کے قانون تعزیرات کی تشریح کرتے ہیں، پھر سلطنت کی عمومی شہری خرابیوں اور بد اخلاقیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں، نوجوگری اور جہازہ میں عورتوں کے ساتھ جانے کو بند کرتے ہیں، پردہ کی تاکید کرتے ہیں، قبائلی عصبیت کی مذمت اور اس کی مانعت کرتے ہیں، امیڈ کے استعمال میں بڑی بے احتیاطی شروع ہو گئی تھی، اور لوگ اس کے ذریعہ نشہ اور شراب تک پہنچ گئے تھے، جس سے مختلف قسم کی بد اخلاقیات پیدا ہو رہی تھیں، اس کی تحدید و تشریح کرتے ہیں۔

## تدوین علوم اور اجباے سنن

اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم کی تدوین اور سنتوں کی اجبا کی طرف بھی توجہ کی، ابو بکر بن حزم جو ایک

۱۰۰ ہجرت عمر بن عبدالعزیز (ابن عبدالکرم) ۱۰۶ ۱۰۷ ایضاً ۹۲ ۱۰۸ ایضاً ۱۰۹ ۱۱۰ ایضاً ۱۱۱ ۱۱۲ ایضاً ۱۱۳ ۱۱۴ ایضاً ۱۱۵ ۱۱۶ ایضاً ۱۱۷ ۱۱۸ ایضاً ۱۱۹ ۱۲۰ ایضاً ۱۲۱



بڑے عالم تھے، ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا:۔

انظر ما كان من حدیث رسول الله  
صلی اللہ علیہ وسلم فاكتبه فاتی خفت  
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں  
ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس کے مجھے اندیشہ ہے کہ  
علماء رخصت ہو جائیں گے اور علم مٹ جائے گا۔  
دروس العلم و ذهاب العلماء۔

انہوں نے تعین کے ساتھ عمرہ بنت عبد الرحمن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرہ روایات کی  
طرف توجہ دلائی کہ جلد اس کو قلم بند کر لیا جائے، پھر صرف ابوبکر بن حزم ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ عمال سلطنت اور شاہی  
علماء کو بالعموم اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا، اور گشتی فرمان جاری کیا کہ:۔

انظر والی حدیث رسول الله (صلی اللہ  
علیہ وسلم) فاجمعوها۔۔۔  
رسول اللہ علیہ وسلم کی احادیث ڈھونڈ ڈھونڈ کر  
جمع کرو۔

اسی کے ساتھ علماء کے وظائف مقرر کئے کہ وہ کمیوں اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کر سکیں۔  
وہ خود بڑے عالم تھے، انہوں نے بنفس نفیس فرائض و سنن کی تشریح کی طرف توجہ کی، خلافت کے ابتدائی  
دنوں میں ایک گشتی فرمان جاری کیا، جس میں فرماتے ہیں کہ:۔

”اسلام کے کچھ حدود و قوانین و سنن ہیں جو ان پر عمل کرے گا، اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی اور جو عمل نہیں کرے گا،  
اس کا ایمان ناکمل رہ جائے گا، اگر زندگی نے وفا کی، تو میں تمہیں اس کی تعلیم دوں گا، اور تمہیں ان پر چلاؤں گا، اگر  
اس سے پہلے میرا وقت آگیا، تو میں تمہارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا لیں بھی نہیں ہوں“

## چند خطوط و فرامین

میدنا عمر بن عبد العزیز کے قالب میں بوجا لیں اسلامی ذہن اور اسلامی روح کا فرما تھی، (اور جو بالآخر ان کے

لے تاریخ امپہان (ابونیم) ۱۷۴ سیرت عمر بن عبد العزیز ۱۶۴ ص ۱۷۴ صحیح بخاری کتاب الايمان باب قول النبي صلی اللہ علیہ وسلم نبی الاسلام علی

(نظام سلطنت میں جلوہ گر ہوئی) اس کا صحیح اندازہ ان کے خطوط اور سرکاری فرامین سے ہوتا ہے، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً

سلطنت کے کارپردازوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو لکھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا خالص اسلامی ذہن و دماغ بخشا تھا جس پر جاہلیت کی کوئی پرچھائیں، اور شاہان بنی امیہ کے اخلاق و افکار کا کوئی سایہ بھی نہیں پڑا تھا یہاں چند خطوط پیش کئے جاتے ہیں۔

ان کو ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض قبائلی سردار اور عہدہ داروں کے "نودولت" جاہلیت کی رسم حلیت و مخالفت کو زندہ کر رہے ہیں، اور جنگ و مقابلہ کے موقع پر یا البنی فلان، یا المصتر (فلاں قبیلہ کی دہائی ہے) ہاں لے اہل مضر اپنے حلیت کی مدد کرو) کا جاہلی نعرہ لگانے لگے ہیں، یہ اسلام کے رشتہ، اخوت اور نظام اجتماعی کے متوازی ایک جاہلی نظام اور جاہلی رسم کا احیاء تھا، اور بہت سے فتنوں کا پیش خیمہ سابق فرمانروا شاید اس کو بعض ملکی مصالح سے شہ دیتے یا کم از کم اہمیت نہ دیتے، لیکن عمر بن عبدالعزیز نے اس خطرہ کو محسوس کیا، اور اس کے بارے میں مستقل فرمان صادر کیا، اپنے ایک بڑے عہدہ دار ضحاک ابن عبدالرحمن کو لکھتے ہیں:-

حمد و صلوة کے بعد معلوم ہو کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس اسلام کے علاوہ جس کو وہ اپنے لئے اور اپنے بندگان خاص کے لئے پسند فرما چکا ہے، کسی دین کو قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی اس کتاب سے عزت بخشی اور اس کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلام میں تفریق کر دی ہے، ارشاد فرمایا:-

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ  
تہا ہے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی اور ایک  
يَهْدِي بِهَا اللَّهُ مِنَ النَّجْمِ سَوَاءٍ  
کتاب اصح کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو  
سُبُلَ السَّلَامِ وَمِنْهُمْ مِمَّنِ الظُّلُمَاتِ إِلَى  
رہنے والے ہیں، اس کی راہیں تیلانے ہیں اور ان کی  
النُّورِ بِأَنبَاءِ وَيَهْدِي بِهِم إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ  
توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور

ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

(المائدہ - ۱۶۱۱۵)

راہ جاہلیت میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک شخص دوسرے شخص کا حلیت بن جانا تھا، پھر وہ جاہلیت کی پاسداری کرتا تھا، اور حق و باطل میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔

نیز ارشاد ہے۔

وَيَا نَحْيَ أَنْزَلْنَا وَيَا نَحْيَ نَزَّلْنَا وَمَا  
أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مَبَشِّرًا وَنَذِيرًا  
اور ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ نازل کیا اور  
وہ راستی ہی کے ساتھ نازل ہو گیا، اور ہم نے آپ کو  
صرف خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔  
(اسراء ۱۰۵)

اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی، اس وقت تم لے  
اہل عرب (جیسا کہ تم کو معلوم ہے) ضلالت، جہالت، پریشانی، تنگی اور سخت انتشار میں مبتلا تھے، قتلے تہاے  
درمیان عام تھے، لوگ تم کو دباے ہوئے تھے اور لوگوں کے پاس جو تھوڑا بہت دین باقی تھا، اس سے بھی تم محروم  
تھے، اس کے برعکس لوگوں کی گمراہیوں میں سے کوئی گمراہی ایسی نہیں تھی، جس میں تم مبتلا نہ ہو، تم میں سے جو زندہ رہتا  
تھا، وہ جہالت و گمراہی کے ساتھ زندہ رہتا تھا، اور تم میں سے جو مرتا تھا، اس کا انجام جہنم ہوتا تھا، یہاں تک کہ  
اللہ تعالیٰ نے تم کو ان برائیوں، بتوں کی پرستش، جنگ و جدال، منافرت اور تعلقات کی خرابیوں سے صاف بچایا،  
تم میں سے انکار کرنے والے نے انکار کیا، اور تم میں سے تکذیب کرنے والے نے جھٹلایا، اور اللہ کا پیغمبر اللہ کی کتاب اور  
اسلام کی دعوت و تیار ہا، پھر تم میں سے بہت کم اور کمزور لوگ اس پر ایمان لائے، ان کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا،  
کہ لوگ انہیں آپک نہ لیں، تو اللہ نے ان کو پناہ دی، اور اپنی مدد سے ان کی تائید کی، اور ان کو وہ لوگ عطا فرمائے  
جن کا اسلام لانا اس کو منظور ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے اور اللہ  
کو اپنے رسول سے اس وعدہ کو پورا کرنا تھا، جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں، اس وعدہ کو تھوڑے سے مسلمانوں  
کے علاوہ عام طور پر لوگوں نے بعید سمجھا، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ  
دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ  
وہ اللہ ایسا ہے، کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا  
دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب  
کرنے لگے، اگر مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔  
(الممت - ۹)

المشركون ۵

بعض آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے خود مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے، ارشاد فرماتا ہے کہ۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (نور ۵۵)

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا، اور ان کے مذہب کے بعد اس کو بدل دیا جائے گا، بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں، میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور مسلمانوں سے اپنے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کر دیا ہے، اہل اسلام! یاد رکھو تم کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دیا، اسی اسلام کے صدقہ میں دیا ہے، جس کی بدولت تم اپنے دشمنوں پر فتح پاتے ہو، اور جس کی وجہ سے تم قیامت کے دن گواہ بنو گے، تمہارے لئے دنیا و آخرت میں اس کے علاوہ نہ نجات ہے، اور نہ کوئی حجت نہ کوئی بچاؤ ہے، اور نہ کوئی حفاظت کا سامان اور طاقت، جب اللہ تعالیٰ تم کو وہ بہترین دن نصیب کرے گا، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، تو موت کے بعد اللہ کے ثواب کی امید ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:-

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَتَاوًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (سورة القصص ۸۲)

یہ عالم آخرت ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں، جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہیں اور نہ فساد کرنا، اور نیک متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

میں تم لوگوں کو اس قرآن اور اس پر عمل نہ کرنے کے نتائج بد سے ڈراتا ہوں، اس لئے کہ اس پر عمل نہ کرنے کے نتیجے میں جو واقعات پیش آئے ہیں، امت میں جو خوریزی، جو غماند ویرانی، جو پراگندگی اور انتشار برپا ہوا، وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے، پس جس چیز سے اللہ نے تم کو اپنی کتاب میں منع کیا ہے، اس سے رک جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی وعید سے

زیادہ کوئی چیز خوف اور احتیاط کی مستحق نہیں ہے.....  
 جس چیز نے مجھے اس خط کے لکھنے پر مجبور کیا ہے، وہ یہ بات ہے، جو دیہات کے باشندوں کے متعلق مجھ سے  
 ذکر کی گئی، اور ان لوگوں کی بابت جو نئے نئے حاکم اور عہدہ دار بنے ہیں، یہ بچائے اجداد اور جاہل قوم کے لوگ  
 ہیں، احکام الہی کا ان کو علم نہیں، وہ اللہ کے معاملہ میں سخت دھوکہ میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ جو معاملہ  
 رہا ہے، اس کو وہ بھول گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی انھوں نے ناشکری اور ناقدری کی ہے،  
 جس تک پہنچنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی، مجھے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جنگ میں مضر اور مہم  
 والوں کا سہارا لیتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کے حامی اور ولی ہیں، جان اللہ  
 دیکھو، ایسے قدرناشکر گزار اور کافر نعمت ہیں، ان کو ہلاکت، ذلت و خواری کا کیسا شوق ہے؟ دیکھتے  
 نہیں کہ انھوں نے اپنے لئے کون سا مقام پسند کیا، کس امن و امان سے اپنے کو محروم کیا، اور کس گروہ سے اپنا  
 تعلق پیدا کیا؟ اب مجھے معلوم ہوا کہ شقی اپنے ارادوں ہی سے شقی ہوتا ہے، اور جہنم بیکار نہیں پیدا کی گئی ہے،  
 کیا ان لوگوں نے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نہیں سنا:۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ  
 أَخْوِيكُمْ وَأَتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ  
 مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں  
 کے درمیان صلح کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے  
 رہا کرو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔  
 (الحجرات ۱۰)

کیا انھوں نے یہ آیت کبھی نہیں سنی؟۔

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَقَمْتُ عَلَيْكُمْ  
 نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا  
 آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور  
 میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا، اور میں نے اسلام  
 کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔  
 (المائدہ ۳)

مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ زمانہ جاہلیت کے طرز کی مخالفت کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مشروط حمایت کے وعدہ سے منع فرمایا ہے، اور ارشاد ہے "لا اختلف فی الاسلام" (یعنی اسلام میں غلط دوستیاں اور حجتہ بندی نہیں ہے) جاہلیت میں ہر حلیف دوسرے حلیف سے اس کی توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کے معاہدہ اور رشتہ محالفت کا حق ادا کرے گا، اور اس کو پورا کرے گا، خواہ وہ بالکل ظالمانہ اور فاجرانہ ہو، اور اس میں صریح اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہو.....

میں ڈراتا ہوں ہر اس شخص کو جو میرا یہ خط سنے، اور جس کو یہ خط پہنچے اس بات سے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی قلعہ کو اختیار کرے، اور اللہ اور رسول اور مومنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا دوست بنائے، بڑے شکر و مدد سے اور بار بار اس سے آگاہ اور متنبہ کرتا ہوں، اور میں ان لوگوں پر اس ذات کو گواہ بنا رہا ہوں جس کی قدرت اور تصرف میں تمام جان دار ہیں، اور جو ہر شخص کی شہرگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے!

انہوں نے اپنے ایک فوجی افسر کو جنگ پر روانہ ہونے کے وقت جو ہدایت نامہ لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن قرآن کے سانچے میں کس طرح ڈھل گیا تھا، اور ان کا نقطہ نظر اور طریق فکر دنیا دار بادشاہوں اور سیاسی حکمرانوں سے کس قدر مختلف تھا۔

منصور بن غالب کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:-

"اللہ کے بندے امیر المومنین عمر کا یہ ہدایت نامہ منصور بن غالب کے نام جب کہ امیر المومنین نے ان کو اہل حرب کے اور ان اہل صلح سے جو مقابلہ میں آئیں، جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہے، امیر المومنین نے ان کو حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں، کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان موثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے، امیر المومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے، ہم اپنے دشمنوں سے جنگ

کرتے ہیں اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم ان پر غالب آجاتے ہیں، کیونکہ اگر یہ بات نہیں ہے تو ان کے  
 دراصل ہم کو مقابلہ کی قوت نہیں ہے، کیونکہ نہ تو ہماری تعداد ان کی تعداد کے برابر ہے اور نہ ہمارا سامان  
 ان کے سامان کے برابر ہے، پس اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہو جائیں تو وہ قوت اور تعداد میں  
 ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے، یاد رکھو! اگر ہم ان پر اپنے حق کی وجہ سے فتح نہ پاسکیں گے تو اپنی قوت کی  
 وجہ سے بھی ان پر غالب نہ آسکیں گے اور اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکننا ہوں جہاں تک  
 ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں، سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تم پر کچھ محافظ مقرر  
 کئے گئے ہیں جو تمہاری سفر و حضر کے افعال کو جانتے ہیں، پس ان سے شرم کرو، اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ  
 حسن سلوک کرو، اور ان کو اللہ کی نافرمانی کر کے ایذا نہ پہنچاؤ، خصوصاً ایسی حالت میں کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ  
 تم راہِ خدا میں نکلے ہوئے ہو، اور یہ مت سمجھو کہ ہمارے دشمن ہم سے گئے گزے ہیں، اس لئے گو ہم گناہ کار ہیں  
 لیکن وہ ہم پر غالب نہیں آسکتے، کیونکہ بہت سی ایسی قومیں ہیں جن پر ان کے گناہوں کی وجہ سے ان سے  
 بدتر لوگوں کو مسلط کر دیا گیا ہے، پس اللہ تعالیٰ سے اپنے نفسوں کے مقابلہ میں مدد چاہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ  
 سے تم اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد چاہتے ہو، میں بھی اپنے لئے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں۔  
 اور امیر المؤمنین منصور بن غالب کو حکم دیتے ہیں کہ سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں،  
 اور اپنے ساتھیوں کو ایسی قطع مسافت پر مجبور نہ کریں، جو مشقت میں مبتلا کر دے، اور سفر میں کسی ایسی  
 منزل پر پڑاؤ سے گزیر نہ کریں جس سے ان کو آرام ملتا ہو، یہاں تک کہ ان کا دشمنوں سے اس حالت میں سامنا  
 ہو کہ سفر کے تکان نے ان کی قوتوں کو گھٹا نہ دیا ہو، وہ ایسے دشمن کے پاس جا رہے ہیں جو اپنے گھروں میں ہیں،  
 ان کا سامان اور سواریاں سستائی ہوئی ہیں، پس اگر سفر میں اپنے اور اپنی سواریوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ  
 نہ کریں گے تو ان کے دشمنوں کو ان پر زیادہ قوت حاصل ہوگی، کیونکہ دشمن اپنے گھروں میں ہیں، جہاں  
 ان کے آدمی اور سواریاں آرام کئے ہوئے ہیں اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے۔

اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ ہر جمعہ ایک رات اور دن سفر نہ کریں اور آرام کریں جس میں خود کو اور جانوروں کو آرام پہنچائیں اور اپنے سامان اور ہتھیاروں کی مرمت کریں اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا قیام صلح کی بستوں کے الگ رکھیں امن و امان والی بستوں میں ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ جائے نہ ان کے بازاروں میں نہ ان کی مجلسوں میں ہاں وہ شخص جاسکتا ہے جس کو اپنے دین اور امانت پر پورا بھروسہ ہو اور نہ ان بستی والوں پر ظلم کریں اور نہ وہاں سے اپنے لئے گناہ جمع کریں اور نہ ان کو کچھ اذیت پہنچائیں سوائے اس کے کہ شرعی مطالبہ یا واجبی حق ہو کیونکہ ان کا حق اور ان کی ذمہ داری ہے جس کے پورا کرنے کا تم کو اسی طرح ذمہ دار بنایا گیا ہے جس طرح کہ وہ لوگ حقوق و ذمہ کی پابندی کے مکلف ہیں پس جب تک کہ وہ لوگ اپنے حقوق کی ادائیگی پر ثابت قدم رہیں تم لوگ بھی ان کے حقوق ادا کرتے رہو اور صلح والوں پر ظلم کر کے جنگ لے لو گوں پر غلبت حاصل کرو، قسم اللہ کی تمہیں ان لوگوں کے مال میں سے اتنا حصہ پہلے ہی دے دیا گیا ہے کہ اب مزید کی گنجائش ہے نہ ضرورت ہم نے تمہارے سامان میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے اور نہ تمہاری قوت میں کوئی ضعف رہنے دیا ہے اور تمہارے لئے سامان اچھی طرح جمع ہو گیا ہے تمہیں ایک منتخب فوج دی گئی ہے اور شرک لے لو گوں کی طرف تم کو مشغول کر کے صلح والوں کی طرف سے تمہاری توجہ ہٹالی ہے اور ایک مجاہد کے لئے جتنا بندوبست کر سکتا تھا اس سے بہتر تمہارے لئے کر دیا ہم نے تمہارے لئے قوت کی بہم رسانی میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور اللہ ہی پر بھروسہ ہے "وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ" اور امیر المؤمنین کی ہدایت ہے کہ ان کے جاسوس عرب اور اہل ملک میں سے وہ لوگ ہوں جن کے اخلاص اور صدق پران کو اطمینان ہو، کیوں کہ دروغ گوئی اطلاع نفع نہیں پہنچاتی، اگرچہ اس کی کوئی بات صحیح بھی ہو، قریب ذہندہ دراصل تمہارے دشمن کا جاسوس ہے تمہارا جاسوس نہیں. وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ

۱۔ جزیرہ و خراج وغیرہ ۲۔ سیرت مکرّم بن عبد العزیز ص ۸۴-۸۵ ترجمہ مولوی ابوالعرفان صاحب ندوی۔



ایک عمومی خط میں عمال سلطنت کو تحریر فرماتے ہیں:-

”اتابدیشک یہ ذمہ داری جو اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد فرمائی ہے، اگر میں نے اس کو قبول کیا ہے کہ اس سے میرا مقصد کھانا، لباس، سواری یا شاریاں یا جمع اموال ہوتا، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے پہلے ہی یہ چیزیں اتنی بے رکھی تھیں، جو شکل سے لوگوں کو ملا کرتی ہیں، لیکن میں نے اس ذمہ داری کو بہت ڈرتے ڈرتے قبول کیا ہے، مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ یہ عظیم الشان ذمہ داری ہے، اس کی باز پرس بڑی سخت ہے، جس وقت فریق اور مدعی قیامت کے دن جمع ہوں گے، تو اس کے معاملہ میں بڑی سخت جرح ہوگی، ہاں اگر اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور نظر انداز فرمائے، اور رحم فرمائے تو الگ بات ہے۔

میں نے تم کو حکومت کا جو کام سپرد کیا ہے، اور جو اختیارات تفویض کئے ہیں، ان میں سے تم کو احتیاط اور خدا کے خوف کی ہدایت کرتا ہوں، ذمہ داریوں کی ادائیگی اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کے اتباع اور اس کے نواہی سے اجتناب کی تاکید کرتا ہوں، جو باتیں اس کے خلاف ہوں، ان کی طرف بالکل توجہ کی ضرورت نہیں، تمہاری نظر اپنے اوپر اور اپنے عمل پر ہے، اور ان چیزوں کی طرف ہو جو تمہارے رب تک پہنچائیں، اور جو تم اپنے اور اپنی رعیت کے درمیان کرتے ہو، وہ تمہارے پیش نظر ہے، اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حفظ و نجات اسی میں منحصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں منزل مقصود تک پہنچ جاؤ، اس یوم موعود کے لئے وہی چیز تیار رکھو، جو خدا کے ہاں کام آنے والی ہو اور دوسروں کے واقعات میں تم نے ایسی عبرتیں دیکھی ہیں، جن کے برابر ہمارا وعظ و نصیحت موثر نہیں ہو سکتی۔ والسلام

## تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی طرف توجہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف مسلمانوں کی اصلاح اور ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ پر

۱۰ سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۹۲-۹۳ ترجمہ مولوی ابوالعرفان صاحب ندوی۔



اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈنے سے نہیں ملتا تھا۔

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز نے افریقہ میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول پر مقرر کیا، میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کئے جن کو وہ رقم دی جائے تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا، جس کو زکوٰۃ دی جاسکے، عمر بن عبدالعزیز نے سب کو غنی بنا دیا، آخر میں نے کچھ غلام خرید کر آزاد کئے، اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا۔<sup>۵۱</sup>

ایک دوسرے قریشی کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کی مختصر مدت خلافت میں یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوٰۃ کی لئے آتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دے دیا جائے، لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا، عمر کے زمانہ میں سب مسلمان غنی ہو گئے، اور زکوٰۃ کا کوئی مستحق نہیں رہا۔<sup>۵۲</sup>

ان ظاہری برکات کے علاوہ (جو صحیح اسلامی حکومت کا ثانوی نتیجہ ہیں) بڑا انقلاب یہ ہوا کہ لوگوں کے رجحانات بدلنے لگے اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی ہونے لگی، ان کے معاصر کہتے ہیں کہ ہم جب لید کے زمانہ میں جمع ہوتے تھے، تو عمارتوں اور طرز تعمیر کی بات چیت کرتے تھے، اس لئے کہ ولید کا یہی اصل ذوق تھا، اور اس کا تمام اہل مملکت پر اثر پڑ رہا تھا، سلیمان کھانوں اور عورتوں کا بڑا شائق تھا، اس کے زمانہ میں مجلسوں کا موضوع سخن یہی تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں نوافل و طاعات ذکر و تذکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا، جہاں چار آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تمہارا کیا پڑھنے کا معمول ہے، تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے، تم قرآن کب ختم کرو گے اور کب ختم کیا تھا، مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو۔<sup>۵۳</sup>

## ان کی زندگی کا جوہر

عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کا جوہر اور ان کی تمام سرگرمیوں اور جدوجہد کی روح اور قوت محرکہ

<sup>۵۱</sup> سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۶۹ <sup>۵۲</sup> ایضاً ص ۱۲۸ <sup>۵۳</sup> تاریخ طبری واقعات ص ۵۹۶

ان کا قوی ایمان، آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے، انھوں نے جو کچھ کیا، خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی وہ طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقتور حکمران کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی، ان کو کوئی اگر اس طرز عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع و لطف اندوزی کی ترغیب دیتا، تو ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔

إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ  
يَوْمٍ عَظِيمٍ (الانعام ۱۵)

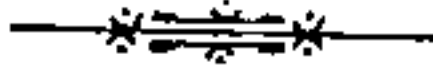
اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے ایک  
بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

انھوں نے ایک موقع پر اپنے خادم سے کہا تھا، اور یہ ان کی صحیح تعریف تھی کہ اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے، جو مرتبہ بھی مجھے حاصل ہوا، میں نے اس سے بلند تر مرتبہ کی تمنا کی، اور اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ کوئی مرتبہ باقی نہیں رہا، اب میری حوصلہ مند طبیعت جنت کی مشاق و تمنیٰ ہے! ان کی رقت و خشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انھوں نے نصیحت کی فرمائش کی اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا، اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمہیں کیا فائدہ ہوا، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی، اور تمہیں اللہ نے جنت نصیب کی، تو تمہارا کیا نقصان ہوا، یہ سن کر وہ اس قدر روئے کہ ان کے سامنے جو انگلیٹھی رکھی تھی، وہ بچھ گئی، یزید بن حوشب کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت و دوزخ صرف عمر بن عبدالعزیز اور حسن بصری کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

## عمر بن عبدالعزیز کی وفات

اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبدالعزیز کو اپنے کسی پیش رو کی مدت خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور ویران انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لیکن بنی امیہ جن کو اپنے

اس فرد خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمرؓ کے گھرانے میں رشتہ کرنے پر بہت کھپتے رہتے تھے، زیادہ دن تک اس مجاہدہ کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کر کے مسلمانوں کو اس عطیہ خداوندی سے محروم کر دیا، سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ کل دو سال پانچ مہینے خلافت کر کے ۱۰۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے، اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے ان کو زہر دیا۔



# دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

## حضرت حسن بصریؒ

امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا، جیسا کہ ان سے پہلے بہتا تھا، جاہلیت نے اپنے پیچھے مضبوطی کے ساتھ گاڑ لئے، ان کے جانشین نے (جس کو سلیمان ان کے بعد خلیفہ بنا گیا تھا) اور اس کے جانشینوں نے اس ناپست دیدہ وقفہ کی تلافی کی پوری کوشش کی اور حکومت کو اسی چول پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے زمانہ تک تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شخصی و موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و کامیابی کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں "نفاق" کے جراثیم اور "متزین سابقین" (گذشتہ امتوں کے دولت مندوں اور عیش پسندوں) کے اخلاق و اعمال پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، سوسائٹی میں تعلیش کا عمومی رجحان پیدا ہو گیا تھا ایمان و عمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ اس کی قوت کارازا اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا اس وقت خطرہ میں تھی، اندیشہ تھا کہ یہ امت اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ اور روحانی حیثیت سے کھوکھلی نہ ہو جائے، قلوب میں سردی و افسردگی، ایمان میں کمزوری اور تعلق بالشر میں اضمحلال بڑی شدت و سرعت سے پیدا ہونا چلا آ رہا تھا، اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی، حکومت اس جوہر کی حفاظت اور پرورش سے نہ صرف غافل و بے تعلق تھی، بلکہ اس کا وجود اور اس کے نمائندے اس مقصد کے لئے حقیقی خطرہ

بنے ہوئے تھے اور اپنی ذاتی سیرت و کردار سے وہ اس اخلاقی انحطاط کے محرک داعی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق اور انابت و عبودیت کی جو کیفیت پیدا کی تھیں اور جو ایک نبی ہی پیدا کر سکتا ہے وہ رو بہ تنزل تھیں یہ وہ کمی تھی جو حکومت کے رقبہ کی توسیع اور بڑی سے بڑی فتوحات سے پوری نہیں کی جاسکتی تھی اور جو ایک مرتبہ زائل ہونے کے بعد پھیلی امتوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے) بڑی مشکل سے واپس لائی جاسکتی ہیں۔

اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جاتی اور زمانہ کے اثرات اور اخلاقی و سیاسی عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کی طرح ایک نفس پرور آخرت فراموش مادہ پرست قوم بن کر رہ جاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا تھا کہ یہ دنیا مسلمانوں کو ہضم نہ کرے اور وہ اگلی امتوں کی طرح اس کے دھارے میں پڑ کر ضائع نہ ہو جائیں اپنے وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں صاف صاف کہا تھا:۔

ما الفقر اخشى عليكم ولكن اخشى	مجھے تمہارے بارے میں فقر و افلاس کا خطرہ نہیں
عليكم ان تبسط الدنيا عليكم كما	مجھے جو کچھ خطرہ ہے وہ اس بات کا کہ دنیا کی تم پر اسی
بسطت علي من كان قبلكم	کشائش و فراخی ہو جیسی تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی
فتنا فوسوها كما تنافسوها فتملككم	تھی اور تم بھی اس میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع
كما اهلكتهم۔	کر دو اور تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کرے جیسے

انگلوں کو ہلاک کیا۔

## تابعین کی دعوتِ ایمانی

یہ خطرہ جس کا زبان نبوت نے اظہار کیا تھا، جلد پیش آگیا، لیکن اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے

اللہ کے کچھ مخلص اور سرفروش بندے میدان میں آئے، جنہوں نے اپنی قوتِ ایمانی سوزِ دروں، صحبت و تربیت و غلطی و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو ہدایت کے اس طوفان میں تنکے کی طرح بہنے سے بچایا، اور خود اس سیلاب کی رفتار کو سست کر دیا، انہوں نے امت کے ایمانی و روحانی تسلسل کو قائم رکھا، جو اس کے نسلی و سیاسی تسلسل سے زیادہ ضروری تھا، اور اس کی زندگی میں وہ خلا نہیں آنے دیا، جس میں محض ایک بے سیرت بے روح، اور بے یقین قوم بن کر رہ جائے، اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے فضلاء و تابعین کی ایک سربراہ آوردہ جماعت تھی جن میں سعید بن جبیر، محمد بن سیرین اور شعبی خاص طور سے ممتاز تھے۔

## حسن بصریؒ

لیکن اس خطرہ کے اصل حریف اور ایمانی دعوت کے علمبردار حضرت حسن بصریؒ ہیں، جو ۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد بسیار مشہور صحابی حضرت زید بن ثابت کے آزاد کردہ غلام تھے، اور خود انہوں نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

## حسن بصریؒ کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصریؒ میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرمادی تھیں، جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو موثر بنانے کے لئے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے، جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پاسکتی تھی، صحابہ کرام کا انہوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ میں جو تغیرات پیش آئے تھے، ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرہ



سے وہ پورے طور پر باخبر تھے اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے جب آخرت کا بیان کرتے تھے یا صحابہ کرام کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں حجاج بن یوسف کا سازبان اور اور قادر الکلام اس اخیر دور میں نہیں گذرا لوگ حسن بصری اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے مشہور امام لغت و نحو ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے۔ وسعت علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ میں دس برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا تھا جو اس سے پہلے نہیں سنی ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا۔

کان من دساری النجوم علما وتقوی	وہ اپنے علم و تقویٰ زہد و ورع و استغناء و عالی ہمتی
وزهدا و دراعا و عفة و رقة و فقہا	لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک درختاں
ومعرفة یجمع مجلسہ شر و با من الناس	ستارہ تھے ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے
هذا یأخذ عنہ الحدیث و هذا یلقن	تھے اور ہر ایک فیض پاتا تھا ایک شخص حدیث
منہ التاویل و هذا یسمع منہ الجلال	حاصل کر رہے ایک تفسیر میں استفادہ کر رہا ہے ایک
والمحرام، و هذا یحلی لہ الفتیاء و هذا	فقہ کا درس لے رہا ہے اور ایک فتویٰ پوچھ رہا ہے
یتعلم المحکم و الفضا، و هذا یسمع الوعظ	کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد سیکھ رہا
و هو فی جمیع ذلك کالبحر العجاج ند فقا	ہے کوئی وعظ سن رہا ہے اور وہ ایک بحرِ خزاں ہے جو
و کالسراج الوہاج تالفا و لا تنس و واقفہ	موجیں لے رہا ہے اور ایک روشن چراغ ہے جو مجلس کو
ومشاهدة فی الامر بالمعروف والنہی	پر نور کر رہا ہے پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے

عن المنكر عند الامراء واثبات الامراء  
بالكلام الفصل واللفظ الجزل<sup>۱</sup>

سلسلہ میں ان کے کارنامے اور حکام و امراء کے بڑے  
پوری فصاحت اور پر شکوہ الفاظ میں اظہار حق کے

واقعات بھلانے کی چیز نہیں۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض صاحبِ حال اور صاحبِ کمال نہ تھے، بلکہ صاحبِ دل اور صاحبِ حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، جس وقت وہ تقریر کرتے تھے، سراپا درد و اثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ بصرہ میں کوئٹہ میں بڑے بڑے صاحبِ علم اور صاحبِ درس تھے، مگر ان کے حلقہٴ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ و بیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو کلامِ نبوت سے بڑی مناسبت تھی۔

امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں لکھا ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم السلام کے طرزِ کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، ایسی مناسبت دوسرے واعظین کے کلام میں نہیں دیکھی گئی، اسی طرح ان کا طرزِ زندگی صحابہ کرام کے طرزِ زندگی سے بہت مشابہ تھا<sup>۲</sup>۔

ان کی ان خصوصیات و جامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے اور ان کو امتِ محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے، تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ امتِ محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہئے ان میں حسن بصریؒ بھی ہیں، مگر معظمہ ہمیشہ سے عالمِ اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحبِ کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہل مکہ بھی حسن بصری کا علم دیکھ کر ان کی تقریریں سن کر ششدر رہ گئے، کہ ہم نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔<sup>۳</sup>

حسن بصریؒ کے مواعظ

حسن بصریؒ کے مواعظ دورِ صحابہ کی قوت و سادگی کا نمونہ ہیں، ان میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی،

۱۔ البیان التوحیدی اس کو ثابت بن قرہ سے نقل کیا ہے، ۲۔ احیاء العلوم الدین ج ۱ ص ۱۶۷ ۳۔ دائرة المعارف البستانی ج ۱ ص ۲۴۲

زندگی کی بے وقالی، اور آخرت کی اہمیت کا مضمون، ایمان و عمل کی تلقین، تقویٰ اور خشیتِ الہی کی تعلیم، طویل اہل اور فریبِ نفس کی مذمت ملتی ہے، اور اس دور میں جس پر اذیت اور غفلت کا سخت حملہ ہوا تھا، اور عوام اور بہت سے خواص دولت اور عیش و عشرت کے سیلاب میں خش و خاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے تھے انہی صفات کی ضرورت تھی، انہوں نے چونکہ صحابہ کرام کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا، اب حکومت امویہ کا شباب دیکھ رہے تھے، اس لئے وہ اپنے مواعظ میں اکثر بڑے درد و جوش کے ساتھ صحابہ کرام کی ایمانی کیفیات اور ان کی اخلاقی و عملی خصوصیات بیان کرنے لگتے ہیں، اور جب وہ ان دونوں زمانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اس عظیم انقلاب کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں، جو ان کو دیکھتے دیکھتے ایمان و عمل اور اخلاق و عادات میں رونما ہوا تھا تو ان کا درد اور جوش بہت بڑھ جاتا ہے، اور ان کے مواعظ تیر و نشتر بن جاتے ہیں، اور ان کے مواعظ اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح و بلیغ زبان اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں، ایک موقع پر اہل زمانہ پر تبصرہ، صحابہ کرام کا تذکرہ اور اسلامی اخلاق کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ہے افسوس لوگوں کو ایسوں اور خیالی منصوبوں نے	ھیہات ہیہات اهلک الناس لامانی
غارت کیا، زبانی باتیں ہیں عمل کا نام نشان نہیں، علم ہے	قول بلا عمل، ومعرفة بغير صبر وایمان
مگر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے صبر نہیں، ایمان ہے	بلا یقین، مالی اسری سجالا ولا اسری
مگر یقین سے خالی آدمی بہت نظر آتے ہیں، مگر مانگ ناپا	عقودا واسمع حیثا ولا اسری انیسا،
نے جانیا لوگوں کا شور ہے مگر ایک بندہ خدا یا اس نظر	دخل القوم واحلہ ثم فرجوا، وعرفوا
نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر	ثم انکروا وحرمو انما استعملوا، انما دین
بکل گئے، انہوں نے سب کچھ جان یا پھر کر گئے، انہوں نے	احدکم لعنة علی لسانہ اذا مثل المؤمن
پہلے حرام کیا، پھر اسی کو حلال کر لیا، تمہارا دین کیلئے؟	انت بیوم الحساب، قال نعم، کذب
زبان کا ایک چٹانہ، اگر پوچھا جاتا ہے کیا تم روزِ حساب	وما لکم یوم الدین، ان من اخلاق

المؤمنین قوۃ فی دین وایماناً فی یقین  
 وعلماً فی علم وحملاً یعلم وکیلاً فی  
 رفق وحملاً فی فاقۃ وصدماً فی غنی  
 وشفقتاً فی نفقۃ ورحمۃ لجمہود وعلماً  
 فی المحقوق وانشاقاً فی استقامۃ لایحیی  
 علی من ینقض ولا یاتم فی مساعدۃ من  
 یجب ولا یمز ولا یغز ولا یلمز ولا یلغو  
 ولا یلہو ولا یلعب ولا یمشی بالنمیمۃ  
 ولا یتبع مالیس لہ ولا یجد الحق الذی  
 علیہ ولا یتجاوز فی العذر ولا یشمت  
 بالفجیۃ ان حلت بغيرہ ولا یسر  
 بالمعصیۃ اذا نزلت بسواہ المؤمن  
 فی الصلوۃ خاشع والی الركوع مراع  
 قولہ شفاء وصبرۃ تقی ویکونہ فکرۃ  
 ونظرۃ عبرۃ یمخالط العلماء لیعلم  
 ویکتب ینہم لیسلم ویتکلم لیعلم  
 ان احسن استبشر وان اساء استغفر  
 وان عتب استعتب وان سفہ علیہ  
 حلم وان ظلم صبر وان حیر علیہ

پر یقین رکھتے ہو؟ تو جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں قسم  
 ہے روز جزا کے مالک کی غلط کما مومن کی شان تو  
 یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو، صاحب ایمان و یقین  
 ہو، اس کے علم کے لئے علم اور اس کے علم کے لئے علم باہر  
 زینت ہو، عقلمند ہو، لیکن نرم خوا، اس کی خوش پوشی  
 اور ضبط اس کے فقر و افلاس کی پردہ داری کرے،  
 دولت ہو تو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے  
 پائے، خرچ کرنے میں شفیق، خستہ حالوں کے حق میں  
 رحیم و کریم، حقوق کی ادائیگی میں کشادہ دست و فراخ دل،  
 انصاف میں سرگرم و ثابت قدم، کسی سے نفرت ہو تو اس کے  
 حق میں زیادتی نہ ہونے پائے، کسی سے محبت ہو تو اس کی  
 مدد میں حد شریعت سے نہ بڑھنے پائے، نہ عیب چینی کرتا ہو،  
 نہ طنز و اشارہ نہ طعن و تشنیع نہ لائینی سے اس کو کچھ کام  
 اونہ ہو و لعیب دہشی چھٹا خوری نہیں کرتا، جو اس کا حق  
 نہیں اس کے پیچھے نہیں پڑتا، جو اس پر واجب آتا ہے  
 اس کا انکار نہیں کرتا، معذرت میں حد نہیں بڑھتا  
 دوسرے کی مصیبت میں خوش نہیں ہوتا، دوسرے کی  
 مصیبت سے اس کو مسرت نہیں ہوتی، مومن کو نماز  
 میں شروع اور نمازوں کا ذوق ہوتا ہے اس کا کلام

عدل ولا يتعوذ بغير الله ولا يستعين  
 إلا بالله وقوؤ في الملاء، شكور في الخلاء  
 قانع بالرزق، حامد على الرخاء، صابر  
 على البلاء، ان جلس مع الغافلين كتب  
 من الذاكرين وان جلس مع الذاكرين  
 كتب من المستغفرين، هكذا كان  
 اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم،  
 الاوّل فالاول حتى اعقوا بالله عزّ وجلّ  
 وهكذا كان المسلمون من سلفكم الصالح  
 وانما غيركم لما غيرتم ان الله لا يغيّر  
 ما يقوّم حتى يغيّر واما بانفسهم واذا  
 اراد الله يقوّم سورة فلا مردّ له وما لهم  
 من دونه من قال:

شفاہ کا پیام اس کا صبر تقویٰ اس کا سکوت سراہر  
 خور و فکر اس کی نظر سراپا دس و عبرت کے علماء کی صحبت  
 اختیار کرنا ہے علم کی خاطر خاموش رہنا ہے تو اس لئے کہ کتابوں  
 اور گزشتہ محفوظات ہے رونق تو اس کے کچھ (تواب) کے لئے  
 اور فائدہ حاصل کرے نیکی کو اس کو خوشی ہوتی ہے غلظت  
 ہو جاتی ہے تو استغفار کرتا ہے شکایت کرتا ہے اور اس کے  
 دل میں کسی کی طرف سے رنج کتاب تو سمانی تلافی کرتا ہے اس سے  
 کوئی جہالت کتاب تو وہ تحمل اور عقل سے کام لیتا ہے ظلم  
 کیا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے کوئی اس کے حق میں نا انصافی  
 کے تو وہ انصاف کو نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی  
 کی پناہ نہیں لیتا، اور اس کے سوا کسی کو نہیں چاہتا صحیح  
 میں باوقار تہائی میں شکر گزار رزق پر قانع، آرام و عیش  
 کے زمانہ میں شاکر مصیبت اور آزمائش کی گھڑیوں میں صابر  
 غافلوں میں ذاکر، ذاکروں میں ہو تو استغفار میں شاغل  
 یہی شاہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے درجوں اور  
 مرتبہ کے مطابق، جب تک دنیا میں ہے اسی شان کے ہے اور جب  
 دنیا سے گئے تو اسی آن بان گئے، مسلمانوں تمہارے سلف صالحین کا  
 یہ نمونہ تھا جب تم نے اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ بدل یا تو اللہ نے بھی

مہتاب کے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا، ان شاء اللہ لا یغیّر ما یقوّم حتی ینتہر واما بانفسہم واذا اراد اللہ یقوّم سورة فلا مردّ له وما لهم من دونہ من قال:

(۱) لوگ خود اپنی (صلاحیت) کی حالت کو نہیں بدل دیتے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالتا تو جو چیز کرتا ہے تو پھر اس کے بدلنے کی کون صورت ہی نہیں اور کون خدا کے سوا ان کا مددگار نہیں رہتا)

۱۰۱۶۹  
 ابن کثیر البصری لابن الجوزی ص ۱۰۱۶۹

ایک دوسرے موقع پر صحابہ کرام کو یاد کرتے ہوئے اور سورہ الفرقان کی ان آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے جن میں مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا۔

ات المؤمنین لما جاءتهم هذه الدعوة  
من الله صدقوا بها وافضى يقينها الى  
قلوبهم خشعت لله قلوبهم وابدانهم  
وابصارهم كنت والله اذرا ايتهم  
رأيت قوما كانوا من اعيان الله  
ما كانوا باهل جدل ولا باطل ولكنهم  
جاءهم امر من الله فصدقوا به فتحتم  
الله في القران احسن نعت قال وعباد  
الرحمن الذين يمشون على الارض  
هوناً والهمون في كلام العرب اللين و  
السكينة والوقار فاذا خاطبهم الجاهلون  
قالوا اسلاماً ملماً ولا يبهلون وان  
جهل عليهم جلسوا يصاحبون  
عباد الله نهاسهم بسايمعون  
ثم ذكر ليهم خير ليل فقال والذين  
يبيتون لربهم سجداً وقياماً ينصبون  
الله على اقدامهم ويفترشون وجوههم

مومنین (اولین) کے کان میں جب خدا کی یہ پکار  
پہنچی تو انھوں نے اسی وقت اس کی تصدیق کی اور  
اس پر لبیک کہا، اس کا یقین ان کے دلوں کی گہرائی میں  
اتر گیا ان کے دل ان کے بدن اور ان کی نگاہیں خدا کی  
عظمت اور ہیبت میں جھک گئیں، بخدا میں جب ان کو  
دیکھتا تو مٹا معلوم ہوتا کہ دین حقائق اور غیب کی باتیں  
گویا ان کی آنکھوں کی بھی حقیقتیں ہیں ان کو بحث و بحث  
اور فضول باتوں سے کچھ کام نہ تھا، ان کو تو خدا سے ایک چیز  
پہنچی اور انھوں نے مان لی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید  
میں ان کا بہترین سراپا کھینچا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے  
”رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ  
چلتے ہیں“ آیت میں ”هوناً“ کا لفظ آیا ہے، هون  
کے معنی کلام عرب میں نرمی و سکینہ اور وقار کے ہیں پھر  
فرمایا اور جب ان سے سمجھ لوگ با کریں تو کہتے ہیں سلام  
ہے یعنی وہ ضابط و حلیم ہیں، جہالت پر نہیں اترتے اور  
اگر کوئی دوسرا جہالت پر اترے تو ان کے علم و وقار میں  
فرق نہیں آتا، یہ لوگ اللہ کے بندوں کے ساتھ کام کا

تَجِدُ الرَّبَّ يَجْرِي دَمُوعُهُمْ عَلَيَّ

خَدُّوهُمْ فَرَقَانِ رَجْمًا مَرْمَا

سَهْرًا وَيَلْهَمُ وَلَا مَرْمَا خَشَعُوا نَهَارَهُمْ

قَالَ الَّذِينَ يُقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ

عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ

عَرَامًا ۖ وَكُلُّ شَيْءٍ يَصِيبُ ابْنَ آدَمَ ثُمَّ

يَرْوِي عَنْهُ فَلَيْسَ بَعْرَامٍ ۖ إِنَّمَا الْغَرَامُ

الَّذِي لَمْ يَدَامتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ

مَدَقَ الْقَوْمِ وَإِنَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ

فَعْمَلُوا وَإِنَّمَا تَتَمَنَّوْنَ ۖ فَايَا كُفْرًا هَذِهِ

الْإِمَانِي ۖ حَمَّكَمُ اللَّهُ فَإِنَّ اللَّهَ لَمُرْبِطٌ

عِبَادًا بِأَمْنِيَّتِهِمْ شَيْئًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ

بات سننے کے لئے دن گزارتے تھے پھر ان کی بڑی اچھی

راتیں گزرتی تھیں جن کی اللہ تعالیٰ انہیں تعریف کرتا ہے اور

وہ لوگ اپنے رب کے سامنے سجد میں اور کھڑے ہو کر رات

گزارتے ہیں واقعی یہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے

چہروں کو خاک پر رکھ دیتے اور سجد میں پڑ جاتے، ان کے

رخاڑوں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا، اللہ کا فون ان کی

آنکھوں کو اشکبار رکھتا، آخر کوئی توبہ تھی جس کے لئے

وہ راتیں آنکھوں میں کاشت دیتے، کوئی توبہ تھی جس کا وہ

دن میں سہے سہے رہتے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور وہ لوگ کہتے

ہیں اے ہمارے رب ہم سے دوزخ کا عذاب دور کر دے بیشک

اس کا عذاب بڑا تیرا اور ان اور بلائے جان آیت میں غرام

کا لفظ آیہ جو مصیبت انسان کو لاحق ہو اور ٹل جائے

اس کو عرب غرام نہیں کہتے، غرام وہ مصیبت جو قیامت

یکم انسان کے سر سے نکلے قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی

معبود نہیں، اللہ کے بندے (اپنے قول اور اپنے دین میں)

سچے اور کچے ثابت ہوئے اور جو انہوں نے زبان سے کہا تھا

اس پر عمل کیا لیکن افسوس تم صرف تمناؤں میں مشغول ہو

لوگو! ان خالی تمناؤں سے باز آؤ، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ

نہیں کہتا کہ عذاب اس کی تمنا پر نہیں عطا فرماتا

۱۰۰ نیام الیل ملاً (محدث محمد بن نصر مروزی تلمیذ امام احمد بن حنبل)

اس تقریر کے آخر میں فرمایا، (اور اکثر موعظا کے بعد فرماتے) کہ اس وعظا و نصیحت میں تو کوئی کمی نہیں، لیکن دلوں میں زندگی بھی تو ہو۔

## ان کی حق گوئی و بیباکی

ان کے کمالات، فصاحت و بلاغت، تبحر علمی اور تقریر و تاثیر ہی تک محدود نہ تھے، بلکہ وہ اپنے زمانہ میں حق گوئی و بیباکی، اخلاقی جرأت و شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفہ وقت زید بن عبد الملک پر بلا تنقید کی، ایک موقع پر سردر در کسی شخص نے سوال کیا کہ اس زمانہ کے فتن (زید بن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہ اس کا ساتھ دو، نہ اس کا ساتھ دو، ایک شامی نے کہا، اور نہ امیر المومنین کا یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا ہاں نہ امیر المومنین کا، ہاں نہ امیر المومنین کا، حجاج کی تلوار اور سفاکی مشہور ہے، مگر حسن کی زبان اس کے زمانہ میں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی، اور اس کے متعلق بھی انھوں نے اپنے ضمیر اور عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

## اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

اسلام کے سیاسی و مادی اثر و اقتدار سے اسلامی مملکت میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے اسلام کو قبول تو کر لیا تھا، مگر اس کے اخلاق و معاملات اور قلب و دماغ پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہو سکے تھے اور ان میں حقیقی ایمان اور اَدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی نشان پیدا نہیں ہوئی تھی، خود مسلمانوں کی نئی نسل میں (جس کی پوری اسلامی تربیت نہیں ہو سکی تھی) بکثرت ایسے افراد تھے، جو جاہلی اثرات سے پاک نہیں ہوئے تھے، اور اسلام سے ان کو گہرا تعلق اور زندگی میں احکام الہی کے سامنے



انقیاد و تسلیم کی خواہشیں پیدا ہوتی تھیں، ان میں خاصی تعداد میں (بالخصوص حکومت کے طبقہ اور امراء و اعیان میں) ایسے لوگ تھے جن میں قدیم منافقین کے اخلاق و اعمال اور ان کے ذہن و مزاج کا پرتو نظر آتا تھا، یہی لوگ بالعموم زندگی پر جاؤ تھے، درباروں میں حکومت میں کلیدی جگہوں پر فوج میں بازاروں میں انہی کا غلبہ تھا، انہی کا طرز زندگی سوسائٹی میں فیشن کی حیثیت رکھتا تھا۔

بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ نفاق ایک وقتی و مقامی بیماری تھی جو عہد رسالت میں مدینہ طیبہ کے مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کے بعد وہ ختم ہو گئی، اس لئے کہ دو قوتوں کی کشمکش جاتی رہی اور صرف اسلام باقی رہ گیا، اس لئے قدرتی طور پر کسی ایسے گروہ کے پیدا ہونے کا موقع نہیں رہا جو ان دونوں کے درمیان متردد وذبذب ہے، اور کسی ایک کا وفادار اور نخلص رفیق نہ بن سکے، اب یا تو کھلا ہوا کفر ہے یا علانیہ اسلام، ان دونوں کے درمیان تذبذب کی کوئی وجہ نہیں، تفسیر و تاریخ میں اس خیال کے اثرات ملتے ہیں۔ ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے، جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے، اس بیماری کے پیدا ہونے کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام و کفر کی دو طاقتیں میدان میں ضرور ہوں، اور ان میں کشمکش جاری ہو، خالص اسلام کے غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی وجہ سے اسلام کو ہضم نہیں کر پاتا، اور وہ اس کے دل و دماغ میں گھر نہیں کر سکتا، لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دست بردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں، اس لئے وہ ساری عمر اس دو عملی اور تذبذب کی حالت میں رہتا ہے، اس کی نفسی کیفیات اس کے اعمال و اخلاق، اس کی اخلاقی کمزوری، اس کی مصلحت شناسی، موقع پرستی، زندگی سے تمتع و لطف اندوزی کا جذبہ، دنیاوی انہماک، آخرت فراموشی، اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی اور کمزوروں و غریبوں پر دست درازی، منافقین اولین کی یاد تازہ کرتی ہے۔

## ”نفاق“ و منافقین کی نشاندہی

حضرت حسن بصریؒ کی یہ بہت بڑی دینی ذہانت تھی کہ انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ نفاق موجود اور زندہ ہے اور منافقین نہ صرف موجود ہیں بلکہ زندگی پر اثر انداز اور سلطنت میں خیل ہیں، اور انہی سے شہروں کی چہل پھل ہے، کسی نے ان سے کہا کہ اس زمانہ میں بھی نفاق پایا جاتا ہے؟ فرمایا۔

لو خرجوا من ارضة البصرة لا متوحشتم  
اگر منافقین بصرہ کی گلیوں سے نکل جائیں تو تمہارا  
شہر میں جی لگنا مشکل ہو جائے۔

یعنی شہر کی آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے، جن کو اسلام سے برائے نام تعلق ہے اور اسلام نے ان کے دل میں گھر نہیں کیا ہے، یا وہ اپنے اعمال و اخلاق کے لحاظ سے اسلامی سیرت آراستہ نہیں ایک دوسرے کو موقع پر انھوں نے فرمایا۔

يا سبحان الله ما لقيت هذه الامة من  
منافق قهرها وامتأثر عليها۔  
خدا کی شان ہے اس امت پر کیسے کیسے منافق  
غالب آگئے ہیں جو پر لے درجہ کے خود غرض ہیں۔

لے متاخرین میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود اور زندہ ہے اور منافقین کا وجود کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ان کے نزدیک نفاق کی دو ہیں، نفاق اعتقادی اور نفاق عمل و اخلاق، نفاق اعتقادی کا قطعی علم زمانہ رسالت کے بعد انقطاع وحی کی وجہ سے دشوار ہے، لیکن نفاق عمل اور نفاق اخلاق، کثیر الوقوع ہے، وہ اپنے زمانہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس وقت نفاق بکثرت موجود ہے، نورا لکیر میں ارشاد فرماتے ہیں، اگر خواہی کہ از منافقان نمونہ بسینی رود مجلس ابراہیم و مصاحبان ایشان را بسئ کہ رضی اللہ عنہم را بر رضی شایع ترجیحی دہند اور انصاف بیچ فرق نیست در میان آنانکہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے واسطہ شدید نفاق در زیدند و در میان آنانکہ بحال پیدا شدہ اند بطریق یقین حکم شایع معلوم کردہ اند بعد ازاں بر ایشاخلاف آن اقدامی نمایند و علیٰ ہذا القیاس جماعت از معقولیاں کہ کلکوک شبہات بسیار بخاطر دارند معادرا نسیانیا ساختہ اند نمونہ آن کردہ اند (۱۲ مطبوع محمدی)

۱۲ صفة النفاق و ذم المنافقین، مولفہ محدث ابو بکر فریابی ص ۱۲۱ ۱۲۲ ایضاً ص ۱۲۱

یعنی حکومت میں وہ عنصر موجود ہے جو اسلام اور مسلمانوں کا مخلص نہیں اور جس کو صرف اپنے اغراض اور منافع سے چسپی ہے۔  
 حسن بصریؒ کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا  
 پکڑ لیا، اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے، لیکن اس زمانہ کے  
 معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح حسن بصری کے وجود اور ان کی دعوت کو  
 محسوس کیا، اس لئے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں کے گہرے نمونے معاشرہ پر زد پڑتی تھی، وہ نفاق کی حقیقت  
 بیان کرتے تھے اور نفاق ایک مرض تھا، جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف و اخلاق بیان  
 کرتے تھے اور یہ اوصاف و اخلاق بہت سے لوگوں میں پائے جاتے تھے، جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش  
 تھے، اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کے بحران کی مذمت کرتے تھے، اور بکثرت لوگ اس  
 وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے، اور ان حقیقتوں کو مستحضر کرتے تھے، اور مترفین و غافلین کا  
 ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی۔

غرض ان کی دعوت ان کے مواظبا، اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح  
 متضاد تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لئے ان سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ  
 ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پھپھی زندگی سے تائب ہوتے تھے، اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے،  
 وہ اپنی تقریروں اور مجلسوں سے دین و ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے، اور اپنی صحبت و عمل سے نفوس کی  
 تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ سال کی طویل مدت انھوں نے اس دعوت و اصلاح میں گزاری، کوئی  
 اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنے نفوس کو ان کی وجہ سے حلاوتِ ایمان اور حقیقتِ اسلام نصیب ہوئی، عوام بن  
 حوشب کہتے ہیں کہ حسنؒ نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا، جو انبیاء کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی  
 امتوں میں کرتے تھے۔

## حسن بصری کی وفات اور ان کی مقبولیت

اس خلوص، دینی انہماک اور علمی و روحانی کمالات کا یہ اثر تھا کہ سارا بصرہ ان کا گرویدہ تھا۔ ۱۱۵ھ میں ان کا جب انتقال ہوا تو سارے شہر نے ان کے جنازہ کی مشالیت کی اور بصرہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پوری آبادی کے قبرستان چلے جانے کی وجہ سے اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں ہو سکی۔

حسن بصری کے بعد ان کے روحانی و علمی جانشینوں نے اور اپنے اپنے زمانہ کے داعیوں نے دعوت الی اللہ دعوت آخرت اور دعوت ایمان و عمل کے تسلسل کو جاری رکھا اور درمیان میں کوئی خلا واقع نہیں ہونے دیا، حسن بصری کی وفات کے بائیس برس بعد خلافت امویہ کا خاتمہ اور خلافت عباسیہ کا آغاز ہوا، اور دمشق کے بجائے بغداد دار الخلافت اور پورے مشرق کا مرکز توجہ بن گیا۔

## انقلاب حکومت کی کوششیں

ان اصلاحی کوششوں اور دعوت و تذکیر کے تسلسل کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کی کوششیں بھی جاری رہی کہ خلافت کو اس کے صحیح مرکز پر قائم کیا جائے اور اس اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے جو امویوں اور ان کے بعد عباسیوں نے قائم رکھی تھی، خلافت غلطی سے ایسی قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہو گئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آواز اور کوئی تحریک اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی تھی، جب تک کہ اس کو شرافت نسب اور علو خاندان کی سند حاصل نہ ہو اور اس کی پشت پر خاندانی طاقت و حمایت نہ ہو، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلافت اموی اور خلافت عباسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا، ان کا تعلق اہل بیت تھا کہ ان کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا، لیکن وہ امت کے دینی رجحان کے نمائندے بھی تھے، اور ان کو مسلمانوں کی دینی عنصروں اور اصلاح پسند جماعتوں کی ہمدردی اور تائید حاصل تھی۔

۱۱۵ھ بصرہ میں وقت عراق کا سب سے بڑا شہر تھا، اور خلافت کے پایتخت دمشق کے بعد اسلامی مملکت میں دوسرے بڑے شہر ہونا تھا۔  
۱۱۵ھ ابن خلکان (حسن بصری)

واقعہ کر بلا کے بعد بھی خاندان نبوت کے متعدد افراد نے انقلاب کی کوشش کی سیدنا حسین (علیہ علی آلہ) اسلام کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن حسین نے ہشام بن عبدالملک کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا اور ۱۲۲ھ میں شہید و مصلوب ہوئے امام ابوحنیفہ نے ان کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجے اور حاضر نہ ہو سکے پر معذرت کی ان کے بعد بنی حسن میں سے حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ (بن عبدالسرا لمحض ابن الحسن المثنی بن سیدنا حسن بن علی) نے مدینہ طیبہ اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبدالسرا نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا، امام ابوحنیفہ اور امام مالک ان کی تائید و حمایت میں تھے، امام ابوحنیفہ نے برملا ان کی تائید کی، اور کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی، منصور کے فوجی افسر حسن بن قحطبہ کو ابراہیم کا مقابلہ کرنے سے باز رکھا، اور اس نے خلیفہ سے معذرت کر دی، اول الذکر رمضان ۱۴۵ھ میں مدینہ طیبہ میں اور آخر الذکر ذوالقعدہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے، بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں، لیکن انھوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلان حق کی ایک نظر قائم کر دی، اگرچہ عملاً وہ کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن ان کی کوششوں کا یہ ذہنی اثر قربانی اور جدوجہد کا یہ تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں، اسلامی تاریخ کی آبرو انہی جوان مردوں سے قائم ہے، جنھوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور صحیح مقصد کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔

”مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ“

۱۔ مناقب ابی حنیفہ بزاری، ج ۱ ص ۵۵

۲۔ امام مالک نے اہل مدینہ کو محمد ذوالنفس الزکیہ کی رفاقت و طاعت کا فتویٰ دیا، اگرچہ وہ منصور کی بیعت کر چکے ہوں (تاریخ

الکامل ج ۵ ص ۲۱۴) ۳۔ مورخین کا خیال ہے کہ ابوحنیفہ کے خلاف منصور نے جو سخت کارروائی کی اس کی وجہ ان کا عہدہ

قضا سے انکار تھا، بلکہ دراصل محمد و ابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا، اس باب کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو امام ابوحنیفہ

کی سیاسی زندگی، از مولانا سید مناظر حسن گیلانی۔

# خلافتِ عباسیہ اور دینی دعوت و تذکرہ

خلافتِ عباسیہ اور اس کے اثرات

خلافتِ عباسیہ، خلافتِ امویہ کی پوری پوری جانشین تھی، وہی دنیا داری کی روح، وہی شخصی و موروثی سلطنت کا نظام و آئین اور وہی اس کی خرابیاں اور بڑے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش و عشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سوئیاں میں عربی روح کار فرما تھی، اس کی خرابیاں اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہو گئی تھی، اور عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض و عیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا۔

امطری حیث شئت فسیا تیخی جہاں تیرے جی میں آئے جا کر برس جانیری پیداوار

خراچہ۔ کا خراج بہر حال میرے ہی پاس آئے گا۔

ابن خلدون کے اندازہ کے مطابق سلطنتِ عباسیہ کی سالانہ آمدنی ہارون رشید کے زمانہ میں سا ہزار پانچ سو قنطار (سات کروڑ ڈیڑھ لاکھ دینار سے زیادہ تھی، یعنی اکتیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ..... ۳۱۵) سالانہ سے زائد ہو اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑھی مالیت تھی، امون کے زمانہ میں اس میں

۱۵۱

کافی اضافہ ہوا، اس کثیر آمدنی میں سب سے بڑی سلطنت کا پایہ تخت ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کا سامان عیش و عشرت اور ساری دنیا کے اہل کمال، صنایع و معنی، غلام، باندیاں، مصاحب و شاعر اور خوش باش و خوش فکر سمٹ کر بغداد میں آگئے تھے، دولت کی فراوانی عجمیوں کے اقتلاط سے تمدن کی ساری خرابیاں اور تمدن زندگی کی ساری بے اعتدالیاں دارالسلام یا مرکز اسلام میں شروع ہو گئی تھیں، دولت کی بہتات مال کی بے وقعتی اور اس وقت کے تمدن و عیش کا اندازہ کرنے کے لئے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہے، مورخ لکھتا ہے:-

”مامون مع خاندان شاہی و ارکان دولت و کل فوج و تمام افسران ملکی و خدام حسن بن سہل (وزیر اعظم جس کی لڑکی سے مامون کی شادی ہو رہی تھی) کا مہمان ہوا، اور برابر انیس دن تک اس عظیم الشان بارات کی ایسی فیاضانہ حوصلہ سے مہانداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز کے لئے امیرانہ زندگی بسر کر لی، خاندان ہاشم و افسران فوج اور تمام عہدہ داران سلطنت پر شک و عنبر کی ہزاروں گویاں تیار کی گئیں، جن پر کاغذ لپٹے ہوئے تھے، اور ہر کاغذ پر نقد لوندی، غلام، املاک، خلعت، اسپ خاصہ، جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا، جس کے حصہ میں جو گولی آئے، اس میں جو کچھ لکھا ہو اسی وقت وکیل الخزن سے دلا دیا جائے، عام آدمیوں پر شک و عنبر کی گویاں اور درہم و دینار نثار کئے گئے، مامون کے لئے ایک نہایت مکلف فرس بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا، اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اس کے قدم پر نثار کئے گئے، ہوزرین فرس پر بکھر کر نہایت دل آویز ساں دکھاتے تھے“

## بغداد کے داعی الی اللہ

لیکن اسی پر عیش و عشرت بغداد میں کچھ نفوس قدسیہ تھیں، جو دعوت الی اللہ، تزکیہ نفوس، علوم دینیہ

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب ”بیموان“ (جاخط) ج ۳ ص ۹۱، وج ۵ ص ۱۱۵ و مجلدات الاغانی۔

۱۱۵ مامون رسولانا شبلی نسائی مرحوم ص ۱۵۴، بحوالہ ابن خلدون، ابوالفداء، ابن الاثیر، ابن خلکان۔

کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم میں بہترین منہمک تھے، انھوں نے شہر کے ہنگاموں اور زندگی کی ساری دیکھیوں سے اپنے کو علیحدہ کر لیا تھا، اور اس امت کی روح اور تعلق بشر کے سرمایہ اور اسلامی زندگی کے سرچشمہ (قرآن و حدیث) کی حفاظت میں مصروف تھے، حکومت ان کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی، اور دنیا کی کوئی ترغیب ان کو اپنے کام سے ہٹا نہیں سکی، مادیت کے اس پر تلاطم سمندر میں وہ انسانی جزیرے تھے، یہاں ڈوبنے والے پناہ لیتے تھے، انھوں نے بغداد میں مادی و پر عشرت زندگی کے پہلو بہ پہلو ایک خالص ایمانی اور روحانی زندگی قائم کر رکھی تھی، جو اپنی طاقت اور وسعت میں مادی و سیاسی زندگی سے کم نہ تھی، اگر خلفاء اور امراء و وزراء کا قبضہ جسموں پر تھا، تو ان کی حکومت لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر تھی، اور جہاں کہیں ان دونوں میں مقابلہ پیش آتا تو اکثر اوقات انہی کا غلبہ ثابت ہوتا، سلطان وقت ہارون رشید اپنے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ رقبہ میں مقیم تھا کہ شہور امام حدیث اور مرد صالح حضرت عبداللہ بن مبارک کی آمد ہوئی، شہر کی ساری آبادی ان کے استقبال کے لئے نکل پڑی، خلیفہ تنہا رہ گیا، ازدحام کا یہ حال تھا کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں، ہارون کی ایک کنیز بالاخانہ سے دیکھ رہی تھی، پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں، جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے، اس نے کہا کہ یہ بادشاہی نہ کہ ہارون کی بادشاہی کہ بغیر پولیس اور اہل کاروں کے جمع ہی نہیں ہوتے۔

یہ ایمانی اور علمی زندگی بغداد میں صاف نمایاں تھی، بغداد جس طرح عیش و عشرت اور مال و دولت کا گہوارہ تھا، اور اس کے طالب دنیا کے گوشہ گوشہ سے سمت کر یہاں جمع ہو گئے تھے، اسی طرح علم و عمل، صلاح و تقویٰ اور دعوت و اصلاح کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں اس فن کے امام اور اس فن کے طالب پورے عالم اسلام سے آکر جمع ہو گئے تھے، طبقات و تراجم کی کتابیں دیکھنے سے تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بغداد میں صلحاء و علماء کے علاوہ اور کوئی بستا ہی نہ تھا، اور قال اللہ و قال الرسول کے سوا کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی، یہ دینی رونق اور عین مرکز حکومت میں دین و اصلاح کی یہ دعوت انہی مجاہد بندوں کے دم سے تھی، جنھوں نے اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا، اس سلسلہ میں سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، جنید بغدادی



معروف کرخی، اور بشر حافی کا نام اور کام سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، ان حضرات کے اعمال و اخلاق، سچی خدا ترسی، بے لوث زاہدانہ زندگی، مخلوق سے استغنا، ایشیا و بے نفسی، بے نرض خدمت خلق، اور ایمانی کیفیات غیر مسلم آبادی تک پر اثر ڈالتی تھیں، ان کی ذات سے اسلام کا اخلاقی وقار قائم تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریریں سن کر اور ان کے اعمال و اخلاق دیکھ کر بہ کثرت یہودی، عیسائی، مجوسی اور صابئی مسلمان ہوتے تھے۔



## تدوین حدیث وفقہ

### امت کی دو فوری ضرورتیں

امت کی روح اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے ساتھ (جس کا سلسلہ برابر جاری تھا) امت کی اجتماعی زندگی و معاشرت اور معاملات و سیاست کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی اور اس بات کی ضمانت کی کہ وہ آئندہ بھی اسلام کے اصول و آئین کے مطابق ہوں گے، اس وقت دو براعظم (ایشیا و افریقہ) اور تمام یورپ کا ایک حصہ (اسپین) اسلام کی نگرانی و تولیت میں تھے، اسلام کی سلطنت روئے زمین کی سب سے بڑی وسیع اور سب سے طویل و عریض سلطنت تھی جو دنیا کے تمدن ترین ممالک پر مشتمل تھی، نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، تجارت و زراعت، ہزیہ و خراج محکومین، مفتوحہ ممالک کے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی نئی ضروریات تھیں، جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی غنظر تھیں، ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جاسکتا تھا، نہ سرسری طور پر ان سے گذرا جاسکتا تھا، حکومت مفصل و مکمل آئین و قانون سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جاسکتا تھا، اگر قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھی جس کا نتیجہ وہ ہوتا، جو اس وقت کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کا ہوا ہے، علماء کی ذرا سی غفلت اور محافظین سنت کی دماغی کاہلی اور راست پسندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت محروم کر دیتی۔

ع یک محظہ غافل بودم صد سالہ را ہم دور شد

اس وقت دو مسلوں کی طرف قوری توجہ کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو محفوظ و مدون کر لیا جائے، جو حدیث کے سینوں اور منتشر سفینوں میں تھا، یہ نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا ماخذ تھا، اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچے کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت ہے، وہ زمانہ نبوت کے تیس برسوں کا ایک طرح کا روزنامہ ہے، جو کسی پیغمبر کی امت کو حاصل نہیں اس کا ضائع ہو جانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا، علاوہ بریں اس میں امت کی اخلاقی اصلاح، اعتدال، صحیح روحانیت زہد و تقویٰ اور تغیر و انقلاب پر ابھارنے والی زبردست طاقت ہے، جس کے اثر سے ہر زمانہ میں اہل دعوت و اہل عزمیت پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر زمانہ کی مسلمان سوسائٹی کا شرعی و اخلاقی احتساب ہو سکے گا، اور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی بدعات کا مقابلہ کیا جاسکے گا۔

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی، قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اصول و کلیات موجود ہیں، اور ان سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بے حد متنوع، ان اصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر جاوی بنانے کے لئے اور ہر نئی حالت اور نئی ضرورت کے لئے ان کی ترجمانی و تشریح کے لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی۔

۱۵ حدیث کے جمع و تدوین کا کام محمد تابعین سے شروع ہو چکا تھا، اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی توجہ و دیکھی کا حال گذر چکا ہے، دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے جن میں سے ابن شہاب زہری (م ۱۲۴) ابن جریر کی (م ۱۵۰) ابن اسحاق (م ۱۵۱) سعید ابن ابی عروبہ مدنی (م ۱۵۶) سمری (م ۱۵۳) ربیع بن صلیح (م ۱۶۰) وغیرہ کے مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن ضرورت تھی کہ اس کو زیادہ علمی و ترقی یافتہ شکل پر انجام دیا جائے۔

## تذوین حدیث

پہلی ضرورت کے لئے قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ ظہورِ اسلام کے لئے اس ملک اور قوم کا انتخاب ہوا جو اپنی راست گفتاری، امانت اور قوتِ حفظ میں دنیا میں ممتاز تھی، صحابہ کرامؓ نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا، اس کو محفوظ کر لیا اور بے کم و کاست دوسری نسل کو پہنچا دیا، دوسری قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کے بت تراشے اور ان کی تصویریں بنائیں، اسلام میں بت تراشی اور صورت گری حرام ہے، مگر صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و عادات کا ایسا جتنا جاگتا مرقع پیش کر دیا، جس کی موجودگی میں کسی تصویر کی ضرورت نہیں، اور جو تصویر کے تمام مفاسد سے پاک ہے۔

## محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی

پھر ان روایات کی حفاظت و اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے صدہا کی تعداد میں ایسے بلند ہوش، تازہ دم، پر جوش طالب علم ہیا کر دیئے، جو قوتِ حافظہ و ذکاوت میں بے نظیر تھے، ان کا سیلابِ عجم کے ملکوں سے اٹھ آیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حدیث کا ایسا عشق بھر دیا کہ ان کے لئے چین سے بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا، ان کو ہر جگہ سے اس علم کو حاصل کرنے اور اپنے سینہ اور سفینہ میں محفوظ کرنے کی دھن تھی، علوم کی تاریخ اور پیغمبروں کی امتوں میں اس عشق اور دھن اور پھر اس احتیاط و امانت کی مثال نہیں ملتی، انھوں نے ان احادیث کو جمع کرنے اور ان روایات کو ان کے راویوں سے سننے کے لئے اسلامی دنیا کا کونہ کونہ چھان ڈالا، اس بادیہ پیمائی کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام بخاری نے ۴۰ برس کے سن میں سیاحت شروع کر دی تھی، بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک انھوں نے گھنگال ڈالے، امام ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (نو ہزار میل) سے زیادہ مسافرت کی، سیاہ پاپٹے کی، پھر میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا، محدث اندلس ابن حیوان نے حدیث اندلس، عراق، حجاز،

اورین کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی گویا طنجہ سے لے کر سونز تک سارا بڑا عظیم افریقہ اور پھر بحر احمر  
 طے کیا بہت سے محدثین کا سفر نامہ تین تین بڑا عظیموں ایشیا، افریقہ، یورپ (اسپین) پر مشتمل ہے، اس وقت کی تمدن و  
 معروف دنیا کے مغرب بعید (اندلس) سے مشرق بعید (خراسان) تک سفر کرنا اور شہر شہر پھرتا تو معمولی بات تھی۔

## فن اسما الرجال

ان مخلصین نے صرف حدیث و روایات کے جمع و تدوین پر اکتفا نہیں کیا بلکہ درمیانی واسطوں کی بھی  
 تحقیق کی اور ان تمام راویوں کے نام و نشان و تاریخ زندگی اور اخلاق و عادات کو محفوظ کر دیا جن کے  
 توسط سے یہ روایات ان کو پہنچی تھیں اس طرح جس ذات گرامی کے متعلق ”وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ“ کا  
 وعدہ اور اطلاع تھی اس کی بدولت لاکھوں اشخاص کی زندگی روشنی میں آگئی، ان ہزاروں لاکھوں انسانوں  
 کی اہمیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس ہستی کے اقوال و اعمال و احوال میں سے کسی جز کے راوی اور اس سلسلہ  
 روایت کے ایک ناقل تھے نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث و روایات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم ”اسما  
 الرجال“ کا وجود میں آ گیا، یہ علم محدثین کی عالی ہمتی، علمی شغف، تحقیقی ذوق اور احساس ذمہ داری کی روشن  
 مثال ہے اس امت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے ”الاصابة في احوال الصحابة“  
 (حافظ ابن حجر) کے انگریزی مقدمہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

”کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسما

الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم

ہو سکتا ہو“

۱۔ یہ مثالیں علمائے سلف (مولانا حبیب الرحمن خاں شروائی مرحوم) سے ماخوذ ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب کا عنوان ”سفر“

۲۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۳ء تا ۱۸۶۲ء ۳۔ خطبات مدرسہ از مولانا سید سلیمان ندوی۔

## محدثین کی احتیاط و امانت

محدثین نے نہ صرف رجال حدیث کے حالات صحیح و محفوظ کر دیئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی پابندی کی اور ان کے اخلاق و عادات، قوت و ضعف، احتیاط و بے احتیاطی، دیانت و تقویٰ، علم و حافظہ کے متعلق ان کے معاصرین کے بیانات اور قہرسم کی معلومات یکجا کر دیئے، اور ان کے بارہ میں کسی روایت سے کام نہیں لیا خواہ ان کے زمانہ میں حاکم ہوں یا اپنے وقت کے بڑے زاہد ہوں۔

درایوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانتداری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ واقعتاً آج اسلام کے منافخ میں ہیں، راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور ائمہ بھی تھے جن کی تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہو کر سب کی پردہ دری کی، اور ان کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں ان کو مل سکتا تھا، امام و کتب بڑے محدث تھے، لیکن ان کے باپ سرکاری خزانچی تھے، اس بنا پر وہ خود ان کے جب روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے کو ضرور ملا لیتے، یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے!

مسعودی ایک محدث ہیں، ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انہوں نے فوراً ان کے حافظہ سے اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی، یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے، صرف اس معاوضہ میں پیش کرنے چاہے کہ وہ ایک شخص کو معتبر (عدل) اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں، یعنی اس کے متعلق خاموش رہیں، انہوں نے ان شرفیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا، اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں سکتا، کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانتداری کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

## قوتِ حافظہ اور استخصار

محدثین کی یہ جماعت ایران و ترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا، وہ نسلاً بڑے تندرست، توانا، جفاکش، عالی حوصلہ، علم کے حریص اور حافظہ کے نہایت قوی تھے، حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوتِ حفظ کے محیر العقول نمونے پیش کرنا تھا، جو ضعف و کمزوری کے اس خالص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں ہم پہنچاتی ہے اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں، اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں، کثرتِ کار، مناسبتِ تام اور اپنے موضوع سے عشق و شغف ایسا ملکہ پیدا کرتا ہے، اور انتقالِ ذہنی کے لیے نمونے ظاہر ہوتے ہیں، جو غیر متعلق اشخاص کے لئے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علماء بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سو حدیثوں کی سند اور متن (مضمون حدیث) کو الٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگا دیا، اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے، امام بخاریؒ جب مجلس میں آئے تو ایک ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں، اور ان کی رائے دریافت کی، وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں، اہل علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے اپنے حصہ کی حدیثیں سنائیں تو امام نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سنائی تھیں ان کا متن یہ ہے، اور ان کی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی، یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کر دی، اور جس سند کا جو متن تھا، اور جس متن کی جو سند تھی، وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعتِ نظر، حاضر دماغی اور حافظہ پر انگشت بدندان رہ گئے۔

۱۰۰ مقدمہ فتح الباری ص ۱۰۰

## مجالس درس میں سامعین کا ہجوم

اس ذہین طبقہ کی توجہ و انہماک اور حدیث کی ضرورت کے احساس نے حدیث کا ایسا عام ذوق اس کے درس و روایت کی مجلسوں میں شرکت کا شوق اور انکرافت سے تلمذ و استفادہ کی حرص پیدا کر دی تھی کہ محدثین کی مجالس درس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی اور بادشاہوں کے دربار سے زیادہ ان میں سکون اور نظام ہوتا۔

یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا، تو اس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا، امام عام بن علی املائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں ایک بلند چوڑے پرٹھے تھے، خلیفہ معتمد بالشر نے ایک بار اپنا ایک معتد اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار حاضرین کی تعداد کا اندازہ تھا، احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو زہر غسان نامی مقام پر انھوں نے حدیث کا املا کیا، اس تکلی کھڑے ہوئے جن میں ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہنچاتا تھا، اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے، دونوں کا شمار کیا گیا تو کچھ اور چالیس ہزار دو تین شمار ہوئے، جو لوگ لکھتے نہ تھے، صرف سماعاً شریک تھے، وہ اس تعداد سے خارج ہیں، شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املائے حدیث کیا تو تین سو سولہ مستملی ان کی مجلس میں حاضر تھے، اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار فریابی کی مجلس میں دس ہزار آدمی ان کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے، جو دو قلم لے کر بیٹھے، فریبری کی روایت ہے کہ امام بخاری کی جامع صحیح کو ان سے نوے ہزار آدمیوں نے سنا۔

## صحاح ستہ

یہ عمومی ذوق 'انہماک' اور جذبہ مسابقت خالی از حکمت نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث کا ایسا محفوظ و مستند سرمایہ جمع ہو گیا، جو اس امت کی بہت بڑی ثروت اور اصلاح و تجدید کا ایک بڑا طاقت ور

۱۔ علی بن ابی طالبؑ بحوالہ تذکرۃ الحفاظ و تاریخ ابن خلکان۔ ۲۔ مقدمہ فتح الباری ص ۹۰



ذریعہ ہے اس سرمیا میں امام بخاری کی صحیح بخاری امام مسلم کی صحیح مسلم (جن کو اکثر صحیحین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) اور جس حدیث کو ان دونوں نے روایت کیا ہے اس کو متفق علیہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں (جو حدیث کا اعلیٰ درجہ ہے) سب سے ممتاز اور بلند پایہ ہیں، ان دونوں کے بعد امام مالک کی موطا اور امام ترمذی کی جامع امام ابو داؤد سجستانی کی سنن ابی داؤد، امام نسائی، اور امام ابن ماجہ کے مجموعے اپنی بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں بعد کی اصلاحی کوششوں اور تجدیدی کارناموں میں محدثین کرام کی ان ابتدائی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے آج بھی کوئی سنجیدہ اور وسیع اصلاحی تحریک اور دینی انقلاب کی کوشش اس عملی ذخیرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

## تدوین فقہ

اسی طرح فقہ کی تدوین مسائل کا استنباط و استخراج، ہزنیات و فتاویٰ کی ترتیب اسلام کی ایسی عملی ضرورت تھی جس کو بالکل موخر نہیں کیا جاسکتا تھا، اسلام جزیرۃ العرب سے نکلی کر شام، عراق، مصر و ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہنچ گیا تھا، معاشرت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ و روایات اور روح شریعت گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانہ صحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے

لہ نشاء ولی الشریعۃ محمد بن النبی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھتے ہیں: اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان صحیح ما فیہما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع وانہما متواتران الی مصنفیہما وانہ کل من یؤتی امرہما فہو مبتدع متبع غیر سبیل المؤمنین (۱) (یعنی محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان دونوں کتابوں میں متنی متصل مرفوع روایات ہیں، یعنی طور پر صحیح ہیں اور ان دونوں کتابوں کی

نسبت اپنے مصنفین کی تو اتر سے ثابت ہے اور جو شخص ان دونوں کتابوں کی تحقیر کرتا ہے وہ بتدریج اور اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر چلنے والے ہے)

پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

## ائمہ اربعہ اور ان کی خصوصیات

یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا، اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کا عظیم کئے ایسے لوگ میدان میں آئے، جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) بونفقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے، اپنے تعلق باللہ، لہبیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبہ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں، انھوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور سی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا تھا، امام ابو حنیفہ کو دو بار عہدہ قضا پیش کیا گیا، اور انھوں نے انکار کیا یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں آپ کا انتقال ہوا، امام مالک نے ایک مسئلہ کے اظہار میں کوٹے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعی نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گزارا، اور اپنی صحت قربان کر دی، امام احمد نے تن تنہا حکومت وقت کے رجحان اور اس کے سرکاری مسلک کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک و راہی سنت کے طریقہ پر پہاڑ کی طرح جے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تن تنہا اتنا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا، جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے، امام ابو حنیفہ نے تراشے ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کئے، جن میں سے اڑتیس ہزار عبادت سے تعلق رکھتے ہیں، اور پینتالیس ہزار معاملات سے۔

۱۔ مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کی طلاق کا کچھ اعتبار نہیں، اس مسئلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ خلفاء کے لئے جو بیعت لیا جاتی تھی، اس میں یہ کہلایا جاتا تھا کہ اگر بیعت توڑی تو بیوی کو طلاق ہو جائے گی، اگر مجبور کی طلاق کا اعتبار نہیں تو بیعت کے اس صلعت نامے میں کوئی طاقت اور تاثیر باقی نہیں رہ جاتی، اسی بنا پر حکومت کو امام مالک کے اس فتوے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی، اور اس کے حکام نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ ۲۔ غیر الاسلامیوں اور منافقوں کی حنیفہ الملکی ص ۹۶ ج ۲ ص ۱۸۵

شمس الائمہ کروری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان کی تعداد چھ لاکھ ہے، المدونہ میں جو امام مالک کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، چھتیس ہزار مسائل ہیں کتاب الامم جو امام شافعی کے افادات کا مجموعہ ہے سات ضخیم جلدوں میں ہے ابو بکر خلال (م ۳۳۵) نے امام احمد کے مسائل چالیس جلدوں میں جمع کئے۔

## ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین

پھر ان کو شاگرد ایسے ممتاز ملے جنہوں نے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا اور ان کی تنقیح و ترتیب کا کام جاری رکھا، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف جیسا قانونی دماغ نظر آتا ہے، جس نے ہارن رشید کی وسیع ترین سلطنت کے قاضی القضاة کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دیئے، اور اسلام کے اصول معاشیات پر کتاب الخراج جیسی عالمانہ تصنیف کی، اسی طرح ان کے شاگردوں میں امام محمد جیسا فقیہ اور مؤلف اور امام زفر جیسا صاحب قیاس نظر آتا ہے، جنہوں نے فقہ حنفی کو چار چاند لگائے امام مالک کو عبد اللہ بن وہب عبد الرحمن ابن القاسم اشہب بن عبد العزیز، عبد اللہ ابن عبد الحکم، یحییٰ بن یحییٰ اللیثی جیسے وفادار شاگرد اور لائق عالم ملے جن کی کوششوں سے مصر اور شمالی افریقہ فقہ مالکی کا حلقہ بگوش ہو گیا، امام شافعی کو بولطی، مزنی اور ربیع جیسے محنتی اور ذہین شاگرد ملے جنہوں نے فقہ شافعی کو مرتب و منقح شکل میں پیش کر دیا، امام احمد کی فقہ کو ابن قدامر جیسا مصنف اور محقق حاصل ہوا جس نے المعنی جیسی عظیم الشان تصنیف کی جو فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

## تدوین فقہ کا فائدہ

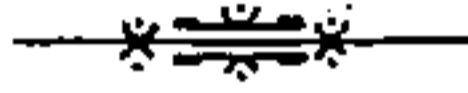
اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمہ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہونا اس دین کی

لے سیرۃ الزمان (مولانا شبلی) بحوالہ فتاویٰ عقود العقیان۔ ۳۵۵ اس کتاب کا نام الجامع العلوم امام احمد ہے

ابو بکر خلال کا مفصل حال شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۲ ص ۳۶۱ میں ملاحظہ ہو

زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی عملی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہو گئی اور اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی جس کی قوتیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں، انھوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کر دیں اور ایسے اصول مرتب کر دیئے، جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کے حل کرنے میں مدد ملی جاسکتی ہے، اور عام معتدل زندگی کو باقاعدہ اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گزارا جاسکتا

۴۔



# فتنہ خلق قرآن اور امام احمد ابن حنبل

## فلسفہ الہیات اور ذات و صفات کی بحثیں

دوسری صدی کی ابتدا ہی میں مسلمانوں کا تعارف یونانی فلسفہ سے ہوا یہ فلسفہ محض چند خیالات و قیاسات کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک طلسم تھا، جس کے پیچھے کوئی حقیقت و اصلیت نہ تھی، محدود الفاظ جن کے ساتھ خاص تصور اور تجربات وابستہ ہوں، ایک غیر محدود ذات کی حقیقت و صفات کو کس طرح بیان کر سکتے ہیں، اللہ کی ہستی اور اس کی ذات و صفات کا مسئلہ کیمیائی طرز کی تحلیل و تجزیہ اور علمی موٹنگائیوں اور قیاس آرائیوں کا میدان نہ تھا، اس معاملہ میں انسانوں کو وہ ابتدائی معلومات اور ذاتی تجربات ہی حاصل نہیں جن پر بحث و قیاس کی عمارت قائم کی جاسکے اس بارہ میں انسانوں کا ذریعہ علم صرف انبیاء علیہم السلام کی اطلاع اور وحی الہی ہے، اسی اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی صفت بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو سکتا ہے اور اسی پر انکشاف کرنا عقل کی پختگی اور بالغ نظری ہے، مسلمانوں کے پاس قرآن و حدیث کی صورت میں یہ علم محکم موجود تھا، اور ان کو اس شغل بے حاصل (الہیاتی مباحث) کی مطلق ضرورت نہ تھی، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ دین اور محدثین اسی مسلک پر قائم تھے، اور مسلمانوں کی ساری توجہ دعوت اسلام، فتح و جہاد، اور زندگی کے عملی مسائل اور مفید علوم کی تدوین میں مصروف تھی، جب یونانی اور سریانی کتابوں کے تراجم ہوئے اور قدیم مذاہب و ممالک کے علماء و متکلمین سے اختلاف ہوا تو امت کے وہ گروہ جو جلد متاثر ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، اور جن کی ذہانت میں گہرائی اور پختگی تھی،

زیادہ سلطنت اور جدت تھی، اس طرز فکر اور طریقہ بحث سے متاثر ہوئے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ان کے باہمی تعلق، کلام الہی، رویت باری، مسئلہ عدل، تقدیر، جبر و اختیار کے متعلق ایسی بحثیں اور مسائل پیدا ہو گئے، جو نہ دینی حیثیت سے ضروری تھے، نہ دنیاوی حیثیت سے مفید، بلکہ امت کی وحدت اور مسلمانوں کی قوتِ عمل کے لئے مضر۔

## معزکہ کا عروج

دینی فلسفیوں کے اس گروہ کی امامت معزکہ کر رہے تھے، جو اپنے وقت کے ”روشن خیال“ عالم اور پر جوش متکلم تھے، انھوں نے ان علمی بحثوں کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا، اور اپنی ساری ذہانتوں کو ان مباحث پر لگا دیا، ان کے مقابلہ میں محدثین و فقہاء کا گروہ تھا، جو ان مسائل میں سلف کے مسلک کا قائل تھا، اور ان موٹنگائیوں کو مضر اور ان تعبیرات کو غلط سمجھتا تھا، ہارون رشید کے دورِ خلافت تک معزکہ عروج حاصل نہیں ہوا، مومن کے زمانہ میں جو یونانی فلسفہ اور عقلیت سے مرعوب تھا، اور مخصوص تربیت اور حالات کی وجہ سے اس کی داعی ساخت معزکہ سے ملتی جلتی تھی، معزکہ کو عروج حاصل ہوا اور قاضی ابن ابی داؤد کی بدولت جو سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاة ہو گیا تھا، اور معزکہ کے افکار و آراء کا پر جوش داعی اور مبلغ تھا، مذہب اعتزال کو حکومتِ وقت کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو گئی، مومن میں خود دعوت کی روح اور ایک داعی کا جوش اور جذبہ تبلیغ تھا، اس میں ذہین نو جوانوں کی عجلت پسندی اور مطلق العنان فرماؤں کی ضد (راج ہٹ) دونوں جمع تھیں، اس کے دربار اور مزاج پر معزکہ حاوی تھے۔

لہٰذا اس نے ایک مرتبہ حضرت علیؑ کی تفصیل کا اعلان کر دیا جس سے ملک میں خاصی بڑی پیدا ہوئی، ایک مرتبہ متوکل کے بوازا

اعلان کیا، پھر جب قاضی القضاة یحییٰ بن اکثم نے علیؑ طوڈ پر اس کو قائل کیا تو اس کی حومت کا اعلان کروا دیا۔

عقیدہ خلق قرآن اس وقت معتزلہ کا شعار اور کفر و ایمان کا معیار بن گیا تھا، محدثین اس مسئلہ میں منزل  
کے حریف اور مد مقابل تھے، اور محدثین کی طرف سے امام احمد بن حنبل اس مسئلہ میں سینہ سپر تھے۔

## امام احمد بن حنبل

امام احمد بن حنبل ریح الاول ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، وہ خالص عربی النسل اور قبیلہ اشجین  
میں سے تھے، صبر و ہمت اور استقامت و عزیمت اس قبیلہ کے تاریخی خصائص میں سے ہیں، ان کے دادا حنبل بن  
ہلال بصرہ سے خراسان منتقل ہو گئے، اموی حکومت میں وہ علاقہ سرخس کے حاکم بھی تھے، لیکن جب عباسیوں نے  
اہل بیت اور بنی ہاشم کے نام سے خراسان میں اپنی دعوت پھیلانی تو وہ اس دعوت کے ہمدردوں اور کارکنوں  
میں تھے، امام احمد کی ماں مرو سے بغداد آئیں، تو وہ پیٹ میں تھے، ولادت سے پہلے ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا  
ماں نے بڑی ہمت اور جوش مندی سے پرورش کی، گذرا اوقات کے لئے برائے نام ایک جائیداد تھی، ان حالات نے  
ان میں تحمل و جفاکشی اور عزم و اعتماد علی النفس کی صفات پیدا کر دیں، بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا، اور زبان کی  
تعلیم حاصل کی، پھر ایک دفتر میں داخل ہوئے تاکہ تحریر و انشاء کی مشق حاصل کریں نجابت اور صلاحیت کے

لے خلق قرآن کی بحث ایک خاص علمی اور فلسفیانہ بحث تھی جس کا داعی اثر (جیسا کہ بعض اعتزال دوست مؤرخین نے اعتراض کیا  
ہے) یہ پڑنا لازمی تھا کہ قرآن مجید کی عظمت و جلالت اور اس کے لفظ و معنی کلام الہی ہونے کا عقیدہ کمزور پڑ جاتا، محدثین معتزلہ کی  
ان تعبیرات کو غلط اور امت کے لئے مضر سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اس کی علانیہ مخالفت کی، معتزلہ روشن خیال اور آزادی آرا کا  
احترام کرنے والے مشہور ہیں، لیکن انھوں نے اس مسئلہ میں سخت نراورندہی جبر و استبداد سے کام لیا، اور اپنی ناعاقبت اندیشی  
سے سارے عالم اسلام کو میدان جنگ اور دارالامتحان بنا دیا، انھوں نے اس مسئلہ میں اپنے مخالفین کے ساتھ وہ سلوک کیا جو  
قرن وسطیٰ میں ارباب کلیسا نے آزاد خیالوں کے ساتھ کیا تھا، بالآخر یہی سختی اور حکومت وقت کی سرپرستی مذہب اعتزال،  
اور معتزلہ کے زوال کا باعث ہوئی۔

۱۷۰ھ میں عہد صدیقی کے مشہور سپہ سالار ثمنی بن حارثہ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

آثار یحییٰ سے نمایاں تھے، ان کے چچا بغداد کے وقائع نگار تھے اور خلیفہ کی غیر موجودگی میں وہ پرچہ نویسی کرتے تھے اور خبریں بھیجتے تھے ایک مرتبہ انہوں نے یہ تحریریں اپنے کسین کھتیجے کے سپرد کیں کہ وہ ایک معین شخص کو پہنچا دیں انہوں نے اس خیال سے کہ اس میں اہل بغداد کی شکایت اور بہت سے لوگوں کی مخبری ہوگی ان کاغذات کو دجلہ میں ڈال دیا جب وہ دفتر میں خطوط نویسی کی مشق کرتے تھے تو بہت سی عورتیں جن کے شوہر مارون رشید کے ساتھ فوج میں باہر گئے ہوئے تھے ان سے خط پڑھواتی اور جواب لکھواتی تھیں، وہ خطوط لکھ دیا کرتے تھے لیکن جس مضمون کو شریعت یا تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے اس کو نہیں لکھتے تھے تقویٰ اور طہارت اور صلاحیت و نجابت کے انہی آثار کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے ایک صاحب نظر (سلیم بن جبیل) نے کہا تھا کہ اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو اہل زمانہ پر حجت ہوگا۔<sup>۱۰</sup>

علوم دینیہ میں انہوں نے حدیث کی طرف خصوصی توجہ کی، سب سے پہلے قاضی ابویوسف رحمہ اللہ سے حدیث کی کتابت کی، پھر چار برس تک بغداد میں امام حدیث سلیم بن بشر ابن ابوجازم الواسطی (م ۸۲ھ) سے استفادہ کرتے رہے اس اشار میں مشہور ائمہ حدیث عبدالرحمن بن مہدی ابویکرین عیاش وغیرہ سے استفادہ کیا ان کی اپنے مقصد میں مستعدی اور سرگرمی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وہ کہتے ہیں کہ میں بعض دن حدیث سننے کے لئے اتنے سویرے جانے کا ارادہ کرتا کہ میری ماں میرا دامن پکڑ لیتیں کہ اتنا تو ٹھہر جاؤ کہ اذان ہو جائے اور کچھ اجالا ہو جائے۔

بغداد سے فارغ ہو کر انہوں نے بصرہ، حجاز، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے استفادہ کیا۔

۸۷ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں ان کی ملاقات امام شافعی سے ہوئی، پھر بغداد میں دوبارہ ملاقات ہوئی جب کہ وہ اپنے اصول اور اپنی فقہ بہت کچھ مدون کر چکے تھے، امام احمد اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے، امام شافعی احادیث کے صحت و سقم کے بارے میں اکثر ان پر اعتماد کرتے اور فرماتے تھے کہ اگر تم محدثین کے یہاں

۱۰ لفظ تاریخ حافظ ذہبی (ترجمہ امام احمد بن حنبل) ۲۳۰ المناقب لابن ابی حزمی ۲۳۰ ۳۳۰ ایضاً



حدیث صحیح ہو تو مجھے بتلا دیا کرو میں اسی کو اختیار کروں گا۔

انہوں نے جریر بن عبد الحمید محدث سے حدیث سننے کے لئے رے (ایران) جانے کا بھی قصد کیا، لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جاسکے کہتے تھے کہ اگر میرے پاس ۹۰ درہم بھی ہوتے تو میں چلا جاتا، طلب حدیث میں ان کی بلند ہمتی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ۱۹۸ھ میں انہوں نے حج کی نیت سے حجاز اور وہاں کچھ دن قیام کر کے عبد الزاق بن ہمام سے حدیث سننے کے لئے صنعاء میں کا قصد کیا تھا، اور اپنے ہم دریں یحییٰ بن معین سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا، دونوں نے اس کی نیت کی اور کہہ پونچے، ابھی دونوں طواف قدوم کر رہے تھے کہ عبد الزاق بن ہمام طواف کرنے دکھائی دیئے، ابن معین ان کو پہچانتے تھے، انہوں نے سلام کیا، اور امام احمد کا تعارف کرایا، انہوں نے ان کو دعویٰ اور کہا کہ میں نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے، یحییٰ بن معین نے کہا کہ ہم کل آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ سے حدیث کی سماعت کریں گے، جب وہ چلے گئے، تو امام احمد نے اپنے رفیق سے کہا کہ تم نے شیخ سے کیوں وعدہ لے لیا؟ انہوں نے کہا کہ حدیث سننے کے لئے شکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک ہمینہ کے سفر، پھر واپسی کے ایک ہمینہ اور مصارف کثیر سے بچالیا، اور شیخ کو ہمیں پہنچا دیا، امام احمد نے کہا کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں حدیث کے لئے سفر کی نیت کروں، پھر اسی وجہ سے فسح کروں، ہم تو جائیں گے اور وہیں جا کر نہیں گئے چنانچہ حج کے بعد صنعاء گئے، اور زہری اور ابن المسیب کی روایتوں کی (جو پہلے سے ان کی سنی ہوئی نہیں تھیں) انہوں نے وہاں سماعت کی۔

اس بلند ہمتی، جفاکشی، کثرت اسفار اور فطری اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کا نتیجہ تھا کہ ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اس وسعتِ علم اور کثرتِ حفظ کے باوجود وہ امام شافعی کے تفقہ، حسن استنباط اور ذکاوت سے متاثر تھے اور کہتے تھے کہ مارات عینائی مثلاً انہوں نے ان سے اجتہاد کے اصول سیکھے اور اس کا ملکہ اخذ کیا اور بالآخر وہ اس امت کے نامور مجتہدین میں ہوئے، جن کی فقہ ابھی تک عالم اسلام میں زندہ ہے، امام شافعی بھی

۱۔ ابن کثیر اور ابن جوزی۔

ان کے بڑے معترف اور قدرواں تھے، بغداد سے جاتے ہوئے انھوں نے فرمایا "خروجت من بغداد وما خلفت بها اتقى واقفه من ابن حنبل" (میں بغداد چھوڑ کر جا رہا ہوں، اس حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے نہ کوئی فقیہ)۔

چالیس سال کی عمر میں غالباً ۲۰ھ میں انھوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، یہی ان کا کمال اتباع سنت تھا کہ انھوں نے عمر کے چالیسویں سال جو سن نبوت ہے، اشاعت شروع کی، ابتداء ہی سے ان کے درس میں طالبین و سامعین کا ازدحام ہوتا تھا، بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی، جن میں سے پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے، ان کے درس کی مجلسیں بڑی باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھیں، کوئی وہاں تفریح کی بات یا غیر سنجیدہ حرکت جو حدیث کے وقار کے خلاف ہے نہیں کر سکتا تھا، غریبوں کو امر اور اہل دنیا کے مقابلے میں ترجیح اور اعزاز حاصل تھا، علامہ ذہبی امام احمد کے ایک رفیق اور سمعصر کا بیان نقل کرتے ہیں:-

لم ار الفقیر فی مجلس اعرفنا فی مجلس	میں نے غریب آدمی کو جتنا امام احمد کی مجلس درس
الی عبد اللہ، کان مائلاً الیہم مقصراً	میں معزز دیکھا، کہیں نہیں دیکھا، وہ غریبوں کی طرف توجہ
عن اهل الدنيا، وكان فيه حلم وولم	دیکھتے تھے اور امرائے بے رخی برتنے تھے، ان میں حلم و
یکن بالعقول، وكان كثير التواضع	وقار تھا، ان کے مزاج میں عجلت نہ تھی، بڑے متواضع
تلوه السکينة والوقار اذا جلس فی	اور کسر المزاج تھی، طماننت اور وقار ان کے چہرہ سے
مجلسه فلما بعد الحصر لا يتکلم حتى یبال	جیاں تھا، عصر کے بعد جب درس کے لئے بیٹھے تو جب تک

ان سے سوال نہ کیا جائے گفتگو نہ فرماتے تھے۔

ان کی زندگی ائمہ سلف کی طرح فقرو زہد اور توکل و قناعت کی زندگی تھی اور ان کا فقر اختیار ہی

تھا، انھوں نے کبھی خلفاء اور سلاطین وقت کا کوئی عطیہ قبول نہیں کیا، ان کے لڑکوں نے کبھی ان سے اس مسئلہ پر بات چیت کی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مال حلال ہے اس سے حج درست ہے، میں اس کو حرام سمجھ کر نہیں، بلکہ احتیاطاً چھوڑتا ہوں، وہ محنت کر کے یا اپنی آبائی جائیداد کی آمدنی سے گزارا کرتے تھے، اس فقر و تنگی کے باوجود بڑے فیاض اور عالی حوصلہ تھے، فرماتے تھے، اگر ساری دنیا سمٹ کر ایک لقمہ بن جائے اور وہ لقمہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں ہو اور وہ مسلمان اس لقمہ کو کسی مسلمان بھائی کے منہ میں رکھ دے تو ذرا بھی اسراف نہ ہوگا، وہ صرف مال کے بارے میں نہیں بلکہ اپنی ذات کے بارے میں بھی بڑے فرائض و حوصلہ اور عالی ظرف تھے، ایک شخص نے ایک موقع پر ان کو بہت سخت سست کہا، تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کو ندامت ہوئی، اور اس نے آکر معذرت کی، اور کہا کہ آپ مجھے معاف کر دیں، فرمایا جہاں یہ بات ہوئی تھی وہاں سے قدم اٹھانے سے پہلے میں تم کو معاف کر چکا تھا، انھوں نے فتنہ خلاق قرآن میں اپنے سب دشمنوں کو حتیٰ کہ خلیفہ وقت کو جس کے حکم سے ان کو سخت ترین اذیت پہنچی تھی، معاف کر دیا، فرماتے تھے کہ صرف داعی بدعت کو تو معاف نہیں کرتا، ورنہ جس نے میری اذیت میں حصہ لیا ہے، سب میری طرف سے آزاد ہیں، کبھی فرماتے کہ تمہارا اس میں کیا نفع ہے کہ تمہارے سبب سے کسی مسلمان کو عذاب دیا جائے۔

ان کمالات و اوصاف کے ساتھ کبھی ان کو اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا تھا، اور کوئی فخریہ کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا، ان کے ساتھی یحییٰ بن معین کہتے ہیں:۔

ما رأیت مثل احمد بن حنبل صحبتہ

میں نے احمد جیسا آدمی نہیں دیکھا میں پچاس برس

خمین سنہ ما افتخر علینا شیئاً ما کان

ان کے ساتھ رہا، انھوں نے کبھی ہمارے سامنے

فیہ من الصلاح والخیر

اپنی صلاح و خیر پر فخر نہیں کیا۔

ان کی تواضع اور اتھنائے حال کا یہ حال تھا کہ اگرچہ وہ عالی نسب عرب تھے اور یہ اس دور میں بڑا سرمایہ فخر تھا، لیکن اس کا تذکرہ بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے، علامہ ذہبی ان کے ایک معاصر عام ابوالنعمان سے

نقل کرتے ہیں کہ احمد بن حنبل نے میرے پاس اپنا خرچ رکھا دیا تھا اور اس سے بقدر ضرورت وہ لیتے رہتے تھے،

ایک دن میں نے ان سے کہا کہ ابو عبد اللہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عرب میں انھوں نے جواب دیا: یا ابا النعمان فمخیم ما کین (ابو نعمان ہمارا کیا ہم غریب لوگ ہیں؟ ہمیں ان سے بہت پوچھنا رہا، مگر انھوں نے مال دیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

باوجود اس کے کہ فتنہ اطلق قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں ان کا چرچا تھا اور

ہر طرف ان کی تعریف اور ان کے لئے دعا کا غلغلہ بلند تھا، وہ برابر خائف رہتے تھے اور ان کو اپنی طرف سے

اطمینان نہیں تھا، مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ کے لئے بڑی کثرت سے دعا ہوتی ہے،

فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہ میں استدراج نہ ہو، کیوں تم نے یہ کیسے کہا؟ میں نے کہا کہ طرسوس سے ایک شخص آیا ہے وہ کہتا

ہے کہ ہم ملک دم میں جہاد کر رہے تھے رات کے سناٹے میں احمد کے لئے دعا کا شور مچا، اور کہنے والے نے کہا کہ احمد

کے لئے دعا کرو، اہم امام احمد کی طرف سے نیت کر کے منجیق بھی چلاتے تھے اور ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دشمن کا

ایک شخص قلعہ کی دیوار پر کھڑا ہوا تھا اور سپر کو بالکل آڑ بنا لے ہوئے تھا، اہم نے احمد کی نیت کر کے منجیق چلائی،

اس کا سپر اور سپر اڑ گئی، اہم نے احمد کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، اور فرمایا خدا کرے یہ استدراج نہ ہو۔

بعض مرتبہ ان کو دیکھنے کے لئے غیر مسلم بھی دوردور سے آتے، ایک مرتبہ ایک عیسائی طبیب علاج کے لئے

آیا، اس نے کہا کہ میں کئی سال سے آپ کی زیارت کا آرزو مند تھا، آپ کی زندگی صرف اسلام ہی کے لئے خیر و برکت

کا باعث نہیں، ساری مخلوق کے لئے وہ خیر و برکت ہے، ہمارے سب دوست آپ سے بہت خوش ہیں، مروزی کہتے ہیں کہ

جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ ساری دنیا سے اسلام میں آپ کے لئے دعا ہوتی ہوگی، انھوں نے

فرمایا کہ بھائی انسان پر اپنی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو کوئی کچھ کہے، اس کو دھوکہ نہیں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تواضع اور سکنت کے ساتھ ان کو عرب و وقار بھی اتنا بخشا تھا کہ اہل حکومت اور

فوجی اور سپاہی بھی ان سے مرعوب ہو جاتے تھے، اور ان کا احترام کرنے پر مجبور تھے، ان کے ایک مباحثہ کہتے ہیں کہ

لہذا خدا کی طرف سے ذہیل اور کسی غیر مقبول اور فاسد العقیدہ آدمی کی کرامت اور وجاہت کا ظہور اللہ تعالیٰ نے احمد (ذی) ص ۲۲-۲۱

میں اسحاق بن ابراہیم (نائب بغداد) اور فلان فلان حکام کے پاس گیا ہوں، لیکن میں نے احمد بن حنبل سے زیادہ باعرب کسی کو نہیں دیکھا میں ان سے ایک مسئلہ میں گفتگو کرنے گیا مجھ پر ان کی نسبت سے لرزہ طاری ہو گیا ان کے زمانہ کے تمام اہل قلوب اور اہل خلوص ان کی عظمت کے قائل اور ان کا ادب کرتے تھے، علماء وقت اور ائمہ فن ان کے تبحر و وسعت علم کے معترف اور اس سے متعجب ہیں، مشہور محدث ابراہیم اکبری کہتے ہیں:-

رأيت احمد بن حنبل فرأيت كان الله

میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

جمع له علم الاولين والآخرين من كل

اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے میں اگلوں پھلوں کا ہر قسم کا علم

منف يقول ما شاء ويسد

جمع کر دیا ہے جس کا چاہتے ہیں اظہار کرتے ہیں اور جس کو

ما شاء۔ چاہتے ہیں اپنے سینے میں رکھتے ہیں۔

امام احمد کا زہد ضرب المثل تھا، مامون، معتمد اور والفق کا دوران کے لئے اس حیثیت سے آزمائش کا تھا کہ وہ تینوں ان کے درپے آزار تھے، متوکل کا دوران اس لئے آزمائش کا تھا کہ وہ ان کا عقیدت مند اور نہایت قدر دان تھا، ان کو اس دور کی آزمائش زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی اور اس سے ہمیشہ خائف رہتے تھے، کبھی کبھی فرماتے تھے کہ ان لوگوں کی ایذا و تعذیب کے باوجود میرا دین سلامت رہا، اب اس بڑھاپے میں اس دوسری آزمائش میں مبتلا ہوں، لیکن جس طرح معتمد کے تازیانے ان کے اعتصام بالسنۃ اور استقامت میں فرق نہ پیدا کر سکے، اسی طرح متوکل کی عقیدت مندی ان کے استثناء و توکل میں تغیر نہ پیدا کر سکی، ایک مرتبہ متوکل نے ایک ایسی بھاری تھیلی بھیجی جو خچر پر رکھ کر لائی گئی تھی، انھوں نے صاف کہہ دیا کہ مجھے حاجت نہیں، لانے والے نے کہا کہ آپ کو واپس کرنا مناسب نہیں، بڑی مشکل سے خلیفہ کا دل صاف ہوا ہے، اس کو پھر بدگمانی ہو جائے گی، انھوں نے ایک جگہ ڈلوادی، آدھی رات کو انھوں نے اپنے چچا کو بلایا، اور کہا کہ مجھے اس تھیلی کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئی، میں یہ لے کر بڑا پشیمان اور پریشان ہوں، انھوں نے کہا کہ اس وقت تو آدھی رات ہے، لوگ غافل

۱۔ مناقب ابن جوزی، مناقب حافظ ذہبی، طبقات ابن اسکی۔

سورہ ہیں، صبح جیسا آپ کی سمجھ میں آئے کیجئے گا، صبح ہی انھوں نے بعض معتدا اور بعض واقف کار لوگوں

کو بلایا، اور ان لوگوں کی فہرست تیار کروائی جو صبح اور مستورا حال تھے اور مال تقسیم کرنا شروع کیا یہاں تک کہ تھیلی میں ایک درہم بھی نہیں بچا، پھر تھیلی بھی ایک مسکین کو خیرات کر دی۔

انھوں نے متوکل کے حکم و اصرار سے کچھ روز اس کی لشکر گاہ میں قیام فرمایا، اس عرصہ میں وہ شاہی مہمان تھے، روزانہ ان کے لئے پرتکلف کھانا آتا تھا، جس کی قیمت کا اندازہ ایک سو بیس درہم روزانہ ہے، انھوں نے اس کھانے کو کسی وز چھانک نہیں، وہ مسلسل روزہ رکھتے رہے، آٹھ روز انھوں نے روزہ پر روزہ رکھا یہاں تک کہ بے انتہا ضعیف ہو گئے، اگر جلدی ان کو رخصت نہ مل جاتی تو ان کی زندگی مشکل تھی، ان کے صاحبزادہ عبدالشکر کہتے ہیں کہ میرے والد لشکر گاہ میں سولہ روز رہے، انھوں نے اس عرصہ میں ایک چوتھالی ستو کھایا ہوگا، ان کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے، متوکل کے اصرار سے ان کے صاحبزادوں کے لئے شاہی رقم مقرر ہو گئی تھی، ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کے صاحبزادہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے تو ہمارے یہاں سے وہ کوئی چیز استعمال کے لئے منگوا بھی لیتے تھے لیکن جب سے شاہی رقم ہمارے گھر آنے لگی، انھوں نے پلسلہ بالکل بند کر دیا، ایک مرتبہ طبیب نے ان کے لئے ایک بھنے ہوئے کدو کا پانی تجویز کیا، لوگوں نے کہا کہ اس کو صبح (امام احمد کے صاحبزادہ) کے تنور میں پکالو، وہ ابھی گرم ہے، انھوں نے منع فرمایا، آخر میں ان کو خود اپنی احتیاط بھی کافی نہ معلوم ہوئی، صبح کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک روز فرمایا کہ صبح! میرا جی چاہتا ہے کہ تم اس عطیہ شاہی کو چھوڑ ہی دو، اس لئے کہ یہ تم کو میرے سبب سے ملتا ہے۔

۷۷ سال کی عمر ہوئی تھی کہ بیمار ہوئے، عیادت کرنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ لوگ فوج در فوج داخل ہوتے تھے اور گھر بھر جاتا تھا، جب وہ چلے جاتے تو دوسرا نمونہ آتا، سڑک آدمیوں سے بھر جاتی تھی روزہ بیمار رہے، ہجوم بڑھتا جاتا تھا، سلطان کو اطلاع ہوئی تو ان کے دروازہ پر اور گلی میں پولیس کا پہرہ لگایا

۱۰ ترجمہ الام احمد بن تاریخ الاسلام للحافظ الذہبی ص ۲۰۰ ایضاً ص ۲۰۱ ایضاً ص ۲۰۲

اور دقائح نگار متعین کر دیے کہ حالات کی اطلاع برابر ملتی رہے، ہجوم دم بہ دم بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ گلی بند کر دی گئی، لوگ سڑکوں اور مسجدوں میں بھر گئے، یہاں تک کہ بازار میں خرید و فروخت مشکل ہو گئی، پیشاب خون کا آنے لگا، طبیبے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غم اور فکر نے ان کے پیٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، جمرات کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، ان کے شاگرد مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو وضو کرایا، تو انھوں نے تکلیف کی حالت میں بھی مجھے ہدایت کی کہ انگلیوں میں خلال کراؤں، شب جمعہ میں حالت زیادہ نازک ہو گئی اور جمعہ ۱۲ ربیع الاول کو اس امام سنت نے انتقال کیا۔<sup>۱۵</sup>

## فتنہ خلق قرآن

مامون نے خلق قرآن کے مسئلہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی،<sup>۲۱۸ھ</sup> میں اس نے واپی بغداد اسحق بن ابراہیم کے نام ایک مفصل فرمان بھیجا جس میں عامر مسلمین اور بالخصوص محدثین کی سخت مذمت اور حقارت آمیز تنقید کی، ان کو خلق قرآن کے عقیدہ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے توحید میں ناقص، مردود الشہادۃ، ساقط الاعتبار اور شرار امت قرار دیا، اور حاکم کو حکم دیا کہ جو لوگ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوں، ان کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے اور خلیفہ کو اس کی اطلاع کی جائے۔<sup>۱۶</sup>

یہ فرمان مامون کی وفات سے چار مہینے قبل کا ہے، اس کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں کو بھیجی گئیں اور صوبہ داروں (گورنروں) کو ہدایت کی گئی کہ اپنے اپنے صوبوں کے قضاة کا اس مسئلہ میں امتحان لیں، اور جو اس عقیدہ سے متفق نہ ہو اس کو اس کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔

اس فرمان کے بعد مامون نے حاکم بغداد کو لکھا کہ سات بڑے محدثین کو (جو اس عقیدہ کے مخالفین کے

۱۵ ذہبی ص ۱۰۰ ۱۶ بخاری تاریخ کبیرہ ص ۱۰۰ ۱۷ جنازہ و کفن کی تفصیل آگے آئے گی۔

۱۸ اس خط کا مکمل مضمون تاریخ طبری اور طیفور کی تاریخ بغداد میں موجود ہے۔

سرگروہ میں اس کے پاس بھیج دیا جائے وہ سب آئے تو مامون نے ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا، ان سب نے اس سے اتفاق کیا، اور ان کو بغداد واپس کر دیا گیا، جہاں انھوں نے علماء و محدثین کے ایک مجمع کے سامنے اپنے اس عقیدہ کا اقرار کیا، لیکن شورش ختم نہیں ہوئی، اور عام مسلمان اور تقریباً تمام محدثین اپنے خیال پر قائم رہے۔ انتقال سے پہلے مامون نے اسحق بن ابراہیم کو تیسرا فرمان بھیجا جس میں ذرا تفصیل سے پہلے خط کے مضمون کو بیان کیا تھا، اور امتحان کے دائرہ کو وسیع کر کے اہلکاران سلطنت اور اہل علم کو بھی اس میں شامل کر دیا تھا، اور سب کے لئے اس عقیدہ کو ضروری قرار دیا تھا، اسحق نے فرمان شاہی کی تعمیل کی، اور شاہی علماء کو جمع کر کے ان سے گفتگو کی، اور ان کے جوابات اور مکالمہ کو بادشاہ کے پاس لکھ کر بھیج دیا، مامون اس محضر کو پڑھ کر سخت برا فرودختہ ہوا، ان علماء میں سے دو (بشر بن الولید اور ابراہیم ابن المہدی) کے قتل کا حکم دیا، اور لکھا کہ بقیہ میں سے جس کو اپنی رائے پر اصرار ہو، اس کو پابجولاں اس کے پاس بھیج دیا جائے چنانچہ بقیہ تیس علماء میں سے (جو پہلے قائل نہیں ہوئے تھے) چار اپنی رائے (عدم خلق قرآن) پر قائم رہے، یہ چار اشخاص امام احمد ابن حنبل، سجادہ، تواریری، اور محمد بن نوح تھے، دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن تواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کیا، اور صرف امام اور محمد بن نوح باقی رہے جن کو مامون کے پاس طوس، ستھکڑیوں اور بیڑیوں میں روانہ کر دیا گیا، ان کے ہمراہ انیس دوسرے مقامات کے علماء تھے، جو خلق قرآن کے منکر اور اس کے غیر مخلوق ہونے کے قائل تھے، ابھی یہ لوگ رتہ ہی پہنچے تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر ملی، اور ان کو حاکم بغداد کے پاس بغداد واپس کر دیا گیا، راستہ میں محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، اور امام اور ان کے رفقاء بغداد پہنچے۔

مامون نے اپنے جانشین معتمد بن الرشید کو وصیت کی تھی کہ وہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک و عقیدہ پر قائم رہے، اور اسی کی پالیسی پر عمل کرے (وحدی بصرۃ اخیک فی القرآن) اور قاضی ابن ابی دواد کو دستور اپنا مشیر اور وزیر بنا لے رہے چنانچہ معتمد نے ان دونوں وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔



## امام احمد اتبلا، و امتحان میں

اب سلاصلیٰ قرآن کی مخالفت اور عقیدہ صحیحہ کی حمایت اور حکومت وقت کے مقابلہ کی ذمہ داری  
 تنہا امام احمد بن حنبل کے اوپر تھی جو گروہ محدثین کے امام اور سنت و شریعت کے اس وقت امین تھے۔  
 امام احمد کو رقبہ سے بغداد لایا گیا، چار چار بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی تھیں تین دن تک ان سے اس  
 سلسلہ پر مناظرہ کیا گیا، لیکن وہ اپنے اس عقیدہ سے نہیں ہٹے چوتھے دن والی بغداد کے پاس ان کو لایا گیا، اس نے  
 کہا کہ احمد تم کو اپنی زندگی ایسی دو بھر ہے، خلیفہ تم کو اپنی تلوار سے قتل نہیں کرے گا، لیکن اس نے قسم کھائی ہے کہ  
 اگر تم نے اس کی بات قبول نہ کی تو مار پر مار پڑے گی اور تم کو ایسی جگہ ڈال دیا جائے گا جہاں کبھی سورج نہیں آئے گا  
 اس کے بعد امام کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا، اور ان کو اس انکار و اصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے، ایک تازہ جلاد  
 صرف دو کوڑے لگانا تھا، پھر دوسرا جلاد بلایا جاتا تھا، امام احمد ہر کوڑے پر فرماتے تھے:-

اعطونی شیئاً من کتاب اللہ اوستة  
 میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی  
 رسالہ حتی اقول بہ  
 سنت سے کچھ پیش کرو تو میں اس کو مان لوں۔

## واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے

امام احمد نے اس واقعہ کو خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:-  
 ”میں جب اس مقام پر پہنچا جس کا نام باب البستان ہے تو میرے لئے سواری لائی گئی، اور مجھ کو  
 سوار ہونے کا حکم دیا گیا، مجھے اس وقت کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا، اور میرے پاؤں میں بوجھل بیڑیاں  
 تھیں، سوار ہونے کی کوشش میں کئی مرتبہ اپنے منہ کے بل گرنے لگا، پچا، آنسو کسی نہ کسی طرح سوار ہوا اور  
 معتصم کے محل میں پہنچا، مجھے ایک کوٹھری میں داخل کر دیا گیا، اور دروازہ بند کر دیا گیا، آدمی رات کا

وقت تھا، اور وہاں کوئی چراغ نہیں تھا، میں نے نماز کے لئے مسح کرنا چاہا، اور ہاتھ بڑھایا تو پانی کا ایک پیالہ اور طشت رکھا ہوا ملا، میں نے وضو کیا، اور نماز پڑھی، اگلے دن معصم کا ناصدا آیا اور مجھے خلیفہ کے دربار میں لے گیا، معصم بیٹھا ہوا تھا، قاضی القضاة ابن ابی ذؤاد بھی موجود تھا، اور ان کے ہم خیالوں کی ایک بڑی جمعیت تھی، ابو عبد الرحمن الشافعی بھی موجود تھے، اسی وقت دو آدمیوں کی گردنیں بھی اڑائی جا چکی تھیں، میں نے ابو عبد الرحمن الشافعی سے کہا کہ تم کو امام شافعی سے مسح کے بارے میں کچھ یاد ہے؟ ابن ابی ذؤاد نے کہا کہ اس شخص کو دکھیو کہ اس کی گردن اڑائی جانے والی ہے، اور یہ فقہ کی تحقیق کر رہا ہے، معصم نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ، وہ برابر مجھے پاس بلا تا رہا، یہاں تک کہ میں اس سے بہت قریب ہو گیا، اس نے کہا بیٹھ جاؤ، میں بیٹریوں سے تھک گیا تھا، اور بوجھل ہو رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا کہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے، خلیفہ نے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول نے کس چیز کی طرت دعوت دی ہے؟ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی شہادت کی طرت میں نے کہا تو میں اس کی شہادت دیتا ہوں، پھر میں نے کہا کہ آپ کے جدا مجد ابن عباس کی روایت ہے کہ جب قبیلہ بنو القیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ایمان کے بارے میں آپ سے سوال کیا، فرمایا تمہیں معلوم ہے کہ ایمان کیا ہے، انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، اور مالِ غنیمت میں سے پانچویں حصہ کا نکلانا، اس پر معصم نے کہا کہ اگر تم میرے پیش رو کے ہاتھ میں پیلے نہ آگئے ہوتے تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، پھر عبد الرحمن بن اسحاق کی طرت مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ اس آزمائش کو ختم کرو، امام احمد کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ اکبر اس میں تو مسلمانوں کے لئے کشائش ہے، خلیفہ نے علماء حاضرین سے کہا کہ ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، پھر عبد الرحمن سے کہا کہ ان سے گفتگو کرو (یہاں امام احمد اس مناظرہ کی تفصیل بیان

کرتے ہیں) :-

ایک آدمی بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، دوسرا بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، معتصم کہتا، احمد! تم پر خدا رحم کرے، تم کیا کہتے ہو، میں کہتا امیر المؤمنین! مجھے کتاب الشریا سنت رسول میں سے کچھ دکھائیے تو میں اس کا قائل ہو جاؤں، معتصم کہتا کہ اگر یہ میری بات قبول کر لیں تو میں اپنے ہاتھ سے ان کو آزاد کر دوں، اور اپنے فوج و لشکر کے ساتھ ان کے پاس جاؤں اور ان کے آستانہ پر حاضر ہوں، پھر کہتا احمد! میں تم پر بہت شفیق ہوں اور مجھے تمہارا ایسا ہی خیال ہے، جیسے اپنے بیٹے ہارون کا، تم کیا کہتے ہو، میں وہی جواب دیتا کہ مجھے کتاب الشریا سنت رسول میں سے کچھ دکھاؤ تو میں قائل ہوں، جب بہت دیر ہو گئی تو وہ اٹا گیا اور کہا جاؤ، اور مجھے قید کر دیا اور میں اپنی پہلی جگہ پر واپس کر دیا گیا، اگلے دن پھر مجھے طلب کیا گیا، اور مناظرہ ہوتا رہا اور میں سب کا جواب دیتا رہا یہاں تک کہ زوال کا وقت ہو گیا، جب اٹا گیا تو کہا کہ ان کو لیجاؤ، تیسری رات کو میں سمجھا کہ کل کچھ ہو کر رہے گا، میں نے ڈوری منگوائی اور اس سے اپنی بیڑیوں کو کس لیا اور جس ازار بند سے میں نے بیڑیاں باندھ رکھی تھیں، اس کو اپنے پانچامہ میں پھر ڈال لیا کہ کہیں کوئی سخت وقت آئے اور میں برہنہ ہو جاؤں، تیسرے روز مجھے پھر طلب کیا گیا، میں نے دربار بھرا ہوا ہے، میں مختلف ڈیوڑھیاں اور مقامات طے کرتا ہوا آگے بڑھا، کچھ لوگ تلواریں لئے کھڑے تھے، کچھ لوگ کوڑے لئے، اگلے دونوں دن کے بہت سے لوگ آج نہیں تھے، جب میں معتصم کے پاس پہنچا تو کہا بیٹھ جاؤ پھر کہا ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، لوگ مناظرہ کرنے لگے، میں ایک کا جواب دیتا، پھر دوسرے کا جواب دیتا، میری آواز سب پر غالب تھی، جب دیر ہو گئی تو مجھے الگ کر دیا اور ان کے ساتھ نخلیہ میں کچھ بات کہی، پھر ان کو ہٹا دیا، اور مجھے بلایا، پھر کہا احمد! تم پر خدا رحم کرے، میری بات ان لوگوں میں تم کو اپنے ہاتھ سے رہا کروں گا، میں نے پہلا سا جواب دیا، اس پر اس نے برہم ہو کر کہا کہ ان کو پکڑو اور

۱۰ معتصم امام احمد کے معاملہ میں نرم پڑ گیا تھا، مگر احمد بن ذواد برابر اس کو گرم کرتا رہا، اور عزت دلاتا رہا کہ لوگ کہیں گے کہ معتصم اپنے بھائی مامون کے مسلک سے بہت گیا۔

کھینچو، اور ان کے ہاتھ اکھیڑ دو، منقسم کر سی پر بیٹھ گیا، اور جلا دوں اور تازیانہ لگالے والوں کو بلا یا، جلا دوں سے کہا آگے بڑھو، ایک آدمی آگے بڑھا اور مجھے دو کوڑے لگاتا، منقسم کہتا زور سے کوڑے لگاؤ، پھر وہ ہٹ جاتا، اور دوسرا آتا اور دو کوڑے لگاتا، انیس کوڑوں کے بعد پھر منقسم میرے پاس آیا، اور کہا کیوں احمد اپنی جان کے پیچھے بڑے ہو، بعد مجھے تمہارا بہت خیال ہے، ایک شخص عجمت مجھے اپنی تلوار کے دستے سے چھڑتا، اور کہتا کہ تم ان سب پر غالب آنا چاہتے ہو، دوسرا کتا کہ اللہ کے بندے! خلیفہ تمہارے سر پر کھڑا ہوا ہے، کوئی کتا کہ امیر المؤمنین آپ روزے سے ہیں، اور آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، منقسم پھر مجھ سے بات کرتا، اور میں اس کو وہی جواب دیتا، وہ پھر جلا دوں کو حکم دیتا کہ پوری قوت سے کوڑے لگاؤ، امام کہتے ہیں کہ پھر اس اشار میں میرے حواس جاتے رہے، جی میں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ سڑیاں کھول دی گئی ہیں، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم نے تم کو اوندھے منہ گرا دیا، تم کو روندنا، احمد کہتے ہیں کہ مجھ کو کچھ احساس نہیں ہوا!

## بے نظیر عزیمت و انتقامت

اس کے بعد احمد بن حنبل کو گھر پہنچا دیا گیا، جب سے وہ گرفتار کئے گئے، رہائی کے وقت تک ٹھائیس مہینے ان کو جلس میں گزارے، ان کو ۳۳-۳۴ کوڑے لگائے گئے، ابراہیم ابن مصعب جو پابھیوں میں سے تھے کہتے ہیں کہ میں نے احمد سے زیادہ جبری اور دلیر نہیں دیکھا، ان کی نگاہ میں ہم لوگوں کی حقیقت بالکل کھلی کی سی تھی۔ محمد بن اسمعیل کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر پڑتا تو چیخ مار کر بھاگتا، ایک صاحب جو واقعہ کے وقت موجود تھے، بیان کرتے ہیں کہ امام روزے سے تھے، میں نے کہا بھی کہ آپ روزے سے ہیں، اور آپ کو اپنی جان بچانے کے لئے اس عقیدہ کا اقرار کر لینے کی گنجائش

۱۰ تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الام احمد ص ۴۱-۴۹ باختصار و تلخیص۔

ہے لیکن انہوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا، ایک مرتبہ پیاس کی بہت شدت ہوئی تو پانی طلب کیا آپ کے سامنے برف کے پانی کا پیالہ پیش کیا گیا، آپ نے اس کو ہاتھ میں لیا، اور کچھ دیر اس کو دیکھا، پھر بغیر پیے واپس کر دیا۔

صاحبزادہ کہتے ہیں کہ انتقال کے وقت میرے والد کے جسم پر ضرب کے نشان تھے، ابوالعباس الرقی کہتے ہیں کہ احمد جب رقبہ میں محبوس تھے تو لوگوں نے ان کو سمجھانا چاہا، اور اپنے بچاؤ کرنے کی حدیثیں سنائیں انہوں نے فرمایا کہ خباب کی حدیث کا کیا جواب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پہلے بعض بعض لوگ ایسے تھے جن کے سر پر آرا رکھ کر چلا دیا جاتا تھا، پھر کبھی وہ اپنے دین سے ہٹنے نہیں تھے۔

یہ سن کر لوگ ناامید ہو گئے اور سمجھ گئے کہ وہ اپنے مسلک سے نہیں ہٹیں گے اور سب کچھ برداشت کریں گے

## امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ

امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اور مسلمان ایک بڑے دینی خطرہ سے محفوظ ہو گئے، جن لوگوں نے اس دینی ابتلا میں حکومت وقت کا ساتھ دیا تھا، اور موقع پرستی اور مصلحت شناسی سے کام لیا تھا، وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر گئے، اور ان کا دینی و علمی اعتبار جاتا رہا، اس کے بالمقابل امام احمد کی شان دو بالا ہو گئی، ان کی محبت اہل سنت اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا شعار اور علامت بن گئی، ان کے ایک معاصر قنیبیہ کا مقولہ ہے کہ:۔

اذا ساءت الرجل يحب احمد بن

جب تم کسی کو دیکھو کہ اس کو احمد بن حنبل سے

حبل فاعلم انہ صاحب سنت

محبت ہے تو سمجھ لو کہ وہ سنت کا نتیجہ ہے۔

۱۔ تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الامام احمد ص ۴۹-۵۰ باختصار و تلخیص۔

۲۔ ایضاً ص ۱۱۱

ایک دوسرے عالم احمد بن ابراہیم الدورقی کا قول ہے۔

من معتمودینہ کرا احمد بن حنبل جس کو تم احمد بن حنبل کا ذکر برائی سے کرتے سنا

بسور فاتحہ صولہ علی کلا سلام۔ اس کے اسلام کو مشکوک نظر سے دیکھو۔

امام احمد حدیث میں امام وقت تھے، سند کی ترتیب و تالیف ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے وہ مجتہد فی المذہب اور امام مستقل ہیں، وہ بڑے زاہد و عابد تھے، یہ سب فضیلتیں اپنی جگہ پر مسلم ہیں لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت امامت کا اصل راز ان کی عزیمت اور استقامت اس فتنہ عالم آشوب میں دین کی حفاظت اور اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہی کا تنہا مقابلہ تھا یہی ان کی قبول عام اور بقائے دوام کا اصل سبب ہے۔

آوازہ رخیل ز تعمیر کعبہ نیست  
مشہور شد رازاں کہ در آتش نکوشت

ان کے معاصرین نے جنھوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی، ان کے اس کارنامہ کی عظمت کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے، اور اس کو دین کی بروقت حفاظت اور مقام صدیقیت سے تعبیر کیا ہے، ان کے ہم عصر اور ہم استاد مشہور محدث وقت علی بن الدینی (جو امام بخاری کے مایہ ناز استاد ہیں) کا ارشاد ہے:-

ان الله اعز هذا الدين برجلين

لیس لہما ثالث، ابو بکر و الصدیق

یوم الردۃ و احمد بن حنبل یوم الخیر

اور فتنہ خلق قرآن کے سلسلے میں احمد بن حنبل۔

اور درس کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پورا بھاری رہتا، اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے، اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سلمیٰ ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسن تقریر حاضر جوابی اور علمی موثرگانی سے متاثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری، اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی تھی، خود محدثین اور ان کے تلامذہ کے گروہ میں بہت سے لوگ احساس کہتری کا شکار تھے اور معتزلہ کی عقلیت اور تفسیر سے مرعوب ہو رہے تھے یہ صورت حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لئے سخت خطرناک تھی، قرآن مجید کی تفسیر اور عقائد اسلام، ان فلسفی نما مناظرین کے لئے بازیچہ اطفال بنے جا رہے تھے مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی، یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی اور اصطلاحات کی معرکہ آرائی اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے تو محدثین و خاندان کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا، نہ عابدوں و زاہدوں کا زہد و عبادت، اور نہ فقہاء کے فتاویٰ اور جزئیات و مسائل پر ان کا عبور و استحضار۔

## سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت

اس کے لئے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں جو عقلیت کے کوچہ سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نورد رہ چکا ہو جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت و فلسفہ کے علمبراز مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں، اور ایسے لپٹ و حقیر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیو قامت انسان کے سامنے پستہ قد انسان اور نو عمر بچے اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امام سنت کی ضرورت تھی اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔

## امام ابوالحسن اشعری

ابوالحسن علی نام، والد کا نام اسمعیل تھا، مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اولاد میں تھے، ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ نے ان کے والد اسمعیل کے انتقال کے بعد ابو علی اجمالیٰ سے نکاح کر لیا تھا جو اپنے وقت میں معتزلہ کے امام اور مذہب اعتزال کے علمبردار تھے، شیخ ابوالحسن نے ان کی آنکھوں میں تربیت پائی اور بہت جلد ان کے معتد اور دست راست بن گئے، ابو علی اجمالیٰ اچھے مدرس اور مصنف تھے، مباحثہ پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے تھے ابوالحسن اشعری شروع سے زبان آور حاضر جواب تھے، ابو علی بحث و مناظرہ کے موقع پر انہی کو آگے کر دیتے تھے، بہت جلد وہ مرحلقہ اور مجالس بحث کے صدر نشین بن گئے، تمام ظاہری قیاسات و قرآن بتلانے تھے کہ وہ اپنے مربی اور استاد کے جانشین ہوں گے اور مذہب اعتزال کی حمایت و اشاعت میں شاید ان سے بھی آگے بڑھ جائیں، لیکن الشرحلے کے انتظامات عجیب ہیں، اس نے سنت کی حفاظت و نصرت کے لئے اس شخص کو انتخاب کیا، جس نے ساری زندگی مذہب اعتزال کی حمایت و اثبات میں گزار دی تھی، اور جس کے لئے اعتزال کی سند امامت تیار تھی شیخ ابوالحسن کی طبیعت میں اعتزال کا رد عمل پیدا ہوا، ان کی طبیعت معتزلہ کی تاویلوں اور قیاس آرائیوں سے متنفر ہونے لگی، اور ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب ذہانت کی باتیں ہیں اور اپنے مذہب کی پچ ہے، حقیقت کچھ اور ہے، اور وہ وہی ہے، جو صحابہ کرام اور سلف کا مسلک ہے، بالآخر عقل کو اسی آستانہ پر جھکنا پڑتا ہے، چالیس برس تک معتزلہ کے مذہب اور اعتقادات کی حمایت اور ان کو ثابت کرنے کے بعد ان کی طبیعت اس سے بالکل پھر گئی اور ان کے ذہن میں اس کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی، پندرہ دن وہ گھر سے نہیں نکلے ہوئے وہیں دن وہ گھر سے سیدھے جامع مسجد پہنچے، جمعہ کا دن تھا، اور جامع مسجد



بھری ہوئی تھی انھوں نے منبر پر چڑھ کر بلند آواز سے اعلان کیا "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا ہے اس کو بتلاتا ہوں کہ میں ابوالحسن اشعری ہوں، میں معتزلی تھا، فلاں فلاں عقیدوں کا قائل تھا، اب توبہ کرتا ہوں اپنے سابق خیالات سے باز آتا ہوں، آج سے میرا کام معتزلہ کی تردید اور ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کا اظہار ہے، وہ دن اور ان کی زندگی کا اخیر دن ان کی ذہانت، علمی تبحر، قوتِ گویائی اور استدلال، تحریر، اعتزال کی تردید اور سلف کے مسلک اور اہل سنت کے عقائد کی تائید اور اثبات میں صرف ہوئی، جو کل تک معتزلہ کی زبان اور ان کا سب سے بڑا دلیل تھا، وہ اہل سنت کا ترجمان اور ان کا سب سے بڑا حامی بن گیا۔"

### امام ابوالحسن اشعری کا جذبہ تبلیغ و احقاقِ حق

وہ اس فرض کو تقرب الی اللہ اور جہاد و دعوتِ سمجھ کر انجام دیتے تھے اور خود معتزلہ کی مجلسوں میں جا کر اور ان کے ممتاز لوگوں سے مل کر ان کو مطمئن کرنے اور حق کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتے تھے، کسی نے ان کا کہا کہ آپ اہل بدعت سے کیوں ملتے جلتے ہیں، اور غذکیوں ان کے پاس چل کر جاتے ہیں، حالانکہ ان کے مقاطعہ کا حکم ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کیا کروں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں، ان میں سے کوئی حاکم شہر ہے، کوئی قاضی ہے، وہ اپنے عہدہ اور وجاہت کی وجہ سے میرے پاس آنے سے رہے، اب اگر میں بھی ان کے پاس نہ گیا تو حق کیسے ظاہر ہوگا، اور ان کو کیسے معلوم ہوگا کہ اہل سنت کا بھی کوئی مددگار اور دلائل سے ان کے مذہب کو ثابت کرنے والا ہے؟

### ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات

امام ابوالحسن کو مناظرہ اور بحث و استدلال کا پہلے سے ملکہ تھا، اور یہ ان کا فطری ذوق اور خداداد

صلاحیت تھی، مذہب حق کی حمایت کے جذبہ اور تائید الہی نے ان کی ان قوتوں اور صلاحیتوں کو اور جلا دی۔ وہ اپنے زمانہ کی عقلی سطح سے بلند تھے، اور عقلیات و علم و کلام میں مجتہدانہ دماغ رکھتے تھے، معتزلہ کے سوالات و اعتراضات کا جواب وہ اس آسانی سے دیتے تھے، جیسے کوئی کہنہ مشق استاد اور ماہر فن، مبتدی طالب علموں کے سوالات کا جواب دیتا ہے، اور ان کو خاموش کر دیتا ہے، ان کے ایک شاگرد ابو عبد اللہ بن خلیفہ اپنی پہلی ملاقات اور ایک مجلس کی کیفیت بیان کرتے ہیں :-

”میں شیراز سے بصرہ آیا، مجھے ابو الحسن اشعری کی زیارت کا شوق تھا، لوگوں نے مجھے ان کا پتہ دیا، میں آیا، تو وہ ایک مجلس مناظرہ میں تھے، وہاں معتزلہ کی ایک جماعت تھی، اور وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے، جب وہ خاموش ہوئے، اور انھوں نے اپنی بات پوری کر لی، تو ابو الحسن اشعری نے گفتگو شروع کی، انھوں نے ایک ایک سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے یہ کہا تھا اور اس کا جواب یہ ہے، تم نے یہ اعتراض کیا تھا، اور اس کا جواب اس طرح ہے، یہاں تک کہ انھوں نے سب کا جواب دے دیا، جب وہ مجلس سے اٹھے تو میں ان کے پیچھے پیچھے چلا، اور ان کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا، انھوں نے فرمایا کہ تم کیا دیکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کی کتنی زبانیں ہیں، کتنے کان اور کتنی آنکھیں ہیں، کہ آپ سب کی سنتے، سب کی سمجھتے، اور سب کا جواب دیتے ہیں، (وہ یہ سن کر ہنس دیے)“

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ ”آپ کی سب باتیں تو سمجھ میں آئیں، مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ آپ ابتداء خاموش کیوں رہتے ہیں، اور معتزلہ کو گفتگو کا موقع کیوں دیتے ہیں، آپ کی شان تو یہ ہے کہ آپ ہی گفتگو کریں، اور اعتراضات کو خود رفع کر دیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل و اقوال کو اپنی زبان سے ادا کرنا جائز نہیں سمجھتا، البتہ یہ جب کسی کی زبان سے نکل جائیں تو پھر ان کا جواب دینا، اور ان اقوال کی تردید اہل حق کا فرض ہو جاتا ہے“

امام ابو الحسن اشعری مجتہدین اور علم کلام کے بانی تھے، ان کے بعد تکلمین ان کی خدا داد ذہانت، ان کے کلام کی گہرائی، ان کی نکتہ رسی، اور ان کی بالغ نظری کے قائل ہیں، قاضی ابوبکر باقلانی سے جس کو ان کے معاصرین نے ان کی فصاحت و حسن تقریر و قوت تحریر کی وجہ سے "لسان الامۃ" کا خطاب دیا تھا کسی نے کہا کہ آپ کا کلام ابو الحسن اشعری کے کلام سے زیادہ بلند اور واضح معلوم ہوتا ہے، انہوں نے کہا کہ "میری ہی سعاد ہے کہ میں ابو الحسن کے کلام کو سمجھ لوں!"

علامہ ابواسحق اسفرائینی کا پایہ علم کلام و اصول فقہ میں مسلم ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیخ ابو الحسن باہلی (امام ابو الحسن اشعری کے شاگرد) کے سامنے ایسا تھا، جیسے سمندر کے اندر قطرہ اور شیخ ابو الحسن باہلی کہتے تھے کہ میری حیثیت امام ابو الحسن اشعری کے سامنے ایسی تھی جیسے سمندر کے پہلو میں ایک قطرہ۔

## ان کا مسلک اور ان کی خدمات

امام ابو الحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل و متوسط مسلک اختیار کیا، وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرما زروالی کے قائل تھے کہ وہ الہیات کے بارے میں اور با بعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف اپنا عمل کر سکے اور اس کے جزئیات و تفصیلات اور ذات و صفات باری تعالیٰ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر سکے، اور اس کو معیار قرار دیا جاسکے، نہ وہ بعض پر جوش محدثین و خابکہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلام کی حفاظت کے لئے عقل کا انکار اور اس کی تحقیر ضروری سمجھتے تھے، اور ان کلامی و اعتقادی مباحث سے جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے، احتیاط و سکوت واجب سمجھتے تھے، وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے جس سے مذہب و عقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا، ان کا اس پر عمل تھا کہ "کلموا الناس علی قدر عقولہم" اس میں

جس طرح عوام کی عقلی سطح کی رعایت ضروری ہے، اسی طرح اہل علم و عقلا کی عقلی سطح کی رعایت بھی ضروری ہے۔  
 ابو الحسن اشعری نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی کہ انھوں نے دین کے اخذ و فہم  
 میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اپنے فرقہ کے پیشواؤں کی تقلید کی، اور کتاب و سنت کو اس کا اخذ نہیں  
 بنایا، بلکہ جہاں قرآن کی آیات اور اپنے عقائد میں تعارض دیکھا، بے تکلف اس کی تاویل اور توجیہ کر لی۔  
 کتاب الابانۃ عن اصول التیانیۃ میں جو اعتزال سے علیحدگی کے بعد کی اولین تصنیفات میں سے ہے،  
 تحریر فرماتے ہیں:-

آما بعد افاق من النائغین عن الحق	حمد و صلوة کے بعد معلوم ہو کہ معتزلہ اور قدریہ فرقوں
من المعتزلة و اهل القدر مالت بهم	تے جو حق سے منحرف ہیں اپنی خواہشات کی پیروی میں
اهوانهم الى تقليد رؤسائهم و من مضى	اپنے پیشواؤں اور اپنے فرقہ کے پیش روؤں کی تقلید
من اسلافهم فتاولوا القرآن على ارائهم	کی، اور اپنی آراء کے مطابق کرنے کے لئے قرآن مجید کی
تاويل لم ينزل الله به سلطانا ولا اوضح	ایسی تاویلات کیں جن کی خدانے کوئی سند نہیں
به برهاننا ولا نقلوه عن رسول الله	اتاری نہ ان کی کوئی واضح دلیل ہے، اور نہ وہ
سب العالمين ولا عن ائمتنا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف (صحابہ و
المتقدمين	تابعین) سے منقول ہیں۔

پھر اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں:-

قولنا الذي نقول به وديانتنا التي	ہمارا عقیدہ جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا مسلک
ندين بها القسك بكتاب ربنا عز وجل	جس پر ہم قائم ہیں یہ ہے کہ قرآن مجید اور سنت
و بيئتنا نبينا عليه السلام وماروسه	رسول کو مضبوط پکڑا جائے اور صحابہ و تابعین

ابو کتاب الابانۃ عن اصول الديانۃ ص ۵، طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد۔

عن الصمابة والتابعين وإئمة الهدى  
 ونحن بذلك محتصمون وبما كان  
 يقول به ابو عبد الله احمد بن محمد  
 بن حنبل نصر الله وجهه ورفع دريقه  
 واجزل مشوبته قائلون ولما خالف  
 قوله مخالفون لانه الامام الفاضل  
 والرئيس الكامل الذي ابان الله  
 به الحق ورفع به الضلال ووضح  
 به المنهاج وقمع به بدع المبتدعين  
 وزيج الزائغين وشك الشاكين فوجته  
 الله عليه من امام مقدم وخليل  
 معظم مفخم له

اور ائمہ حدیث سے جو منقول ہے اس کو اختیار  
 کیا جائے ہم اسی مسلک پر مضبوطی سے قائم ہیں اور  
 امام احمد بن حنبل کے عقائد و مسلک کے (الشران  
 کے چہرہ کو ترم تازہ رکھے اور ان کے درجات  
 بلند فرمائے اور ان کو اجر جزیل عطا فرمائے) قائل  
 و متقدمین اور جوان کے مسلک سے علیحدہ ہے ہم  
 اس سے علیحدہ ہیں اس لئے کہ وہ ایسے امام فاضل  
 اور پیشوائے کامل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے  
 ہاتھوں حق کو واضح اور گمراہی کو زائل فرمایا اور  
 صراط مستقیم کو روشن کیا اور بتدعین کی بدعات  
 اہل زیغ کی کجروی اور اہل شک کے شکوک کا ازالہ  
 کیا اللہ تعالیٰ ایسے بلند پایہ امام اور ایسے مستحق  
 محبت و احترام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

لیکن ان کا اصلی کارنامہ اس مسلک سنت اور عقیدہ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی  
 تائید نہیں ہے یہ تو محدثین اور عام خطابہ کر رہے تھے ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و  
 سنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا اور معتزلہ اور دوسرے  
 فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے عقائد  
 اہل سنت کی صداقت اور ان کا منقول و معقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔

لہ کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ ص ۵۷

دین کی اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے عظیم اہم ایشان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ معتزلہ اور نہجرت فرقوں کے "معتوب" بنے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن وہ ان تشدد و محدثین اور جہاد مخالف کے اعتراضات کا ہدف بھی بن گئے، جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا، اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور نقلی مباحث و مسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک ذریعہ و ضلال کی بات تھی۔

امام ابو الحسن اشعری خود اس بات کے قائل و داعی ہونے کے باوجود کہ عقائد کا ماخذ اور الہیات و ابعد الطبیعیاتی مسائل کے علم کلام کا سرچشمہ کتاب و سنت اور تعلیمات نبوت ہے، نہ کہ عقل مجرد اور قیاسات یا یونانی الہیات اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ زمانہ کے اثرات سے یا دوسری قوموں اور فلسفوں کے اختلاط سے عقائد کے بارے میں جو مسائل چھڑ گئے ہیں اور ان کی بنیاد پر مستقل گروہ اور فرقے بن گئے ہیں، ان سے صرف اسی بنا پر سکوت کیا جائے کہ حدیث میں ان مسائل و مباحث اور ان الفاظ و اصطلاحات کا ذکر نہیں ہے، ان کے نزدیک اس سے سنت و شریعت کے وقار کو نقصان پہنچے گا، اور اس کو ان کی شکست اور کمزوری پر محمول کیا جائے گا، نیز فرقہ باطلہ کو جو عقلی استدلال اور فلسفہ کی اصطلاحات سے کام لے رہے ہیں، خود اہل سنت کے اندر نفوذ کرنے اور ان کے نوجوان اور ذہین عنصر کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع ملے گا، ان کے نزدیک عقائد کا ماخذ یقیناً وحی و نبوت محمدی ہے اور اس کا ذریعہ علم کتاب و سنت اور صحابہ کرام کے اقوال و روایات ہیں، اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ و فلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے متوازی ہے، لیکن وہ ان حقائق و عقائد کے ثبوت میں تائید کے لئے عقلی استدلال اور راجح الوقت الفاظ و اصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز بلکہ وقت کے تقاضے کی بنا پر ضروری اور افضل الجہاد سمجھتے ہیں، نیز وہ مباحث جن کا تعلق عقلیات و حیات سے ہے اور معتزلہ و فلاسفہ نے ان کو (خواجواہ) عقائد کی بحث کا جزو بنا دیا ہے اور اپنی ذہانت اور زبان آوری سے ان کو حق و باطل کا مبیار قرار دے دیا ہے، امام ابو الحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا درست نہیں، شریعت کے دلیل و ترجمان کو ان دائروں میں بھی ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اور عقلی وحشی حیثیت سے

ان کی نزدیک اور اہل حق کے مذہب کا اثبات فرض ہے، ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی  
 کے سکوت کی وجہ علمی نہ تھی، بلکہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں یہ مباحث اور یہ طرز استدلال پیدا نہیں ہوا تھا، لیکن  
 جس طرح زمانہ کے تغیرات اور نئے حالات نے بہت سی فقہی تفصیلات و جزئیات پیدا کر دیں اور نئے مسائل  
 کے استنباط اور اجتہاد پر مجبور کیا، اور زمانہ شناس اور مخلص فقہاء و مجتہدین نے استنباط و اجتہاد سے کام لے کر  
 نئے حوادث و مسائل کا جواب دیا، اور امت کو نئے فتنوں اور احکاد و بے عملی کے حملوں سے بچایا، اسی طرح  
 صحابہ کرام کی اہل سنت کا فرض ہے کہ عقائد و الہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا  
 ہو رہے ہیں، یا نئے اعتراضات کئے جا رہے ہیں، ان کا جواب دین اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائد حقہ کو  
 ثابت و مدلل کریں، امام ابوالحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لئے ایک مستقل رسالہ استحسان  
 المتخصی فی الکلام تصنیف کیا۔

بہر حال انہوں نے دونوں گروہوں کی رضامندی اور نارضامندی سے آنکھیں بند کر کے دین کی  
 نصرت و حمایت اور ایمان و عقیدہ کی حفاظت کے لئے جو طرز عمل ضروری سمجھا، بڑی شجاعت اور ذہانت  
 کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی، اور تقریراً و تحریراً اس میں مصروف رہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتزلہ و فلاسفہ کے  
 بڑھتے ہوئے سیلاب کو تھام لیا، اور بہت سے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جا دیا، عقائد اہل سنت اور طریقہ  
 سلف کی طرف سے پُر زور و مدلل حمایت و وکالت کرنے کی وجہ سے اہل سنت میں نیا اعتماد اور نئی زندگی  
 پیدا ہوئی، اور وہ احساس کہتری رک گیا، جو گھن کی طرح سواد امت کو کھاتا جا رہا تھا، معتزلہ بھی ان کے  
 پے در پے حملوں سے پھپھے پھٹ گئے، اور ان کو اپنی حفاظت اور اپنے مذہب کے وجود کو قائم رکھنے کی فکر لاحق  
 ہو گئی، ابوبکر بن الصیرفی کہتے ہیں کہ معتزلہ نے بہت سراٹھایا تھا، ان کے مقابلہ کے لئے اشعری نے امام  
 ابوالحسن اشعری کو پیدا کر دیا، انہوں نے معتزلہ کو اپنی ذہانت و استدلال سے بند کر دیا، ان کے اس کارنامے  
 کی وجہ سے لوگوں نے ان کو مجددین و محافظین سنت میں شمار کیا ہے، اور ابوبکر اسماعیلی جیسے بعض اہل

نے تجدید دین اور حفاظتِ شریعت کے سلسلہ میں امام احمد کے بعد ان کا نام لیا ہے۔

## ان کی تصنیفات

امام ابوالحسن اشعری نے صرف بحث و مناظرہ اور زبانی تقریر و تفہیم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عقائد باطلہ کی تردید میں جلیل القدر کتابیں تصنیف کی ہیں، انھوں نے اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کی جو ذہبی کے بیان کے مطابق تیس اجزاء میں ہے، بعض مؤلفین نے امام ابوالحسن اشعری کی تصنیفات ڈھائی سو سے تین سو تک بیان کی ہیں جن میں سے اکثر معتزکہ کے رد میں ہیں، اور بعض دوسرے مذاہب ادیان و فرقہ کی تردید میں ان میں ایک کتاب الفصول ہے، جس میں انھوں نے فلاسفہ طبا لعین (نیچری) دہریہ، ہندوؤں، یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کا رد کیا ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب ہے اور بارہ کتابوں کا مجموعہ ہے، ابن خلکان نے کتاب "اللمع" "الموجز" "ایضاح البرهان" "التبیین عن اصول الدین" "الشرح والتفہیم فی الرد علی اهل الافک والتضلیل" کا بھی ذکر کیا ہے، علوم عقلیہ و کلام کے علاوہ علوم شریعت میں بھی ان کی متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے "کتاب القیاس" "کتاب الاجتہاد" "خبر الواحد" ابن الراوندی کے انکار تو اتر کے رد میں بھی ایک مستقل تصنیف ہے، انھوں نے خود اپنی کتاب (العمد) میں ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو وہ ۳۲۰ھ تک یعنی وفات سے چار سال پہلے تصنیف کر چکے تھے، یہ گنتی میں ۶۸ کتابیں ہیں جن میں سے متعدد دس دس بارہ بارہ جلدوں میں ہیں، زندگی کے آخری چار سال کے اندر بھی انھوں نے بکثرت تصنیفات کیں "مقالات کلاسیا" (جو ان کی مشہور کتاب ہے) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف متکلم ہی نہ تھے، بلکہ علم عقائد کے ایک بلند پایہ اور محتاط مورخ بھی تھے، انھوں نے اس کتاب میں معتزلہ اور دوسرے فرقوں کے جو اقوال و مذاہب نقل کئے ہیں ان میں بڑی احتیاط و دیانت سے کام لیا ہے، اور



خود ان فرقوں کی کتابوں سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

## عبادت و تقویٰ

امام ابو الحسن محض علمی و عقلی آدمی نہ تھے، بلکہ علم و عقل میں درجہ امامت و اجتہاد کو پہنچنے کے ساتھ عبادت و تقویٰ اور اخلاق فاضلہ سے بھی آراستہ تھے، اور یہ ائمہ سلف کی عام خصوصیت ہے، احمد بن علی نقیہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو الحسن کی بیس سال خدمت کی، میں نے ان سے زیادہ متورع، محتاط، باحیا دنیاوی معاملات میں شرمیلا اور امور آخرت میں مستعد نہیں دیکھا، تکلم ابو الحسن ہر وی بیان کرتے ہیں کہ امام ابو الحسن نے برسوں عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے، ان کے خادم بندار بن الحسن کا بیان ہے کہ امام ابو الحسن صرف ایک جائداد پر گزار کرتے تھے، جو ان کے دادا بلال ابن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعری نے وقف کی تھی، اور جس کی آمدنی سترہ درہم روزانہ تھی۔

## وفات

۳۲۲ھ میں امام ابو الحسن اشعری نے انتقال کیا، اور بغداد محلہ مشرع الزواہی میں مدفون ہوئے، ان کے جنازہ پر اعلان کیا گیا کہ آج ناصر سنت کا انتقال ہو گیا۔

## امام ابو منصور ماتریدی

اسی زمانہ میں دنیا کے اسلام کے ایک دوسرے سرے اور ارا النہر میں ایک دوسرے عالم اور

۱۵ مشہور مستشرق WENSINK نے اپنی کتاب اسلامی عقیدہ MUSLIM CREED میں ۵۵ پر اور بہتر نے مقالات اسلامیین کے

مقدمہ میں اس کا بڑا اعتراف کیا ہے (الاشعری ابو الحسن) ۲ تبیین کذب المفتری ص ۱۴۱ ۳۱۵ ایضاً

۱۵۲ ایضاً ص ۱۴۲ و ابن خلکان ص ۲۶۵ بحوالہ خلیب، ۵۵ ابن خلکان ص ۲۶۲۔

مشکلم ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۲ھ) نے علم کلام اور عقائد اسلام کی طرف توجہ کی، وہ بڑے متوازن مانع کے آدمی تھے، معتزلہ سے ہر وقت برسرِ مقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابو الحسن کے علم کلام میں بعض انتہا پسندانہ باتیں آگئی تھیں، اور بعد کے اشاعرہ نے معاملہ کو اور آگے بڑھا دیا، امام ابو منصور نے خشو و زواہد اور ایسے التزامات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جز بن گئے تھے، اور ان کا ثابت کرنا، اور نباہنا مشکل تھا، خارج کر دیا، اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح و تہذیب کی، اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنا دیا، امام ابو منصور اور ان کے تابعین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا، ایسے مسائل جن میں ماتریدی نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے، ان میں چالیس سے زائد نہیں، اور ان میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے، جس طرح شافعی علماء و متکلمین عقیدہ و اصولاً اشعری ہیں، اسی طرح حنفی علماء و متکلمین بالعموم ماتریدی ہیں، امام ابو منصور بہت بڑے مصنف بھی تھے، معتزلہ روافض اور قرامطہ کی تردید میں ان کی بڑی فاضلانہ تصنیفات ہیں، ان کی کتاب "تادیلات القرآن" اپنے موضوع پر ایک جلیل القدر تصنیف ہے، جس سے ان کی غیر معمولی قابلیت علوم عقلیہ سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی ذکاوت کا اظہار ہوتا ہے۔

امام ابو الحسن اشعری نے چونکہ معتزلہ اور اعتزال کا براہ راست مقابلہ کیا تھا، اور وہ عالم اسلام کے علمی مرکز (عراق) میں تھے، جہاں معتزلہ کا بڑا زور تھا، اس لئے انھوں نے علمی حلقہ کو زیادہ متاثر کیا، اور علم کلام

لے یہ زمانہ اعتزال کے خلاف رد عمل اور نئی علم کلام و عقائد کی تدوین کا خاص دور تھا، امام ابو الحسن اشعری کے علاوہ تقریباً اسی زمانہ میں مصر میں طحاوی (م ۳۳۱ھ) اور سمرقند میں امام ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۳ھ) پیدا ہوئے، اول الذکر نے اپنے وقتوں نامور حاضرین کے مقابلہ میں علم کلام میں شہرت حاصل نہیں کی، اور امام ابو منصور ماتریدی کا مدرسہ فکر بھی اشعری مدرسہ میں ضم ہو کر رہ گیا۔ اہم عقائد ضدیہ کے تعلقات میں شیخ محمد عبدہ نے ثابت کیا ہے کہ یہ مختلف ذیہ مسائل تیس سے

زائد نہیں (ابن تیمیہ از محمد ابو زہرہ) مشکلم

کی تاریخ میں ان کا نام اور کام زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہے۔

## اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر

امام اشعری کے بعد ان کے سلسلہ اور مکتب خیال میں بڑے جلیل القدر علماء و متکلمین اور اساتذہ پیدا ہوئے جنہوں نے تمام عالم اسلام پر اپنا ذہنی تفوق اور اپنی قابلیت کا سکہ قائم کر دیا، اور ان کی وجہ سے دنیا کے اسلام کی علمی و ذہنی قیادت معززہ کے ہاتھ سے نکل کر علماء اہل سنت کے ہاتھ میں آگئی، چوتھی صدی میں قاضی ابوبکر باقلانی (م ۳۲۷ھ) اور شیخ ابواسحق اسقرائنی (م ۳۱۸ھ) بڑے نامور متکلم اور با عظمت عالم تھے، پانچویں صدی میں علامہ ابواسحق شیرازی متوفی ۳۷۶ھ اور امام اکرین ابوالعباس عبد الملک الجونی (م ۳۶۸ھ) نے اپنے علم و فضل سے دنیا پر بادشاہت کی۔

علامہ ابواسحق شیرازی مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس تھے، خلیفہ مقتدی باشر نے ان کو ملک شاہ سلجوقی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہ بغداد سے نیشاپور اس شان سے پہنچے کہ جس شہر سے گذرتے شہر کا شہران کے استقبال کے لئے رتھکل آتا، جو ش عقیدت میں یہ لوگ ان کے پاؤں کے نیچے کی مٹی اٹھا لیتے، دوکاندار اپنا سامان تجارت ان پر تیار کرتے، مٹھائیوں، پھلوں، قیمتی کپڑوں کی بارش کرتے، نیشاپور پہنچے تو پورا شہر استقبال کے لئے امنڈ آیا، امام اکرین ان کا غاشیہ اپنے کاندھوں پر رکھ کر خادم کی طرح ان کے سامنے چلتے تھے اور کہتے تھے، کہ مجھے اس بات پر فخر ہے۔

اپ اسلان سلجوقی کی سلطنت اور نظام الملک کی وزارت میں سب سے بڑی اسلامی مملکت میں امام اکرین کو سب سے بڑا دینی اعزاز حاصل تھا، وہ نیشاپور کے خطیب سلطنت کے اسلامی اوقاف کے ناظم و نگران اور مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس تھے، ابن خلکان لکھتے ہیں :-

وَبَقِيَ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَرِيبًا مِّنْ ثَلَاثِينَ سَنَةً  
 تیس سال تک وہ اس طرح رہے کہ علمی و دینی  
 غیر مزاحم و لامدافح مسلم لہ المجراب  
 میدان میں ان کا کوئی ہمسرا اور حریف نہ تھا۔  
 والمنبر والخطابة والتدريس ومجلس  
 و منبر کی وہ زینت تھے خطاب تدریس اور وعظ  
 التذکیر یوم الجمعة۔  
 و تذکیر انھیں کا منصب سمجھا جاتا تھا۔

ان کے اثر و رسوخ اور علوم مرتبت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ملک شاہ سلجوقی نے عید کے چاند کا اعلان  
 کر دیا، امام اکرمین کے نزدیک رویت ثابت نہیں تھی انھوں نے مناوی کروادی کہ ابوالمعالی (امام اکرمین  
 کی کنیت) کہتا ہے کہ کل تک ماہ رمضان ہے، جو میرے فتویٰ پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ کل بھی  
 روزہ رکھے، ملک شاہ نے باز پرس کی تو فرمایا کہ جو امور فرمان سلطانی پر موقوف ہیں ان کی اطاعت ہم پر فرض  
 ہے اور جو حکم فتویٰ سے متعلق ہے، وہ بادشاہ کو مجھ سے پوچھنا چاہئے، کیونکہ حکم شریعت علماء کا فتویٰ حکم فیہا  
 کے برابر ہے، روزہ رکھنا عید کرنا یا امور فتویٰ پر موقوف ہیں بادشاہ وقت کو ان سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ  
 بادشاہ نے اعلان کر دیا کہ میرا حکم درحقیقت غلط تھا، اور امام اکرمین کا حکم صحیح ہے۔<sup>۱۵</sup>

ان کا انتقال ہوا تو نیشاپور کے بازار بند ہو گئے، جامع مسجد کا منبر توڑ دیا گیا، ان کے شاگرد  
 جو چار سو کے قریب تھے، سب نے ردا ت قلم توڑ ڈالے، لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کرتے تھے،  
 سال بھران کا غم تازہ رہا۔<sup>۱۶</sup>

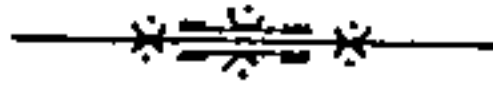
نظام الملک طوسی (کے عہد وزارت سے) جو عقیدۂ اشعری تھا، اور اپنے وقت کی سب سے  
 بڑی اسلامی (سلجوقی) سلطنت کا نفس ناطقہ تھا، اشعریت کو بڑا فروغ ہوا، اور اس کو ایک طرح  
 کی سرکاری حمایت اور تائید حاصل ہو گئی، بغداد اور نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کے قیام نے جو اشعری

۱۵ اخلاق جلالی ص ۱۱۵، ۱۱۹

۱۶ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۲۲

۱۷ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۲۳

علماء و اساتذہ کے زیر اہتمام تھے، اشعریت کو علمی وسعت و استحکام بخشنا، مدرسہ نظامیہ بغداد کی  
 عالم اسلام کا سب سے بڑا ادارہ العلوم تھا جس کو پڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اس میں پڑھانا  
 اور پڑھنا علماء و طلبہ کے لئے ایک فخر کی بات تھی، اس کے اثر سے طلبہ اور عوام کا اشعری عقائد و فکر سے  
 متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔



# علم کلام کا انحطاط فلسفہ اور باطنیت کا فروغ

اور  
ایک نئے متکلم کی ضرورت

علم کلام کا انحراف و انحطاط

اس وقت اگرچہ اشعری مکتب خیال کے علماء تمام عالم اسلام، نظام تعلیم اور مذہبی زندگی پر حاوی ہو گئے تھے، لیکن خود ان کے کلام اور ان کے اقتدار کو اندر سے گھن لگ گیا تھا، امام ابو الحسن اشعری کی طاقتور شخصیت و عقلیت اور مجتہدانہ دماغ نے معتزلہ کے سحر کو باطل کر دیا تھا، اور سنت و شریعت کا اقتدار از سر نو قائم کر دیا تھا، اس میں ان کے اصول و قواعد کو تنہا دخل نہ تھا، ان کی بلند ذہنی صلاحیتوں اور علمی ملاء استدلال و اجتہاد کو بھی دخل تھا، یہ وقار ایسی ہی طاقت و شخصیتوں اور اجتہادی قابلیتوں سے قائم رہ سکتا تھا، لیکن ان کے پیروں نے رفتہ رفتہ لکیر کے فقیر بن گئے، اور علم کلام میں بھی بجائے تجدید و اجتہاد کے نقل در نقل کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن لوگوں نے زمانہ کی تبدیلی کا احساس کیا، اور جدت سے کام لیا، انھوں نے فلسفہ کی اصطلاحات اور فلسفیانہ طرز استدلال کو علم کلام میں داخل کر لیا، جو نہ قرآن مجید کے طریق استدلال کی طرح فطری، عام فہم اور دلکش تھا، نہ ان کے دعاوی کے ثبوت کے لئے قطعی دلائل فراہم کرتا تھا، اس میں خود قبل و قال کی بڑی گنجائش تھی، اور ہر وقت اس کا خطرہ تھا کہ اس کے مقدمات کو کمزور اور مشکوک ثابت کر دیا جائے، اس طرح نہ انھوں نے اہل سنت اور مسلک سلف کی صحیح نمائندگی کی، نہ خالص فلسفہ کے

لے جیسا کہ ابن تیمیہ نے اپنی بعض تصنیفات خصوصاً الرد علی المنطقیین میں کیا۔

حلقوں میں احترام و عظمت حاصل کی۔

## فلسفہ کارواج

دوسری طرف مامون کی قدر دانی اور دیکھی اور مترجمین کی محنت اور توجہ سے سریانی، یونانی اور فارسی سے یونانی فلسفہ کی بکثرت کتابیں خصوصاً ارسطو کی تصنیفات عربی میں منتقل ہو گئی تھیں اور وہ تیز طبیعت اور خام عقولیت مسلمانوں پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں، اس ذخیرہ میں کچھ تو منطق، طبیعیات، عنصریات، ریاضیات کی کتابیں اور علوم تھے جن کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہ تھا، اور کچھ الہیات اور البعد الطبیعیات کے مباحث اور دفتر تھے، الہیات کا یہ ذخیرہ درحقیقت یونانیوں کا علم الا صنم (دیوالا) تھا، جس کو انھوں نے بڑی چالاکی سے فلسفیانہ زبان اور علمی اصطلاحات میں منتقل کر دیا تھا، یہ مفروضات اور تخیلات کا ایک طلسم تھا، جس کا نہ کوئی ثبوت تھا نہ کسی عالم میں ان کا وجود، اس میں کہیں عقول و افلاک کا شجرہ نسب، کہیں ان فرضی اور خیالی چیزوں کے افعال و حرکات کا زائچہ کھینچا گیا ہے، ایک ایسی امت کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی دولت سے سرفراز فرمایا تھا، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی ذات و صفات کے صحیح معرفت اور نوع انسان اور کائنات کی ابتدا و انتہا اور آغاز و انجام کا یقینی علم بخشا تھا، اس یونانی افسانہ اور طلسم ہوشربا کی طرف التفات کرنے اور اس کی تفصیلات و جزئیات پر وقت ضائع کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی، مگر جو لوگ یونانیوں کے منطق و طبیعیات اور ریاضیات سے مرعوب تھے، انھوں نے الہیات کے اس دفتر پارینہ کو بھی صحیفہ آسمانی کی طرح قبول کر لیا، اور اس کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ گویا ان کے پاس پیغمبر اور آسمانی کتاب کے ذریعہ کوئی علم نہیں پہنچا تھا، اور وہ جاہل قوموں کی طرح الہیات و دینیات میں بھی اسی طرح بے بصارت اور تہی دامن تھے، جیسے ریاضیات و طبیعیات میں۔

## فلسفہ یونان کے عرب ناقل و تشرح

دوسری طرف فلسفہ یونان کو یعقوب کندی (م ۲۵۸ھ) ابوالنصر فارابی (م ۳۲۹ھ) اور شیخ بوعلی ابن سینا (م ۴۲۸ھ) کے سے پرپوش وکیل حاصل ہوئے کہ خود یونان میں بھی ان کی نظیر ملتی مشکل ہے، انہوں نے ارسطو کو عصمت و تقدیس اور علم و حکمت کے ایسے مقام پر پہنچا دیا جو یونانی الہیات میں شاید بعد اول (واجب الوجود) کو بھی حاصل نہیں، یہ بھی ایک بدقسمتی تھی کہ مسلمانوں کے حصہ میں یونان کے علمی ذخیرہ میں سے زیادہ تر ارسطو کی تصنیفات و افکار آئے، جو پیچیدگیوں کی تعلیمات، اور دین کی روح و مزاج سے زیادہ اختلاف اور کم از کم مناسبت رکھتے ہیں، پھر دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ فلاسفہ عرب میں سے کوئی بھی ان کے اصل ماخذوں اور ان کی اصل زبانوں سے واقف نہیں تھا، ان کا تمام تراجم تراجم پر تھا، اور ان سے خود ان فلاسفہ کا منشا سمجھنے میں غلطیاں ہوئیں، پھر ان پر ارسطو کا ایسا علمی رعب اور اس کی شخصیت کا ایسا سحر غالب تھا کہ انہوں نے اس کے افکار و آراء پر نقد و جرح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور معقولات کو بھی معقولات بنا دیا۔

## جماعت انخوان الصفا اور اس کے رسائل

چوتھی صدی کے آخر میں تمام عالم اسلام پر فلسفہ یونان کا اثر پڑ رہا تھا، ہر ذہن و متحسس نوجوان اس کو شوق و عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، چوتھی صدی کے وسط ہی میں انخوان الصفا کے نام سے فری بیسن کے طرز کی ایک خفیہ انجمن بغداد میں قائم ہوئی، جس میں فلسفہ یونان کو معیار قرار دے کر دینی مباحث اور عقائد پر گفتگو ہوتی تھی، اور رسائل کو طے کیا جاتا تھا، اس انجمن کا منشور ان کے الفاظ میں یہ تھا:-

ان الشریعة الاسلامیة قد تجتبت  
اسلامی شریعت جہالتوں اور گمراہیوں کی آمیزش سے



بالجہالات واختلطت بالضلالت  
 ولا سبيل الى غسلها وتطهيرها الا بالفلسفة  
 لانها مادية للحكمة الاخلاقية والمصلحة  
 الاجتهادية وانه متى انتظمت الفلسفة  
 اليونانية والشريعة المحمدية فقد  
 حصل الكمال له  
 گندی ہو گئی ہے اس کو صرف فلسفہ کے ذریعہ  
 دھویا اور پاک کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ فلسفہ  
 اخقادی علوم و حکمت اور اجتہادی مصلحتوں  
 پر حاوی ہے اب صرف فلسفہ یونان اور شریعت  
 محمدی کے امتزاج سے کمال مطلوب حاصل  
 ہو سکتا ہے۔

ان کی اپنے رفقاء کو خاص ہدایت تھی کہ وہ پختہ کار اور سن رسیدہ لوگوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے نوجوانوں اور کم عمریوں کی طرف توجہ کریں اور ان کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کریں، اس لئے کہ عمر رسیدہ لوگوں میں تنگی اور جمود ہوتا ہے، جو نئی چیز کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے، نوجوان نئی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔<sup>۲۱</sup>

انہوں نے اس بحث و نظر کے نتیجہ میں ۵۲ رسالے مرتب کئے، جو ان کے فلسفہ کی نماندگی کرتے ہیں اور رسائل اخوان الصفا کے نام سے تاریخ و ادب میں شہور میں اور طبیعیات، ریاضیات، عقلیات کے مباحث پر مشتمل ہیں، معتزلہ اور ان کے ہم مذاق لوگوں نے ان رسائل کو ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ اپنی مجلسوں میں ان کو پڑھتے تھے اور جہاں جاتے تھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر وہ اندلس پہنچ گئے۔<sup>۲۲</sup>

### معتزلہ و فلاسفہ کافرق

معتزلہ سے اگرچہ دانستہ یا نادانستہ شریعت کو نقصان پہنچا تھا، اور انہوں نے عقل کی طاقت کو غیر محدود سمجھ کر ذات و صفات کے نازک و ماورا عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل کو بازیچہ اطفال بنا دیا

۱۲ تاریخ فلاسفہ اسلام فی المشرق و المغرب محمد لطفی جمیہ ص ۲۵۳ ۱۲ ایضاً ص ۲۶۱ ۱۳ تاریخ فلسفہ اسلام ص ۲۵۴

تھا، لیکن وہ اصلاً مذہبی ذہن کے لوگ تھے، وحی نبوت پر ایمان رکھتے تھے، اور عموماً متقشف، معاصی سے مجتنب و محتاط تھے، عبادت اور دینی دعوت کا ذوق رکھتے تھے، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سختی کے ساتھ پابند تھے، اور یہ سب ان کے اصول و عقائد کا اقتضا تھا، اس لئے اعتزال کے فروغ اور معتزلہ کے اقتدار سے عالم اسلام میں کفر و احماد و انکار نبوت، انکار معاد اور بے عملی اور تعطل کا رجحان پیدا نہیں ہو سکا، اور مسلمانوں کا مذہبی شعور مجروح یا کمزور نہیں ہونے پایا۔

لیکن فلاسفہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، فلسفہ نبوت کے بالکل متوازی چلتا ہے اور کہیں جا کر نہیں ملتا، وہ دین کے اصول و کلیات اور اس کے بنیادی عقائد و مسائل سے متصادم ہے، اس لئے جس قدر فلسفہ کی مقبولیت اور عظمت بڑھتی گئی، قدرتی طور پر دین کی وقعت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت کم ہوتی گئی، اور عقائد سے لے کر اخلاق و اعمال تک اس ذہنی تبدیلی سے متاثر ہوئے، مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا، جو دین کی علانیہ تحقیر کرتا، اور اسلام سے فخریہ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتا، جو لوگ تہی اخلاقی جرات نہیں رکھتے تھے، وہ ظاہری طور پر رسم و رواج کے پابند تھے، لیکن اندر سے وہ کسی معنی میں مسلمان نہیں تھے۔

## باطنیت کا فتنہ

فلسفہ کے ساتھ ساتھ اور اس کے اثر سے ایک نیا فتنہ پیدا ہوا، جو اسلام کے حق میں اور نبوت کی تعلیمات کے لئے فلسفہ سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ باطنیت کا فتنہ ہے، اس کے بانی اور داعی اکثر ان قوموں کے افراد تھے، جو اسلام کے مقابلہ میں اپنی سلطنتیں اور اقتدار کھو چکے تھے، اور ظاہری مقابلہ اور جنگ سے ان کی بازیافت کی، کوئی امید نہ تھی، یا شہوت پرست اور لذت پسند لوگ تھے، اور اسلام ان کی زندگی پر

لئے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، معنی الاسلام ج ۳، فصل اول ۱۱۵ ان کے نزدیک کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی مخلد فی النار

ہوتا ہے، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض ہے۔

حدود و قیود عائد کرتا تھا، یا شخصی اقتدار اور سرداری کے حریص تھے، ان تمام مختلف مقاصد کے لوگ باطنیت کے نشان کے نیچے جمع ہو گئے، انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام کو جنگی طاقت سے شکست نہیں دے سکتے، یہ مسلمانوں کو کفر و احماد کی کھلی ہوئی دعوت دے سکتے ہیں، اس لئے کہ اس سے ان کے مذہبی احساسات بیدار ہو جائیں گے اور مقابلہ کی قوت ابھر آئے گی، انہوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

### ظاہر و باطن کا مغالطہ

انہوں نے دیکھا کہ شریعت کے اصول و عقائد اور احکام و مسائل کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور انسانوں کے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ایسا ضروری تھا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ  
 اورتہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا مگر اپنی قوم ہی  
 لِسَانِهِمْ (سورہ ابراہیم ۴) کی زبان میں تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کر دے۔

ان الفاظ کے معنی و مفہوم متعین ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ان کی تشریح اور اپنے عمل سے ان کی تعبیر کر دی ہے، یہ معنی و مفہوم امت میں عملی و لفظی طور پر تواتر و تسلسل سے چلے آ رہے ہیں اور ساری امت ان کو جانتی اور مانتی ہے، نبوت و رسالت، ملائکہ، معاد، جنت، دوزخ، شریعت، فرض و واجب، حلال و حرام، صلاۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، یہ سب وہ الفاظ ہیں جو خاص دینی خالق کو بیان کرتے ہیں اور جس طرح یہ دینی خالق محفوظ چلے آ رہے ہیں، اسی طرح ان دینی خالق کو ادا کرنے والے یہ الفاظ بھی محفوظ چلے آ رہے ہیں، اور اب دونوں لازم ملزوم بن گئے ہیں۔

جب نبوت و رسالت، یا نبی یا صلوٰۃ یا زکوٰۃ کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے اس کی وہی حقیقت سمجھ میں آئے گی اور وہی عملی شکل سامنے آئے گی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور صحابہ کرام نے اس کو سمجھا، اس پر عمل کیا، اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، اور اسی طرح نسل بعد نسل وہ چیز امت تک

تفصل ہوتی رہی انھوں نے اپنی ذہانت سے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ و معانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے، اور اسی سے اس کی وحدت اور اپنے سرچشمہ اور اپنے ماضی سے اس کا ربط قائم ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں یا مشکوک ہو جائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے، اور اس کے سنگین قلعہ میں سیکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شکاف پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس نکتہ کو پا جانے کے بعد انھوں نے اپنا سارا زور اس تبلیغ پر صرف کیا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہوتے ہیں اور ایک حقیقی اور باطنی، اسی طرح قرآن و حدیث کے کچھ ظاہر ہیں اور کچھ حقائق ان حقائق سے ان ظواہر کو وہی نسبت ہے جو گودے اور مغز سے چھلکے اور پوست کو ہے، پہلا صرف ان ظواہر کو جانتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں پوست ہی پوست ہے، عقلا و حقائق کے عالم ہیں اور ان کے حصہ میں مغز آیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ دراصل حقائق کے رموز و اشارات ہیں ان سے وہ مراد نہیں جو عوام سمجھتے اور عمل کرتے ہیں ان سے مراد کچھ اور چیزیں ہیں جن کا علم صرف اہل اسرار کو ہے اور انھیں سے دوسروں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان حقائق تک نہیں پہنچا، اور ظواہر میں گرفتار ہے، وہ ظاہری بیڑیوں اور شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے اور نہایت نیچی سطح پر ہے، جو حقائق و رموز کی بلند سطح تک پہنچ جاتا ہے اس کا گردن یہ طوق و سلاسل اتر جاتے ہیں اور وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، یہی اس آیت کا مفہوم ہے:

وَنَصَحَ عَنْهُمْ اصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِي

(یعنی) اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دیے ہو

لہ تعطیل شریعت کا مستقل عقیدہ بھی پایا جاتا تھا، ایک باطنی امام و داعی میدانہ ادریس لکھتے ہیں:-

تَعَثَّ اللهُ مُحَمَّدَ بْنَ اِسْمَاعِيلَ وَهُوَ نَبِيٌّ نَاطِقٌ بِسَمْعِ شَرِيْعَةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (محمد بن اسماعیل کو اللہ تعالیٰ

نے نبی ناطق کی حیثیت سے مبعوث فرمایا، اور انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو منسوخ کر دیا، (عاصمۃ نفوس المہتدین)

وقاصمۃ ظهور المعتدین لسیدنا ادریس) معز لدین اللہ فاطمی سے بھی ایسے ہی اقوال منقول ہیں۔

كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف ۱۵۷) ہیں، ان پھندوں کے نکلنے کا جن میں گرفتار تھے۔

جب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا، اور حقائق و ظواہر کے اس فلسفہ کو قبول کر لیا گیا تو انہوں نے نبی و وحی نبوت، ملائکہ، آخرت اور اصطلاحات شرعیہ کی من مانی تشریح کرنی شروع کر دی جس کے بعض نادر نمونے یہ ہیں:

منہی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ صافیہ کا فیضان ہو، جبریل کسی ہستی کا نام نہیں، صرف فیضان کا نام ہے، سوار سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف واپس آجانا ہے، جنابت سے مراد افشائے راز ہے، غسل سے مراد تجدید عہد زنا سے مراد علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد میں شریک نہ ہو، طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے علاوہ ہر مذہب کے برأت، تمیم سے مراد اذون (اجازت یافتہ) سے علم کا حصول، صلوة سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوٰۃ سے مراد اہل استعداد و صفایں انصاف، علم، صیام (روزہ) سے مراد افشائے راز سے پرہیز و احتیاط، حج سے مراد اس علم کی طلب جو عقل کا قبلہ اور منزل مقصود ہے، جنت، علم باطن، جہنم، علم ظاہر، کعبہ خود نبی کی ذات ہے، باب کعبہ سے مراد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات، قرآن مجید میں طوفان نوح سے مراد علم کا طوفان ہے جس میں اہل شہادت غرق کر دیے گئے، آتش نمرود سے مراد نمرود کا غصہ ہے نہ کہ حقیقی آگ، اذبح سے مراد جس کا ابراہیم کو حکم دیا گیا تھا، بیٹے سے عہد لینا، باجوج، باجوج سے مراد اہل ظاہر ہیں، عصائے موسیٰ سے مراد ان کی دلیل اور حجت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

## نبوت محمدی کے خلاف بغاوت

الفاظ شرعی کے متواتر و متواتر معنی و مفہوم کا انکار اور قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن اور مغز و پوست کی تقسیم ایسا کامیاب حربہ تھا، جس سے اسلام کے نظام اعتقاد و نظام فکر کے خلاف سازش

کرنے والوں نے ہرزمانہ میں کام لیا، اسلام کی پوری عمارت کو اس طرح آسانی سے ڈانسٹ کیا جاسکتا تھا اور اسلام کے ظاہری نول کے اندر ریاست اندرون ریاست قائم کی جاسکتی تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں جن فرقوں نے اور منافقین کی جس جماعت نے نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت کرتی چاہی، اس نے باطنیت کے اسی حربے سے کام لیا، اور اس معنوی تو اثر و توارث کا انکار کر کے پورے نظامِ اسلامی کو مشکوک و مجروح بنا دیا، اور اپنے لئے دینی سیادت بلکہ نئی نبوت کا دروازہ کھول لیا، ایران کی بہائیت اور ہندوستان کی قادیانیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

لہ قادیانیوں نے بھی باطنیوں کی طرح الفاظ کو قائم رکھتے ہوئے ان کا نیا مفہوم بیان کیا ہے اور معنوی توارث و تواتر کا عملاً انکار کیا ہے، ختمِ نبوت، مسیح و نزولِ مسیح، معجزات، دجال وغیرہ سب الفاظ وہی ہیں مگر ان کی تشریح و تطبیق میں باطنیوں کی طرح اختراع و ایجاد سے کام لیا ہے، مرزا صاحب کی کتابیں اور مولوی محمد علی کی تفسیر اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں۔

بہائیوں نے بالکل نئی شریعت وضع کی ہے جس کے بعض دفعات یہی روزه سال میں ایک ہی ہینہ کا ہے، مگر ہینہ ۱۹ دن کا ہے، روزہ کی ابتداء صبح صادق کے بجائے طلوع آفتاب سے ہے، اس سال سے ۲۲ سال تک انسان احکامِ شرعی کا مکلف رہتا ہے، پھر پابندیاں اٹھ جاتی ہیں، وضو فرض نہیں ہے، سترتوں پر نظر جائز ہے، کوئی پردہ نہیں جس گھر میں بانی مذہب (باب) کی ولادت ہوئی ہے، اس کی نیابت واجب ہے، جماعت کی نماز صرف جنازہ میں مشروع ہے، ایمان کے بعد کوئی چیز نجس نہیں بلکہ محض مذہبِ بابی کی پیروی سے آدمی ظاہر ہو جاتا ہے، کچھ کبھی گندہ نہیں ہوتا، بلکہ جس چیز کو اس کا ہاتھ لگ جاتا ہے وہ بھی ظاہر ہو جاتی ہے، پانی ہمیشہ ظاہر و مظهر رہتا ہے، بہائیوں کا قانون میراث علیحدہ ہے (حاضر العالم الاسلامی بجا الفریخ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) موسیو ہوارٹ نے اپنے مقالہ "بہائیت" میں صحیح لکھا ہے کہ باب نے اسلام میں اصلاح کے نام سے ایک نئے دین کی تشکیل کی ہے جس کے عقائد و اصول علیحدہ ہیں اور اس کو نئی سوسائٹی اور ہیئت اجتماعیہ کے نشور کے طور پر پیش کیا ہے، یہی صورت حال قادیانیت کی ہے، دونوں جگہ ایک نئی نبوت اور ایک نئے نظامِ دینی کی تاسیس ہے، درحقیقت یہ سب باطنیت کی صدائے بازگشت ہے۔

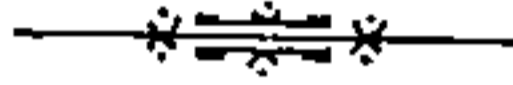
ظاہر ہے کہ ان "نکتہ آفرینیوں" کو (جن کی چند مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں) کوئی سلیم الطبع آدمی قبول نہیں کر سکتا تھا، لیکن علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام میں ایسا ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا، اور فلسفہ کے اثر سے لوگوں میں پھیلنے اور غامض مضامین کا (خواہ اس کے اندر کوئی مغز نہ ہو) ایسا مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ ایک طبقہ پر باطنیوں کا جادو چل گیا، جنہوں نے قدیم علم ہیئت، علم طبیعیات اور یونانی الہیات کے مسائل اور یونانی اصطلاحات عقل اول وغیرہ کو آزادی سے استعمال کیا تھا، اور مختلف اثرات اور مختلف اغراض سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے، کچھ جذبہ انتقام میں کچھ اسرار و رموز کے شوق میں کچھ غلط قسم کی ظاہریت اور تقشف کے رد عمل میں کچھ بوالہوسی اور نفس پرستی کی آزادی کے لالچ میں کچھ اہل بیت کے نام سے اس طرح باطنیوں نے ایسی خفیہ تنظیم قائم کر لی جس سے طاقتور اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشاں رہیں، عالم اسلام کی بعض لائق ترین اور مفید ترین ہستیاں (نظام الملک طوسی و فخر الملک وغیرہ) ان کا شکار ہوئیں، عرصہ تک کسی بڑے عالم اور مسلمان بادشاہ یا وزیر کو اس کا اطمینان نہیں تھا کہ صبح وہ صحیح سلامت اٹھے گا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اصفہان میں اگر کوئی شخص عصر تک اپنے گھر واپس نہ جاتا تو سمجھ لیا جاتا کہ وہ کسی باطنی کا شکار ہو گیا، اس بدامنی کے علاوہ انہوں نے ذہن و ادب اور علم کو بھی متاثر کرنا شروع کیا، اور دین کے اصول و نصوص اور قطعیات کی تاویل و تحریف اور عام امجاد کا دروازہ کھل گیا۔

## ایک نئی شخصیت کی ضرورت

فلسفہ اور باطنیت کے ان اسلام کش اثرات کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس کو علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں پوری بصیرت اور دہشتگاہ حاصل ہو، اور وہ تمام علوم میں مجتہدانہ نظر اور اپنا خود مقام رکھتا ہو، اپنے ذہن خداداد وجودت طبع اور وقت نظر میں فلاسفہ یونان اور بہت سے

۱۔ باطنیوں کے ہاتھ سے شہید ہونے والوں کی مفصل فہرست کے لئے ملاحظہ ہو "نظام الملک طوسی" ص ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸

قدیم ائمہ فکر سے کم نہ ہو، جو بہت سے علوم کو نئے طریقے سے مدون کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو فوراً علم اور  
 وسعت نظر کے ساتھ دولتِ یقین سے بھی مالا مال ہو، اور اس نے اپنے ذاتی تفکر، تلاش و تحقیق اور پیا  
 و عبادت سے دین کے ان ابدی حقائق پر نیا ایمان حاصل کیا ہو، اور وہ نئے اعتماد، تازہ یقین کے ساتھ  
 علی وجہ البصیرۃ دین کی پیروی اور رسول کے اقتدار کی طرف دعوت دیتا ہو، نیز عالمِ اسلامی اور علمی دنیا  
 میں اپنے علم و یقین اور فکر و نظر سے ایک نئی روح اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دے، پانچویں صدی کے  
 عین وسط میں اسلام کو ایسی شخصیت عطا ہوئی، جس کی عالمِ اسلام کو سخت ضرورت تھی، یہ شخصیت  
 امام غزالی کی تھی۔





## امام غزالیؒ

### تعلیم اور علمی عروج

امام غزالیؒ کا نام محمد کنیت ابو حامد والد کا نام بھی محمد تھا، طوس کے ضلع میں ۳۵۰ھ میں طاہران میں پیدا ہوئے، والد کی وصیت کے مطابق جو ایک مخلص علم دوست اور غریب مسلمان تھے، ان کے ایک صوفی دوست نے تعلیم کا انتظام کرنے سے معذرت کی، اور کسی مدرسہ میں داخل ہو جانے کا مشورہ دیا، چنانچہ وہ ایک مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔

امام غزالیؒ نے اپنے وطن میں شیخ احمد الراذکانی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی پھر حرجان میں امام ابو نصر اسماعیلی سے پڑھا، اس کے بعد نیشاپور جا کر امام اکرمن کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے رفقاء میں جو بہم کی تعداد میں تھے، ممتاز ہو گئے، اور اپنے نامور استاد کے نائب (معیذ) بن گئے، امام اکرمن ان کی تعریف میں فرماتے تھے کہ غزالیؒ بخز خاں ہے، امام اکرمن کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نکلے اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال کی تھی، لیکن بڑے بڑے کبیر السن علماء سے وہ زیادہ ممتاز اور باکمال سمجھے جاتے تھے۔

درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالیؒ نظام الملک کے دربار میں پہنچے، نظام الملک نے ان کی شہرت اور ممتاز قابلیت کی بنا پر بڑے اعزاز و اکرام سے دربار میں ان کو لیا، یہاں اہل کمال کا مجمع تھا، علمی مباحثے اور دینی مناظرے درباروں اور مجلسوں میں تک کہ تقریبات شادی و غمی کا ایک ضروری عنصر تھا۔

امام غزالی ان مباحث میں سب پر غالب رہتے تھے ان کی نمایاں قابلیت دیکھ کر نظام الملک نے ان کو مدرسہ نظامیہ کی صدارت کے لئے انتخاب کیا جو اس وقت ایک عالم کے لئے سب سے بڑا اعزاز اور فہمائے ترقی تھا، اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی، ۵۴۸ھ میں وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ میں درس شروع کیا، تھوڑے ہی دن میں ان کے درس حسن تقریر اور تبحر علمی کی بنا میں دھوم مچ گئی، طلبہ و علماء نے استفادہ کے لئے ہر طرف سے ہجوم کیا، ان کی مجلس درس مرجع خلافت بن گئی تین سو مہتمی طالب علم اور سو سو امر اور سارا اس میں شرکت کرتے تھے، رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی عالی دماغی، علمی فضیلت اور طاقتور شخصیت سے بغداد میں ایسا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا کہ ارکان سلطنت کے ہمسرین گئے، اور بقول ایک معاصر (شیخ عبدالغافر فارسی) کے ان کے جاہ و جلال کے سامنے امر اور وزیر اور خود بارگاہ خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑ گئی، یہاں تک کہ ۵۸۵ھ میں ان کو خلیفہ عباسی (مقتدی باشر) نے ملک شاہ سلجوقی کی بیگم ترکان خاتون کے پاس (جو اس وقت سلطنت کی مالک تھی) اپنا سفیر بنا کر بھیجا، خلیفہ مستظہر ہو مقتدی باشر کا جانشین تھا، امام سے خاص ربط و ارادت رکھتا تھا، اسی کی فرمائش سے امام غزالی نے باطنیہ کے رد میں کتاب لکھی اور اس کا نام خلیفہ کی نسبت سے "مستظہری" رکھا۔

### گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات

اس انتہائی عروج کا جو کسی علمی و دینی شخصیت کو حاصل ہو سکتا ہے، تقاضا تھا کہ امام غزالی اس پر فطرت کریں اور اسی کے دائرہ کے اندر پوری زندگی گزار دیں، جیسا کہ ان کے بعض اساتذہ نے کیا اور لوگ عموماً کیا کرتے ہیں، مگر ان کی بے چین طبیعت اور بلند حوصلہ طائر بہت اس بلندی پر راضی نہ تھا، اور دراصل اسی بلند بہتی نے ان کو امام اور حجة الاسلام بنا دیا، دنیا میں جاہ و اعزاز کی قربانی اور مقصد کی دھن اور سچی لگن

کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، امام عزالیؒ نے خود ان حالات و اسباب کو بیان کیا ہے جنہوں نے ان کو ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ کیا، اور ان کو تعلیم و تدریس کے کام کا نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ اقلیم علم کے بادشاہی چھوڑ کر یقینی علم اور دولت باطن کی تلاش میں نکل گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر پلٹے "المنقذ من الضلال" میں وہ لکھتے ہیں :-

"عنفوان شباب سے میری طبیعت تحقیقات و معلومات کی طرف مائل تھی ہر فرقہ اور جماعت کے ملنا، اور اس کے عقائد و خیالات معلوم کرتا رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی، جو عقائد کچن سے ذہن میں جمے ہوئے تھے، وہ منزلزل ہو گئے، میں نے خیال کیا کہ عیسائی اور یہودی کچے کھی اپنے عقائد پر پرورش پاتے ہیں، حقیقی علم تو یہ ہے کہ کسی قسم کے شبہہ کا احتمال تک نہ رہ جائے، مثلاً مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دس کا عدد تین سے زائد ہوتا ہے اگر کوئی شخص کہے نہیں بلکہ تین زائد ہے اور میرے دعویٰ کی دلیل ہے کہ لاکھی کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے تب بھی مجھے اپنے علم میں کوئی شک نہیں ہوگا، مجھے اس پر تعجب ضرور ہوگا لیکن کچھ بھی میرا یقین باقی رہے گا کہ دس تین سے زائد ہے، میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف حیات اور بدہیات کے دائرہ میں ہے، لیکن جنے پارہ کدو کاوش سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی شک کی گنجائش ہے، میں نے دیکھا کہ حواس میں سب سے زیادہ قوی حاستہ بصرت کا ہے، لیکن اس میں غلطی ہوتی ہے، میرا یہ شک یہاں تک بڑھا کہ مجھے محسوسات کے یقینی ہونے کا اطمینان نہیں رہا، پھر میں نے عقلیات پر غور کیا تو وہ مجھے حیات سے بھی زیادہ مشکوک اور کمزور نظر آئے، تقریباً دو ہجرت تک میری یہ اذنیابی کیفیت رہی اور مجھ پر فسطائیت کا غلبہ رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفا دی اور طبیعت صحت و اعتدال پر آگئی، اور بدہیات عقلی پر اطمینان پیدا ہو گیا، لیکن کسی استدلال اور ترتیب کی بنا پر نہ تھا، بلکہ ایک جدائی اور وہی بات تھی، اس مرض سے شفا پانے کے بعد اب میرے سامنے چار گروہ تھے، جو طالب حق معلوم ہوتے تھے، مشکلیں جو اہل نقل و نظر ہونے

کے مدعی تھے باطنی جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خاص تعلیمات و اسرار ہیں اور انھوں نے براہ راست امام معصوم سے علم حقائق حاصل کیا ہے، فلاسفہ جن کا کہنا ہے کہ وہی اہل منطق و اہل انت بلال ہیں، صوفیہ جو اپنے کو صاحب کشف و شہود کہتے ہیں، میں نے ہر ایک گروہ کی کتابوں اور خیالات کا مطالعہ کیا تو کسی سے بھی مطمئن نہیں ہوا، علم کلام کے متعلق اس فن کے عقیدت مند کی تصنیفات پڑھیں اور خود بھی اس موضوع پر تصنیفات لکھیں، میں نے دیکھا کہ اگرچہ یہ فن اپنے مقصود کو پورا کرتا ہے، لیکن میری تسلی کے لئے وہ کافی نہیں، کیونکہ اس میں ایسے مقدمات پر بنا رکھی گئی ہے جو فرقی مقابل کے پیش کئے ہوئے ہیں، اور متکلمین نے ان کو محض تقلیداً تسلیم کر لیا ہے، یا اجماع یا قرآن و حدیث کے نصوص ہیں، اور یہ چیزیں اس شخص کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کارآمد نہیں، جو بدہیات کے سوا کچھ اور تسلیم نہ کرتا ہو، فلسفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے پہلے میں نے اس کا تحقیقی مطالعہ ضروری سمجھا، اگرچہ مجھے تصنیف و تدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقہ درس میں بغداد میں تین تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لئے وقت نکالا، اور دو سال کے اندر اندر میں نے ان کے تمام علوم کا مطالعہ کر ڈالا، پھر تقریباً ایک سال تک ان پر خود فکر کرتا رہا، میں نے دیکھا کہ ان کے علوم چھ قسم کے ہیں، ریاضیات، منطقاً، طبیعیات، ریاضیات اخلاقیات اور انبیات، ابتدائی پانچ علوم کا مذہب سے نفیاً و اثباتاً کچھ تعلق نہیں، اور مذہب کے اثبات کے لئے ان کے انکار کی ضرورت ہے، طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا کہیں کہیں مذہب سے تصادم ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں اصولاً یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ طبیعت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ خود مختار نہیں، البتہ جو لوگ ان علوم و مضامین میں فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں وہ عمومی طور پر ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کا یہی حال ہوگا، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو، وہ ہر فن میں ماہر ہو، پھر جب ان کی بشری اور ان کے انکار کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار و استخفاف کرنے لگتے ہیں،

دوسری طرف اسلام کے بعض نادان دوست فلاسفہ کے ہر نظریہ اور ہر دعویٰ کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ طبیعیات کے سلسلہ میں ان کی تمام تحقیقات کا بھی انکار کرنے لگتے ہیں، اس کا ایک مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علمی نظریات و تحقیقات کی صداقت کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک وہ چیزیں پارہ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں، ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جاتا ہے، اور بجائے فلسفہ کے انکار کرنے کے وہ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، لے دے کر جو فن مذہب سے متصادم ہوتا ہے، وہ الہیات ہے، اسی میں انہوں نے زیادہ تر ٹھوکریں کھالی ہیں، درحقیقت انہوں نے منطق میں جو شرطیں رکھی تھیں، ان کو وہ الہیات میں نباہ نہیں سکے، اسی لئے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے، غرض میں اس نتیجہ پر پہنچنا کہ فلسفہ سے میری تشفی نہیں ہوگی، اور عقل تنہا تمام مقاصد کا احاطہ نہیں کر سکتی، اور نہ تمام مشکلات کی نقاب کشائی کر سکتی ہے، رہے باطنیہ تو مجھے اپنی کتاب "متنظری" کی تالیف کے سلسلہ میں ان کے مذہب کے مطالعہ کرنے کا اچھی طرح موقع ملا، میں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا دار و مدار امام وقت کی تعلیم پر ہے، لیکن امام وقت کا وجود اور اس کی صداقت خود محتاج دلیل ہے، اور یہ دونوں حد درجہ مشتبہ ہیں، اب صرف تصوف باقی رہ گیا، میں ہمہ تن تصوف کی طرف متوجہ ہوا، تصوف علمی بھی ہے، عملی بھی ہے، میرے لئے علم کا معاملہ آسان تھا، میں نے ابوطالب کی قوت، انقلوب اور حارث محاسبی کی تصنیفات اور حضرت جنید شبلی و بایزید بسطامی وغیرہ کے ملفوظات پڑھے، اور علم کے راستے سے جو کچھ حاصل کیا جانا تھا، وہ میں نے حاصل کر لیا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اصلی حقائق تک تعلیم کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ ذوق و حال اور حالات کی تبدیلی سے پہنچا جاسکتا ہے، جو علوم میرا سراپہ تھے، خواہ وہ شرعی ہوں یا عقلی، ان سے مجھے وجود باری، نبوت اور معاد پر ایمان واضح حاصل ہو چکا تھا، لیکن یہ کبھی کسی دلیل محض سے نہیں، بلکہ ان اسباب و قرائن اور تجربوں کی بنا پر جن کی تفصیل مشکل ہے، مجھ پر یہ اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ سعادت، اخروی کی صورت

صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے اور اس کی تدریس یہ کہ دارفانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان و کشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاوہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ و مال سے اعراض اور موانع و علالت سے فرار کے بغیر ممکن نہیں، میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سرتاپا علالتِ دنیوی میں غرق ہوں، میرا سب سے افضل عمل تدریس و تعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن ٹوٹنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم پر ہے، ہونہ تو اہم ہیں اور نہ آخرت کے سلسلے میں کچھ فائدہ پہنچانے والے ہیں، میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص توجہ اللہ تھی، بلکہ اس کا باعث و محرک بھی محض طلب جاہ و حصول شہرت تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوا ہوں، اگر میں نے اصلاحِ حال کی کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے، میں ایک عرصہ تک اس سب کو چھوڑ دینے اور بغداد سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن اس کا فیصلہ نہ کر سکا، چھ مہینے اسی کشمکش میں گزر گئے، کبھی تو دنیاوی خواہشات کشش کرتیں اور کبھی ایمان کا منادی پکارتا کہ کوچِ قریب ہے، تھوڑی عمر باقی ہے، طویل سفر پیش ہے، اور یہ سب علم و عمل محض ریاء و تخیلات ہیں، کبھی نفس کہتا کہ یہ عارضی حالت ہے، اللہ نے جو کچھ جاہ و عزت دے رکھی ہے، چھوڑنے کے بعد اگر پھر واپس آنے کا خیال ہو تو اس کا دوبارہ حصول مشکل ہے، غرض اسی لیت و لعل میں چھ مہینے گزر گئے، یہاں تک کہ اب معاملہ بس سے باہر ہو گیا، زبان بھی رک گئی، جیسے اس میں تالا پڑ گیا ہو، میں کوشش کرتا تھا کہ آنے جانے والوں کی خوشی کے لئے ایک ہی دن پڑھاؤ، لیکن زبان بالکل ساتھ نہیں دیتی تھی، اور ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا، زبان کی بندش سے قلب میں ایک رنج و غم کی کیفیت پیدا ہوئی، جس کے اثر سے قوتِ باطن نے بالکل جواب دے دیا، کھانے پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی، یہاں تک کہ ایک گھونٹ پانی، کھانے کے ایک لقمہ کا، ہضم کرنا بھی میرے لئے دشوار ہو گیا، رفتہ رفتہ تمام توانے جسمانی پرضعت کا غلبہ ہوا، یہاں تک کہ اطبانے علاج سے ہاتھ اٹھایا اور کہا کہ قلب پر

کوئی اثر ہے اور اس سے مزاج متاثر ہو گیا ہے، جب تک قلب سے یہ اثر نہ جائے، اس وقت تک علاج کچھ سود مند نہیں، جو میں نے دیکھا تو میں اس معاملہ میں بالکل بے بس ہوں تو میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اضطرابی کیفیت کے ساتھ اس سے دعا کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جاہ و مال اور اہل و عیال کا چھوڑ دینا مجھے آسان معلوم ہونے لگا، میں نے مکہ کا قصد ظاہر کیا، اور میرے دل میں یہ تھا کہ میں شام کا سفر کروں گا اور بڑے لطائف اخیل سے میں نے بغداد سے نکلنے کا سامان کیا، اہل عراق کو جب میرا قصد معلوم ہوا تو انھوں نے چاروں طرف سے مجھے ملامت کرنی شروع کی اس لئے کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس ترک و انقطاع کا کوئی دینی سبب بھی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ان کے خیال میں مجھے دین کا بلند ترین منصب حاصل تھا، ذَالِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ پھر لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کیں، جو مرکز حکومت سے دور تھے، انھوں نے خیال کیا کہ اس میں کچھ حکام کا اشارہ ہے، اور ان کے ایما سے یہ خدمت ترک کی جا رہی ہے، لیکن جن لوگوں کا حکومتی حلقوں سے تعلق تھا، وہ دیکھتے تھے کہ اہل حکومت کو کس قدر میرے قیام پر اصرار ہے، اور ان کی کیسی شدید خواہش ہے کہ میں اپنے کام میں مشغول رہوں، وہ یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی اس رونق اور عملی چہل پہل کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ یہ شخص سب چھوڑ چھاڑ کر جا رہا ہے، غرض میں نے بغداد کو الوداع کہی اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا، اس میں سے بقدر کفایت رکھ کر سب بانٹ دیا، بغداد سے میں شام آیا، اور وہاں دو سال کے قریب رہا، وہاں میرا کام عزت و خلوت اور مجاہدے کے سوا کچھ نہ تھا، میں نے علم تصوف سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کے مطابق نفس کے تزکیہ، اخلاق کی درستی و تہذیب اور ذکر اللہ کے لئے اپنے قلب کو مصفا کرنے میں مشغول رہا، میں مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں متکلف رہا، مسجد کے منارے پر چڑھ جاتا، اور تمام دن دروازہ بند کئے وہیں بیٹھا رہتا، دمشق سے میں بیت المقدس آیا، وہاں بھی روزانہ صبح کے اندر چلا جاتا، اور دروازہ بند کر لیتا، سیدنا ابراہیم کی

زیارت کے بعد میری طبیعت میں حج و زیارت کا شوق اور کرم و مدینہ منورہ کے برکات سے استفادہ کا خیال ہوا، چنانچہ میں حجاز گیا، حج کرنے کے بعد اہل و عیال کی کشش اور بچوں کی دعاؤں نے مجھے وطن پہنچایا حالانکہ میں وطن کے نام سے کوسوں بھاگتا تھا، وہاں بھی میں نے تنہائی کا اہتمام رکھا، اور قلب کی صفائی سے غافل نہیں ہوا، لیکن حوادث و واقعات اہل و عیال کے افکار اور معاشی ضرورتیں طبیعت میں انتشار پیدا کرتی رہتی تھیں، اور دل بھی اور سکون قلب سلسل نہیں رہتا تھا، لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوتا تھا، اور وقتاً فوقتاً اس سے لذت یاب ہوتا رہتا تھا، اس برس اسی حالت میں گذر گئے، ان تنہائیوں میں مجھے جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا، اس کی تفصیل اور اس کا استقصار تو ممکن نہیں، لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا، کہ صوفیاء ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم، اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت، اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں، اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے۔“

## خلوت سے جلوت کی طرف

ممکن تھا کہ امام غزالیؒ اس خلوت و عزلت کی حالت میں رہ جاتے اور اقبیہ عمر بھی روحانی لذت اور یکسوئی کے سکون و اطمینان میں گزار دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے جو عظیم الشان کام لینا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس خلوت سے نکلیں اور درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور اجتماعی زندگی اختیار کریں تاکہ خلایق کو نفع ہو، اجماد و فلسفہ کی تردید اور عقلی و علمی طور پر اسلام کی برتری اور صداقت ثابت کرنے کے لئے خصوصاً، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یقین و مشاہدے کے مقام تک پہنچا دیا تھا، عالم اسلام



میں ان سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں تھی، چونکہ یہ کام خدا کو منظور تھا، اور اسلام کو اس کی سخت ضرورت تھی، اس لئے خود ان کی طبیعت میں اس کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا، اور ان پر اس چیز کا غلبہ ہوا کہ یہی عزیمت کا کام اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور وقت کا فریضہ اور افضل عبادت ہے، اپنے ان احساسات کو وہ خود بیان کرتے ہیں، اور خلوت سے جلوت میں آنے کا سبب تحریر کرتے ہیں :-

”میں نے دیکھا کہ فلسفہ کے اثرات بہت بے ایمان تصوف کی گمراہی بہت سے علماء کی بے عملی اور شکلیں کی غلط اور کمزور نمایندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے، اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند بھی ہیں، لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں، بعض محض سوسائٹی اہل شہر کی عادت کی پیروی اور اپنی حفاظت کے لئے بعض احکام شرعی کی مادی منفعتیں اور ان کے نہ کرنے کے دنیاوی نقصانات بتلاتے ہیں، اور اگر ان نقصانات سے بچا جاسکے تو ان کے از تکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، میں نے دیکھا کہ میں ان شبہات کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور آسانی اس پر قادر ہوں، یہاں تک کہ ان لوگوں کی پردہ دری مجھے اپنے مطالعہ اور ان کے علوم سے گہری واقفیت کی وجہ سے پانی پینے سے بھی زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہئے، اور یہی وقت کا فریضہ ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ تجھے یہ خلوت و عزلت کب جائز ہے، مرض پھیل گیا ہے، اور طبیب خود بیمار ہیں، اللہ کی مخلوق ہلاکت کے کنارے پہنچ گئی ہے، پھر میں نے کہا کہ عظیم الشان کام تم سے کیسے انجام پاسکے گا، عہد نبوت سے بہت بعد ہو گیا ہے، باطل کا ہر طرف دور دورہ ہے، اگر تم نے خلق خدا کو ان کی محبوب مانوس چیزوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو سارا زمانہ تمہارا مخالف ہو جائے گا، تم تنہا کیسے ان کا مقابلہ کر سکو گے، اور کیسے زندگی بسر کرو گے، یہ تو جب ممکن تھا کہ زمانہ مساعد ہوتا، اور سلطان وقت دین دار اور صاحب اقتدار

ہوتا میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو بھالایا، اور اپنے لئے عزت و خلوت کی زندگی کو جائز قرار دے لیا، لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا، اس نے سلطان وقت کے دل میں خود ہی تحریک پیدا کر دی اس نے مجھے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے نیشاپور پہنچنے کا تاکید حکم دیا، یہ حکم سلطانی کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی تعمیل نہ کی تو ناراضی تک نوبت پہنچے گی، میں نے خیال کیا کہ اب میرے لئے عذر باقی نہیں رہا، اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لئے ہوگی اور آزمائش اور تکالیف سے گریز، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

«أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۚ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِينَ ۚ» نیز اپنے رسول کریم سے جو اس کے بندوں میں سب سے معزز و مکرم تھے اس کا ارشاد ہے:-

«وَلَقَدْ كَذَّبْتُمْ بِرَسُولٍ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبْرًا وَعَلَىٰ مَالِكٍ بُؤَاؤًا وَذُؤَا حَتَّىٰ آتَاهُمْ نَصْرًا وَلَا مَبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبِيِّ الْمُؤْمِنِينَ ۚ»

میں نے چند اہل قلوب اور اہل شہادت سے بھی اس بابے میں مشورہ کیا، انھوں نے بھی بالانفاقی مجھے ترک عزت کا مشورہ دیا، اس کی تائید میں بہت سے صلحاء نے متواتر خواب بھی دیکھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر و برکت کا باعث ہوگا، اور پانچویں صدی کے شروع میں جس میں ایک ہی ہینہ باقی تھا، کوئی شاید عظیم الشان تجدیدی کام ہوگا، اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے آدمی کو پیدا کرتا ہے جو اس امت کے دین کو تازہ کر دیتا ہے، ان سب آثار و قرائن سے مجھے بھی اس کی امید پیدا ہوئی، اللہ تعالیٰ نے میرے لئے نیشاپور کا سفر کر دیا اور میں نے اس کا عظیم کارادہ کر لیا، یہ ۴۹۹ھ کے ماہ ذیقعدہ کا قصہ ہے، بغداد سے ذیقعدہ ۴۸۸ھ میں نکلا تھا، اس طرح سے میری گوشہ نشینی کی مدت ۱۱ سال ہوتی ہے،

یہ سب تقدیر الہی کی کار فرمائی تھی، جس طرح بغداد سے نکلنا اور وہاں کے جاہ و اعزاز کو خیر آباد کہنا  
 تصویر میں نہیں آتا تھا، لیکن اللہ کے حکم سے وہ سب کچھ آسان ہو گیا، اسی طرح سے اس عزت کے  
 زمانہ میں خلوت سے جلوت کی طرف دوبارہ آنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا، لیکن وقت پر اس کا بھی سامان ہو گیا۔  
 عرض ذیقعدہ ۱۲۹۹ھ میں امام صاحب نے پھر نیشاپور کا رخ کیا، اور مدرسہ نظامیہ کی مسند درس کو  
 زینت دی اور دوبارہ تدریس و افادہ کا کام شروع کیا، لیکن اب امام غزالیؒ کے درس و تدریس اور  
 اصلاح و ارشاد اور اس انقلاب سے پہلے کے تدریسی مشاغل اور وعظ و ارشاد میں فرق تھا، پہلے وہ  
 نفس کے تقاضے اور طبیعت کے جذبہ سے کرتے تھے، اب وہ اپنے کو مورا اور آلہ کار سمجھتے تھے، چنانچہ  
 خود پوری صاف گوئی سے لکھتے ہیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے، لیکن درحقیقت  
 اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے، میری اس پہلی اور دوسری حالت میں  
 زمین و آسمان کا فرق ہے، میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا، جو حصول جاہ کا ذریعہ ہے، اور میں اپنے  
 قول و عمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا، اور یہی میرا مقصود و نیت تھی، لیکن اب میں اس علم کی دعوت  
 دیتا ہوں، جس سے جاہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا  
 ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہنچوں گا، یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا، لیکن  
 اپنے یقین و مشاہدہ کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے، اسی سے آدمی گمراہی  
 اور شر سے بچ سکتا ہے، اور ہدایت و طاعت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے، دراصل میں نے اپنی  
 طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ مجھے حرکت میں لایا ہے، میں نے خود کام نہیں شروع کیا ہے، اللہ نے مجھے  
 کام میں لگایا ہے، میری دعا ہے کہ پہلے التشریری اصلاح فرمائے، پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح  
 ہو، پہلے مجھے راہ پر لگائے، پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے، حق مجھ پر منکشف ہو جائے، اور اس کے

فضل سے مجھے اتباع کی توفیق ہو، باطل مجھ پر واضح کر دے اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے!

## امام غزالیؒ کا تجدیدی کام

امام غزالیؒ نے اس کے بعد جو مجددانہ کام انجام دیا، اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔  
 ۱۔ فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر حملہ۔  
 ۲۔ زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید و اصلاح۔

## فلسفہ پر عمل جراحی

ان کے پہلے اور سب سے بڑے کارنامہ کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفہ احماد، باطنیت کے خلاف اس وقت تک جو کچھ کیا جاتا رہا تھا، اس کی حیثیت صرف مدافعت و جواب دہی کی تھی، اس وقت تک فلسفہ اسلام پر حملہ آور تھا، اور متکلمین اسلام صفائی کے وسیلے تھے، فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر پیشہ چلاتا تھا، اور علم کلام سپر غیبی کی کوشش کرتا تھا، اس وقت تک متکلمین و علماء اسلام کے گروہ میں کسی نے خود فلسفہ کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی، "فلسفہ جن" مفروضات پر قائم تھا، ان پر جرح کرنے اور خود ان کی علمی تنقید کرنے کی صدیوں تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی، امام ابوالحسن اشعری کو چھوڑ کر جن کو فلسفہ سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا، پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعتی تھا، امام غزالیؒ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے فلسفہ کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کیا، اس کے بعد مقاصد الفلاسفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقہ پر منطق، الہیات اور طبیعیات کا خلاصہ پیش کیا، اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات اور مباحث کو مدون کر دیا، کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ

لہذا المنقذ من الضلال ص ۲۸ تا ۳۰ مختصراً۔

کہہ دیا ہے کہ ریاضیات میں قبل و قال کی گنجائش نہیں اور دین کا اس سے تعلق نہیں، لیکن اصل مذہب کا تضاد الہیات سے ہے، منطقیات میں بھی تنازوں اور غلطیاں ہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو اصطلاحات کا، طبیعیات میں ضرورت و باطل کی آمیزش ہے اس لئے ان کا موضوع بحث دراصل الہیات اور کسی قدر طبیعیات ہے، منطق محض تمہید و اصطلاحات کے لئے۔

اس کتاب سے فارغ ہو کر جس کی علم کلام کے حلقے میں سخت ضرورت تھی، انہوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب "تہافت الفلاسفہ" لکھی جس کی خاطر انہوں نے "مقاصد الفلاسفہ" لکھی تھی، اس میں انہوں نے فلسفہ کے الہیات و طبیعیات پر اسلامی نقطہ نظر سے تنقید کی اور اس کی علمی کمزوریوں، اس کے استدلال کے ضعف اور فلاسفہ کے باہم تناقض و اختلاف کو پوری جرأت و قوت کے ساتھ ظاہر کیا، اس کتاب میں ان کا لہجہ پُر از اعتماد ان کی زبان طاقت ور اور شگفتہ ہے کہہ رہے ہیں وہ طنزیہ اور شوخ طریزیان بھی اختیار کر لیتے ہیں جس کی فلسفہ سے مرعوب حلقوں میں ضرورت تھی اور جو بڑا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مقابلہ میں احساس کہنتری کے ہر شاہد سے پاک اعتماد اور یقین سے لبریز اور فلسفہ سے بالکل غیر مرعوب ہے، وہ فلاسفہ یونان کو اپنی صفت اور سطح کا آدمی سمجھتا ہے اور ان سے مساویانہ و جریفانہ باتیں کرتا ہے، اس وقت ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی، جو فلسفہ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے، اور بجائے بدافعت اور جواب دہی کے فلسفہ پر پورا وار کرے، امام غزالیؒ نے "تہافت الفلاسفہ" میں یہی خدمت انجام دی ہے، اول سے آخر تک اس کتاب میں ان کا طرز ہی ہے، کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"ہمارے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں

سے ممتاز ہے، یہ لوگ مذہبی احکام و قیود کو حقارت کا نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس کی وجہ صرف

یہ ہے کہ انہوں نے سقراط و بقراط، افلاطون و ارسطو کے پرہیزگاری نام سے، اور ان کی شان میں ان کے

مقلدوں کی بے لگہ آرائیاں اور قصیدہ خوانی سنی، ان کو معلوم ہوا کہ ریاضیات منطقیات طبیعیات و الہیات

میں انھوں نے بڑی موٹنگافیاں کی ہیں، اور ان کا عقل و ذہن میں کوئی ہمسرہ نہ تھا، اس عالی دماغی اور ذہانت کے ساتھ وہ مذاہب اور ان کی تفصیلات کے منکر تھے، اور ان کے نزدیک ان کے اصول و قواعد فرضی و مصنوعی ہیں، بس انھوں نے بھی تقلید انکار مذہب کو اپنا شعار بنالیا، اور تسلیم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کے شوق میں مذاہب کا انکار کرنے لگے، تاکہ ان کی سطح عوام سے بلند سمجھی جائے اور وہ بھی عقلا و حکما کے زمرہ میں شمار ہونے لگیں، اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکما نے الہیات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچہ اطفال اور ان کے بہت سے اقوال و نظریات حد درجہ کے مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں۔

اس کتاب میں آگے چل کر ان کا زور بیان اور طنز آمیز طریقہ تحریر اور شوخ ہو جاتا ہے اور ذات و صفات باری کے متعلق فلاسفہ کے عجائبات اور عقول و افلاک کا پورا شجرہ نسب لکھ کر جو فلاسفہ نے تصنیف کیا ہے لکھتے ہیں۔

قلنا ما ذکرتموه عملاً وھی علی التعمیق	تمہارا یہ سارا بیان اور تفصیلات محض دعاوی،
ظلمات فوق ظلمات و حکما الانسا	تھکتا ہیں بلکہ درحقیقت تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں اگر
عن منام رأی الاستدل علی سوء مزاجہ	کوئی شخص اپنا ایسا خواب بھی دکھنا بیان کرے
	تو اس کے سوء مزاج کی دلیل ہوگی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

لست ادری کیف یفنع المجنون من نفع عقل	مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ
ہذا الا و مناع فضلاً عن العقلاء الذین	باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے سچے جاہل و عقلا
یشقون الشعر بزعم فی المعقولات	جو بزم خود معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

انتھی بهم التعق في التعظيم الى ان  
 ابطلوا كل ما يفهم من العظمة وقربوا  
 حاله من حال الميت الذي لا خبر له  
 بما يجري في العالم الا انه فارق الميت  
 في شعوره بنفسه فقط، وهكذا يفعل  
 الله بالزائغين عن سبيله والناكبين  
 عن طريق الهدى المنكرين لقوله تعالى  
 "مَا أَشْهَدُ تُهْمُ خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ  
 وَلَا خَلْقِ أَنْفُسِهِمُ الظَّالِمِينَ بِاللَّهِ ظَنَّ  
 السَّعْيِ الْمُعْتَدِينَ أَنَّ أُمُورَ الرَّبُّوبِيَّةِ  
 تَتَعَلَّى عَلَى كُنْهَاتِ الْقُوَى الْبَشَرِيَّةِ  
 الْمُخْرُورِينَ بِعُقُولِهِمْ زَاعِمِينَ أَنَّ فِيهَا  
 مَنَادٌ وَمَنَعَةٌ عَنِ تَقْلِيدِ الرِّسَالِ وَاتِّبَاعِهِمْ  
 فَلَا جَرَمَ اضْطُرُّوا إِلَى الْإِعْتِرَافِ بِأَنَّ  
 لِيَابِ مَعْقُولَاتِهِمْ جَمْعٌ إِلَى مَا وَجَدُوا  
 فِي الْمَنَامِ لِتَجِبَ مِنْهُ

(مبدأ اول) کی تعظیم میں مبالغہ کرنے سے ان کو اس  
 حد تک پہنچا دیا کہ انھوں نے عظمت کے تمام شرائط و لوازم کو  
 باطل قرار دے دیا، اور اللہ تعالیٰ کو (اپنے فلسفہ میں)  
 اس مردہ کی طرح بنا دیا، جس کو کچھ خبر نہیں کہ عالم میں  
 کیا ہو رہا ہے، صرف اس بات میں وہ مردہ سے غنیمت ہے  
 کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو اپنا شعور بھی  
 نہیں ہوتا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ایسا ہی  
 حشر کرتا ہے، جو اس کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں  
 اور ہدایت کے راستے سے کترا جاتے ہیں جو  
 اس آیت کے منکر ہیں، "میں نے ان کفار و  
 مشرکین کو آسماں اور زمین کی پیدائش کے  
 وقت گواہ نہیں بنایا، اور نہ ان کی پیدائش  
 کے وقت جو اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کرتے ہیں،  
 اور برا عقائد رکھتے ہیں جن کا خیال ہے کہ انہیں  
 ربوبیت کی حقیقت پر انسانی قوی حادی ہو  
 سکتے ہیں جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ  
 ان کی موجودگی میں پیڑوں کی تقلید اور ان کے

اتباع کی ضرورت نہیں لایا اس کا انجام یہ ہوا کہ  
ان کی زبان سے (معقولات کے نام سے) ایسی ایسی  
مضحکہ خیز باتیں نکلیں کہ اگر کوئی خواب بھی ایسا بیان  
کے تو لوگ تعجب کریں۔

## ”تہافت الفلاسفہ“ کا اثر

فلسفہ پر یہ دلیل اہم تنقید اور کسی حد تک تحقیر علم کلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس کا سہرا  
امام غزالیؒ کے سر ہے بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس کی تکمیل کی اور فلسفہ اور منطق کی لاش کی تشریح ”پوسٹ  
مارٹم“ کا فرض انجام دیا فلسفہ کی جراحی کے اس سلسلہ کا آغاز امام غزالیؒ ہی کی تصنیفات سے ہوتا ہے۔  
”تہافت الفلاسفہ“ نے فلسفہ کے خیالی طلسم پر کاری ضرب لگائی اور اس کی عظمت ذہنی تقدس کو کافی  
نقصان پہنچایا، اس کتاب کی تصنیف نے فلسفہ کے حلقوں میں ایک اضطراب اور غم و غصہ پیدا کر دیا، مگر  
تئیسویں تک اس کے جواب میں کوئی شایان شان کتاب تصنیف نہیں ہوئی، یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری  
کے آخر میں فلسفہ کے مشہور پرچوش وکیل اور ارسطو کے حلقہ بگوش ابن رشد (م ۵۹۵ھ) نے ”تہافت التہافت“  
کے نام سے اس کا جواب لکھا، علماء مغرب کہتے ہیں کہ اگر ابن رشد فلسفہ کی حمایت کے لئے نہ کھڑا ہو جاتا تو  
فلسفہ غزالیؒ کے حملوں سے نیم جان ہو چکا تھا، ابن رشد کی حمایت نے اس کو تئیسویں تک کے لئے پھر زندگی  
عطا کر دی۔

## باطنیت پر حملہ

فلسفہ کے علاوہ امام غزالیؒ نے فتنہ باطنیت کی طرف بھی توجہ کی انھوں نے قیام بقاء اور



مدرسہ نظامیہ کی تدریس کے زمانہ میں باطنیوں کی تردید میں خلیفہ وقت کے اشارہ سے المستظریؒ تالیف کی تھی جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی خودنوشت تلاش حق کی کہانی "المنقذ من الضلال" میں کیا ہے اس کتاب کے علاوہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں اور ہیں، جو غالباً اس بازگشت زمانہ کی تصنیف ہیں "حجۃ الحق"، "مفصل اختلاف"، "قاصم الباطنیہ" ان کی تصنیفات کی فہرست میں اس موضوع پر دو کتابیں "فضائح الاباحیہ" اور "مواہم الباطنیہ" اور بھی ملتی ہیں، باطنیت کے رد کے لئے درحقیقت اہل سنت کے حلقہ میں ان سے زیادہ موزوں آدمی ملنا مشکل تھا، وہ فلسفہ و تصوف اور ظاہری علوم اور حقائق و معارف دونوں کو چوں سے واقف تھے، اور باطنیہ کی اسرار فروشی اور ان کی عقلی سازش کا آسانی سے پردہ فاش کر سکتے تھے، باطنیہ کا بڑا حربہ فلسفہ اور اس کی اصطلاحات تھیں، اس لئے امام غزالیؒ جیسا جامع شخص اور عقلیات کا مبصر ان کی تردید کا کام کر سکتا تھا، چنانچہ اس کام کو انہوں نے بخوبی انجام دیا اور ان کو علمی طور پر بے وقعت اور بے اثر بنا دیا۔

## زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ

امام غزالیؒ کا دوسرا اصلاحی کارنامہ زندگی و معاشرت کا اسلامی جائزہ اور اس کی اصلاح و تجدید کی کوشش تھی، ان کی اس کوشش کا نمونہ اور کامیاب نتیجہ ان کی زندہ جاوید تصنیف "احیاء علوم الدین" ہے۔

## "احیاء علوم الدین"

"تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے، اور جن سے اسلامی حلقے طویل عرصہ تک متاثر رہے ہیں، ان میں "احیاء علوم الدین" کو ممتاز مقام

ملے، ان تینوں کتابوں کا تذکرہ امام غزالیؒ نے "جوہر القرآن" میں کیا ہے۔

حاصل ہے، حافظ زین الدین العراقي صاحب الفیہ (م ۸۰۶ھ) جنھوں نے اجیار کی احادیث کی تخریج کی ہے، کہتے ہیں کہ امام غزالی کی اجیار العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات کے لیے، عبدالغافر فارسی جو امام غزالی کے معاصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ اجیار العلوم کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی، شیخ محمد کازرونی کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیئے جائیں تو میں "اجیار العلوم" سے ان کو دوبارہ زندہ کر دوں گا، حافظ ابن جوزی نے بھی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود اس کتاب کی تاثیر اور مقبولیت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کا خلاصہ منہاج القاصدین کے نام سے لکھا۔

یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، بغداد سے انھوں نے طلب حق اور تلاش یقین کا جو سفر شروع کیا تھا، اور جو دس برس کے مجاہدات اور بادیہ پیمائی کے بعد کامیابی پر ختم ہوا، اجیار العلوم اس سفر کی سوغات تھی، جو امام غزالی اہل وطن کے لئے لائے، یہ ان کے قلبی تاثرات، علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے۔

مولانا شبلی نے الغزالی میں لکھا ہے :-

"بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا، تمام مذاہب کو چھاننا کسی سے تسلی نہیں ہوئی، آخر تصوف کی طرف رخ کیا، لیکن وہ قال کی چیز تھی، بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا، اور اس کا پہلا ذریعہ اصلاح باطن اور تزکیہ نفس تھا، امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدراہ تھے، قبول عام و ناموری جاہ و منزلت، مناظرات و مجادلات اور پھر تزکیہ نفس شتان بینہما۔ ع

اسی رہ کہ می روی تو بمنزل نمی رود

آخر سب چھوڑ چھاڑا ایک کلمی پہن بغداد سے نکلے، اور درشت پیمائی شروع کی سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزیر راز تک رسائی پائی، یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے لیکن۔

اور ہر ۳۰۰ تعریف الایا بفضائل الاجیار (شیخ عبدالقادر اکسنی)

## ۴. زیاد آریفاں بادہ پیمارا

کے لحاظ سے افادہ عام پر نظر پڑی دیکھا تو آئے کا آواگرا ہوا ہے اسیر و غریب عام و خاص عالم و جاہل، رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں، علماء جو دلیل راہ بن سکتے تھے، طلب جاہ میں مہر و ہنر ہیں وہ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے، اور اس حالت میں یہ کتاب لکھی، دیر پاہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھایا ہے، اور سعادتِ اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں، علماء جو دلیل راہ تھے، زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے، جو رہ گئے ہیں، وہ نام کے عالم ہیں، جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، اور جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے، مناظرہ (جو فخر و نمود کا ذریعہ ہے) و عطا (جس میں عوام کی دلفریبی کے لئے رنگین اور مستح فخرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ (جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے) باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے، اور لوگ اس کو بھول بھلا چکے، یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور مہر سکوت ٹوٹ گئی۔

## تنقید و احتساب

کتاب کی تالیف سے جو اصلاح و تربیت امام غزالی کے پیش نظر تھی، اس کے لئے آبادگی اور شوق اور اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کا تقاضا پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کمزوریوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی جائے، جو علمی و دینی حلقوں اور مسلم معاشرہ میں بالعموم پھیلی ہوئی تھیں، نیز اس حقیقت کو آشکارا کیا جائے کہ نفس و شیطان نے کس کس طرح سے مختلف طبقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم و حقائق کس طرح تبدیل ہو گئے ہیں، لوگ حقائق و مقاصد سے ہٹ کر ظواہر و اشکال اور رسوم میں کس طرح گرفتار ہیں، اور مقصد اصلی سعادتِ اخروی اور رضائے الہی سے کس طرح غافل ہیں، اس کے لئے انہوں نے

اپنے زمانہ کی زندگی اور معاشرہ سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا، اور اس کی بے لاگ تنقید کی، اور ہر طبقہ کے امراض اور مغالطوں کو صفائی کے ساتھ بیان کیا، مقاصد اور وسائل و آلات میں فرق کیا، علوم میں دنیاوی علوم اور دینی علوم اور پھر علوم محمودہ اور علوم مذمومہ فرض اور فرض کفایہ کی تقسیم کی، وقت کے فریضہ اور اصل کام کی طرف توجہ دلائی، اہل دولت اور اغنیاء کی کوتاہیوں اور ان کی مخصوص بیماریوں کو کھول کر بیان کیا، سلاطین و حکام پرچرات کے ساتھ تنقید کی، اور ان کے جبر و ظلم، خلاف شرع اعمال و قوانین کی مذمت کی، اس کے علاوہ جمہور و عوام کے امراض اور مختلف طبقوں اور مقامات کے منکرات، مذموم عادات اور مخالفت دین روم و بدعات کی تفصیل کی، اس طرح یہ کتاب اسلام میں پہلی مفصل و مدلل کتاب ہے، جس میں پوری زندگی اور بگڑے ہوئے اسلامی معاشرہ کا قوت کے ساتھ احتساب کیا گیا ہے، اور اخلاقی بیماریوں کے عوارض و اسباب و ان کا طریق علاج بتایا گیا ہے۔

## علماء و اہل دین

امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد دینی و اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی ذمہ داری علماء پر ہے، جو ان کے نزدیک امت کا نمک ہیں، اگر نمک بگڑ جائے تو اس کو کون سی چیز درست کر سکتی ہے، بقول شاعر:-

یامعشر القراء یا ملح البلد ما یصلح الملح اذ الملح فسد

اے جماعت علماء! وہ جو شہر کا نمک ہے۔ بھلا یہ تیل او کہ جب نمک ہی بگڑ جائے تو پھر اس کی اصلاح کس سے کی جائے

ایک جگہ امراض قلب کی کثرت اور عام غفلت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

الثالثة وهو الداء العضال فقد تیسرا سبب اور وہ لا علاج مرض کی حیثیت رکھتا

الطیب خان الاطباء هم العلماء ہے، یہ ہے کہ مرض موجود ہیں اور طبیب مفقود،

وقدمرضوانی هذا الاھمار مرضاً طبیب علماء ہیں، اور وہ خود اس زمانہ میں بری

شدیداً و عجزوا عن علاجہ۔ طرح بیمار ہیں، اور علاج سے عاجز ہیں۔

ان کے نزدیک سلاطین و حکام کی خرابی کا سبب بھی علماء کی کمزوری اور اپنے فرائض سے غفلت ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وبالمجملۃ انما فسدت الرعیۃ - خلاصہ یہ ہے کہ رعیت کی خرابی کا سبب سلاطین  
 بفساد الملوك وفساد الملوك کی خرابی ہے اور سلاطین کی خرابی کا سبب علماء  
 بفساد العلماء فلولا القضاة الشوع کی خرابی ہے اس لئے کہ اگر خدا ترس قاضی اور  
 والعلماء الشوع لقل فساد الملوك علماء سوزنہ ہوتے تو سلاطین اس طرح نہ بگڑتے  
 خوفا من انكارهم اور ان کو علماء کی روک ٹوک کا کھٹکا ہوتا۔

ان کو علماء وقت سے شکایت ہے کہ وہ علماء سلف کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور کلمہ حق عند سلطان جائز کا فریضہ انجام نہیں دیتے، ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ خود بہت سے علماء دنیا طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہو گئے ہیں، وہ سلاطین وقت اور ارباب حکومت کے سامنے علماء حق کی جرأت و بیباکی اور احتساب و انکار کے موثر واقعات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:-

”یہ تھا علماء کا طرز عمل اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شان ان کو سلاطین کی شان و شوکت کی ذرا پرواہ نہ تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد رکھتے ہیں اور ان کو اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر بھی راضی تھے کہ ان کو شہادت نصیب ہو، چونکہ ان کی نیت خالص تھی اس لئے ان کے کام سے پتھر موم ہو جاتے تھے اور بڑے سے بڑے سنگ ل متاثر ہوتے تھے اب تو حالت یہ ہے کہ طمع دنیا نے علماء کی زبانیں گنگ کر رکھی ہیں اور وہ خاموش ہیں، اگر بولنے بھی ہیں تو ان کے اقوال و حالات میں مطابقت نہیں ہوتی، اس لئے کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر آج بھی وہ خلوص و صداقت سے کام لیں اور علم کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو ان کو ضرور کامیابی ہو، کیونکہ رعیت کی خرابی سلاطین کی خرابی

کا نتیجہ ہے اور سلاطین کی خرابی علماء کی خرابی کا نتیجہ ہے اور علماء کی خرابی کی وجہ دولت اور جاہ کی محبت کا غلبہ ہے اور جس پر دنیا کی محبت غالب آجائے وہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر بھی احتساب اور روک ٹوک نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ سلاطین و اکابر!

امام غزالی کے زمانہ میں ایک عالم کا نفقہ کی جزئیات اور اخلاقی مسائل میں مشغول تھا، مباحثہ و مناظرہ کا بازار گھر گھر اور ملک کے چپے چپے پر گرم تھا، مجالس و تقریبات اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق بھی انہی مذہبی و فقہی مباحثوں اور مناظروں سے تھی، اس بارہ میں علماء و طلبہ کا انہماک اور علوانا بڑھ گیا تھا کہ تمام دوسرے علوم و مشاغل اور خدمتِ دین کے شعبے نظر انداز ہوتے جا رہے تھے، حدیث ہے کہ اصلاحِ نفس تہذیبِ اخلاق اور سعادتِ اخروی کا جس علم اور کوشش پر انحصار تھا، اس سے بھی توجہ ہٹ گئی تھی، امام غزالی اس صورت حال کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”اگر کسی فقیہ سے ان مضامین (صبر و شکر، خوف ورجاء وغیرہ یا بغض و حسد و کینہ، ناشکری، دغا، فریب وغیرہ) میں سے کسی کی بابت حتیٰ کہ اخلاص و توکل اور ریاضے بچنے کے طریقوں کے متعلق سوال کیا جائے جس کا جاننا اس کے لئے فرض عین ہے اور اس کی طرف سے غفلت کرنے میں آخرت کی تباہی کا خطرہ ہے تو وہ جواب نہ دے سکے گا، اور اگر آپ معان و ظہار سبق و رمی کو دریافت کریں تو وہ ایسی ایسی باریک جزئیات کے دفتر کے دفتر سے گائے گا، جس کی ضرورت مدتوں پیش نہیں آتی، اور اگر کبھی ضرورت پیش آجائے تو شہر میں ان کے متعلق فتویٰ دینے والا، اور بتانے والا ہر وقت موجود ہے، لیکن یہ عالم دن رات انہی جزئیات کے سلسلے میں محنت کرتا رہے گا، اور ان کے حفظ و درس میں مشغول رہے گا اور اس چیز سے غفلت برتے گا، جو دینی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے، اگر اس سے کبھی اس بارہ میں سوال ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اس علم میں اس لئے مشغول ہوں کہ وہ علم دین ہے اور فرض کفایہ ہے اور وہ اس کے تعلیم و تعلم کے بارہ میں اپنے کو بھی

مناظر دیتا ہے اور دوسروں کو بھی، حالانکہ سمجھدار آدمی خوب جانتا ہے کہ اگر اس کا مقصد فرض کفایہ کے حق کو ادا کرنا ہو، اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہوتا تو وہ اس فرض کفایہ پر فرض عین کو مقدم رکھتا، بلکہ دوسرے فرض کفایہ بھی ہیں جن کو مقدم ہونا چاہئے مثلاً کتنے شہر ہیں جن میں صرف غیر مسلم طبیب ہیں جن کی شہادت احکام فقہ میں قبول نہیں کی جاسکتی، لیکن ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی عالم (اس کی اور ضرورت کو محسوس کر کے) علم طب کی طرف توجہ کرتا ہو اس کے بالقابل علم فقہ یا مخصوص خلافیات و جدیدیات پر طلبہ ٹوٹ پڑتے ہیں، حالانکہ شہر ایسے علماء سے بھر ہوا ہے جن کا مشغلہ فتویٰ نویسی اور مسئلہ بتلانا ہے، میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ علماء دین ایسے فرض کفایہ میں مشغول ہونے کو کیسے درست سمجھتے ہیں جس کو ایک جماعت کی جماعت سنبھالے ہوئے ہے، اور ایسے فرض کفایہ کو انھوں نے کیسے چھوڑ رکھا ہے جس کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہیں کیا اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ ہے کہ طب کے ذریعہ سے اوقات کی تولیت و وصیتوں کی تفسیر اور غنیموں کے مال کی نگرانی و انتظام اور منصب قضا و افتاء پر تقرر اور سمعہ و اور سمعہ پیشوں میں فوقیت و امتیاز اور دشمنوں اور حریفوں پر حکومت وغلبہ حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

کوئی شہر بھی ایسا نہیں ہے جہاں کچھ ایسے کام نہ ہوں جو فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہیں اور علماء کو ان کی طرف مطلق التفات نہیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک طلبہ کو ایسے جگہ اکثر اسلامی شہروں میں مسلمان طبیب موجود نہیں جن کی شہادت شرعی امور میں معتبر ہو، علماء اس مشغلہ سے کوئی بچہ نہیں رکھتے، اس طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض کفایہ ہے (لیکن متروک ہو رہا ہے) وہ ایک جگہ عام جہالت و غفلت دین سے ناواقفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور تبلیغ اور عمومی تعلیم کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

اس شخص کے لئے جس کو اپنے دین کی واقعی فکر ہے یہ (تبلیغ و تعلیم) خود ایسا مشغلہ ہے کہ پھر اس نادر وقوع جو دنیا

دوراز کا تفصیلات اور ان علوم میں موثکافی کرنے کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی جو خود فرض کفایہ ہیں۔

امام غزالی محققانہ و مورخانہ حیثیت سے اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ اختلافی مسائل نے پچھلے دور میں کیوں اس قدر اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لی، اور علماء نے اس کو اپنی ذہانتوں اور محنتوں کا میدان بنا لیا، اور ان کی بہترین توجہات اس میں صرف ہونے لگیں، امام غزالی کے نزدیک اس کے کچھ تاریخی اسباب ہیں، اور ان کے نتیجے میں ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:-

ہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین حضرات خلفائے راشدین خود بڑے عالم فقہ اور صاحب فتویٰ تھے ان کو شاذ و نادر کسی خاص موقع پر دوسرے اہل علم صحابہ سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی تھی، اس لئے علماء صحابہ علوم آخرت کے لئے فارغ اور ان میں منہک تھے، اگر کوئی فتویٰ کا موقع پیش آتا، تو وہ ایک دوسرے پر محمول کرتے اور بہترین متوجہ الی الشرع تھے جیسا کہ ان کے حالات میں منقول ہے، جب ان لوگوں کی نوبت آتی جو خلافت کا استحقاق اور قابلیت نہیں رکھتے تھے، اور ان میں خود فیصلہ کرنے اور فتویٰ دینے کی صلاحیت نہیں تھی تو ان کو مجبوراً دوسرے علماء سے مدد لینا پڑی اور ان کو ساتھ رکھنا پڑا، تاکہ ان سے وہ فتویٰ حاصل کرتے رہیں، علماء تابعین میں ابھی ایسے لوگ زندہ تھے جو قدیم روش پر تھے، اور جن میں دین کی حقیقت اور سلف کی شان تھی، جب ان کو بلا یا جاتا تو وہ گریز کرتے، اور اعراض کرتے، خلفاء (بنی امیہ و بنی عباس) کو ان کو تلاش کرنا پڑتا، اور عہدہ قضا اور حکومت کے لئے ان سے اصرار کرنے کی کوشش پیش آتی، ان کے زمانہ کے لوگوں نے جب علماء کی یہ شان، سلاطین و حکام کا ایسا رجوع اور اہل علم کا یہ استنثار اور بے پرواہی دیکھی تو وہ سمجھے کہ حصول جاہ و عزت کے لئے فقہ کا علم بہترین نسخہ ہے، اسی سے حکام کا تقرب اور قضا و افتاء کا منصب حاصل ہوتا ہے، پس وہ اسی طرت متوجہ ہو گئے، انھوں نے حکام کے سامنے خود اپنی پیشکش کی اور



ان سے مراسم پیدا کئے، اور عہدوں اور انعامات کے خود امیدوار بنے، بعض کو تو کچھ ہاتھ نہ آیا، بعض کامیاب ہوئے، جو کامیاب بھی ہوئے وہ امیدواری کی ذلت سے محفوظ نہیں رہے اور ان کو اپنے مقام سے نیچے اترنا اور عیاشانہ اور مبتذل سلطے پر آنا پڑا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء جو پہلے مطلوب تھے اب طالب بن گئے پہلے حکام سے استغناء اور اعراض کی وجہ سے سوز تھے اب ان کی طرف توجہ ہونے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو گئے، البتہ اس کلیہ سے ہر دو میں کچھ الشرح کے بندے مستثنیٰ رہے ہیں۔

ان زمانوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور توجہ احکام اور فتاویٰ کی طرف تھی اور انتظامات اور مقدمات کے سلسلے میں ان کی ضرورت بھی زیادہ تھی اس کے بعد بعض رؤسا و حکام کو اصول و عقائد سے کھپسی پیدا ہوئی اور اس کا شوق ہوا کہ ہر فرقے کے دلائل و مباحث سنیں اور ان کا بحث و مباحثہ دیکھیں، لوگوں کو ان رؤسا و حکام کے اس ذوق کا علم ہوا تو وہ علم کلام کی طرف رجوع ہوئے، مصنفین نے اس موضوع پر بہ کثرت تصنیفات کیں اور مناظرے کے اصول و قواعد کو مرتب کیا، اور رد و قدح کو ایک فن بنا دیا، ان لوگوں کا یہ بیان تھا کہ ان کا مقصود دین کی طرف سے مدافعت و جواب ہی سنت کی نصرت اور بدعت کی تردید و مخالفت ہے، ٹھیک جیسے ان لوگوں کے پہلے کے لوگ یہ کہتے تھے کہ فتاویٰ میں مشغولیت سے مقصود محض دین خدمت، خلق اور بندگان خدا پر شفقت اور خیر خواہی ہے اس کے بعد کچھ رؤسا و حکام ایسے ہوئے، جو علم کلام و مناظرہ کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس سے تعصب، جنگ و جدال اور بعض اوقات خوزیری و فساد کی نوبت آجاتی ہے، ان کو فقہی بحث و مناظرہ سے رغبت تھی، اور اس تہن کا شوق تھا کہ خصوصیت کے ساتھ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی میں سے کس کا مذہب زیادہ صحیح ہے، لوگوں نے دیکھ کر کلام و عقائد کو بالائے طاق رکھ دیا، اور اخلاقی مسائل یا خصوصاً امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کو موضوع سخن بنایا، اور امام مالک، امام سفیان ثوری اور امام احمد و غیرہ کے مذاہب و اختلافات کو نظر انداز کر دیا (اس لئے کہ ان کے اختلافات سے حکام کو کھپسی نہ تھی) ان کا کہنا تھا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کی پارکیوں کو

ظاہر کریں، مذاہب کے وجوہ و اسباب کو بیان کریں، اور فتاویٰ کے اصول کو مرتب و مدون کریں، انھوں نے اس میں کثرت سے تصنیفات کیں، اور استنباطات کئے، اور مجادلہ اور تصنیف کے فن کو ترقی دی، اور مشغلہ ابھی تک جاری ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کیا دکھائے گا، اور اس میں کیا تغیر ہوگا تو دراصل اختلافی مسائل اور مناظرہ سے علماء کی دلچسپی اور ان کے انہماک کا سبب یہ ہے جو ہم نے بیان کیا، اگر اہل دنیا اور ارباب اقتدار کو (امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے علاوہ) کسی اور امام یا (اختلافی مسائل و مناظرہ کے علاوہ) کسی اور علم سے دلچسپی ہو جائے تو علماء بھی اسی کی طرف جھک پڑیں گے، اور اس کی وجہ یہی بیان کریں گے کہ ان کا مقصد علم دین اور قربت خداوندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔<sup>۱۵</sup>

اس کے بعد امام غزالی نے تفصیل کے ساتھ مناظرہ اور بحث و مجادلہ کے اخلاقی و روحانی نقصانات و مفاسد اور اس کے شرور و آفات بیان کئے، وہ عرصہ تک اس میدان کے شہسوار رہ چکے تھے، اس لئے اس سلسلے میں ان کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، اور مشاہدات اور ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔<sup>۱۶</sup> اس سلسلے میں ایک بڑا معاملہ الفاظ کا تھا، امام غزالی کے زمانہ کے علوم مروجہ اور ان کی بگڑی ہوئی شکلوں کے لئے جو الفاظ عنوان کا کام دیتے تھے، وہ قدیم الفاظ تھے، جو قرآن و حدیث، صحابہ کے کلام اور علماء سلف کی سیرتوں میں بہ کثرت آتے ہیں، مثلاً اختلافی مسائل فقہ کی نادر الوقوع جزئیات اور باریکیوں کے لئے بے تکلف "فقہ" کا لفظ استعمال ہوتا تھا، ہر طرح کے علمی اشغال اور شرعی و غیر شرعی علم کے لئے مطلق علم کا لفظ بولا جاتا تھا، علم کلام اور اس کے فلسفیانہ مباحث کو "توحید" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بے سرو پا روایات و سطحیات اور عبارات آرائی و رنگین بیانی کو "تذکیر" کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، ہر طرح کے نامانوس مضامین اور پیچیدہ عبارات کو "حکمت" کا خطاب یا جاتا تھا، اور پھر ان سب خود ساختہ اعمال و اشغال پر وہ سب فضائل چسپاں کئے جاتے تھے، جو قرآن و حدیث میں ان علوم کی حقیقتوں کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں، مثلاً فقہ

کی اس بگڑی ہوئی شکل (محض اختلافات و جزئیات کے لئے) قرآن مجید کی آیت لیتفقہوا فی الدین اور حدیث من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین، فلسفہ اور پانچویں صدی کے علم کلام کے لئے وَمَنْ یُؤْتِ الْحِکْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا کَثِيرًا کی بشارت، جاہل اور ناخدا ترس اعظوں کے عامیانه مواضع کے لئے فَذَکَرْنَا مَآ اَنْتَ مَذْکُورٌ اور دوسری آیات و احادیث منطبق کی جاتی تھیں، امام غزالی نے اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا اور تفصیل سے بتلایا کہ یہ الفاظ اپنی اصل حقیقت کھو چکے ہیں اور اپنے اصل مفہوم سے دور ہوتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں، قرون اولیٰ میں ان کا جو مفہوم تھا، اس سے علماء کے ان موجودہ مشاغل کو کوئی مناسبت نہیں ان کی ریجٹ الفاظ کے سفر کی ایک کچھپ رو داد اور اصطلاحات اور عنوانات کے تغیر کی ایک سبق آموز تالیف ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ ہے، جو علمی اور دینی حلقوں میں اس وقت بھیاں ہوئی تھیں۔

## حکام و سلاطین

دوسرا جو امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار تھا، وہ اہل حکومت اور سلاطین و امراء کا طبقہ تھا، امام غزالی سے دو سو برس پہلے حضرت عبدالشراہن مبارک نے انہی دونوں (علماء و سلاطین) کے گروہوں کو دین بگاڑنے والا قرار دیا تھا۔

وهل آفسد الدین الا الملوک و اعیار سوء و ساداتها

امام غزالی نے ایک ایسے زمانہ میں کہ بادشاہ مطلق العنان اور ہر طرح کے قوانین و ضوابط سے بالاتر تھے، اور ان پر اعتراض کرنا موت کو پیام دینا تھا، اس طبقہ کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا، اور ان پر آزادانہ تنقید کی، ان کے زمانہ میں بادشاہوں کے عطیوں اور پیشکشوں کو قبول کرنے کا عام رواج

لہ چنانچہ فلسفہ کی درسی کتابوں پر حتیٰ کہ طب کی بعض بعض کتابوں کے سرورق پر اب بھی یہ آیت نظر آتی ہے۔

لہ ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین۔ بیان ما یدل من الفاظ العلوم۔ ج ۱ ص ۲۲۱

تھا، امام غزالی نے اموالِ سلاطین کو ناجائز اور بالعموم مشتبہہ اور حرام بتلایا۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

اغلب اموال السلاطین حرام فی  
ہذہ الاعصار والجلال فی ایدیہم  
معدوم او عزیز<sup>۱</sup>  
سے ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

ان اموال السلاطین فی عصرنا حرام  
کلھا واكثرھا وکیف لا والحلال  
هو الصدقات والفقی والغنیمۃ ولا  
وجود لها ولسی یدخل منھا فی ید السلاطین  
ولم یبق الا الجزیۃ وانھا تؤخذ بالذواع  
من الظلم لا یمل اخذھا بہ فانہم مجازون  
حدود الشرع فی الماخوذ والماخوذ منہ  
والوفاء لہ بالشرط ثم اذ انب ذالک  
الی ما ینصب الیہم من الخراج المضروب  
علی المسلمین ومن المصادرات والرتا  
صنوف الظلم لم ینبع عشر محشاة  
عشیرة<sup>۲</sup>

سلاطین کے مال ہمارے زمانہ میں یا تو سب حرام ہیں  
یا ان میں کا بڑا حصہ اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ  
حلال میں زکوٰۃ دینے اور مال غنیمت کی ہیں اور ان کا  
کہیں جو نہیں اور ان میں سے کوئی چیز بادشاہ تک پہنچنے  
نہیں پاتی، دے کے صرف جزیہ کی مدد اور اس کا حال  
یہ ہے کہ وہ مختلف ظالمانہ طریقوں کے وصول کیا جاتا ہے  
جن سے اس کا وصول کرنا جائز ہی نہیں مال سلطنت  
حد و شریعت سے تجاوز کرتے ہیں، مال کی مقدار میں شریعت  
کا کچھ پاس کیا جاتا ہے، نزدیکی جن سے وصول کیا جاتا ہے  
اس بارہ میں شریعت کے احکام کا خیال کیا جاتا ہے، ناس کے  
شرائط پورے کئے جاتے ہیں پھر مسلمانوں پر مقرر شدہ خراج  
مالوں اور جائیدادوں کی ضبطی رشوت اور الزام و اقسام  
کے ظلم سے ان پر سونے چاندی کی ہویا رش ہوتی ہے، اس کو

اس جزیہ کو بھی کوئی نسبت نہیں۔

امام غزالی اس سے ترقی کر کے یہاں تک لکھتے ہیں کہ سلاطین وقت سے ان رقوم کا قبول کرنا بھی مناسب نہیں جن کے متعلق تحقیق یا گمان غالب ہے کہ وہ مشتبہ اور ناجائز نہیں ہیں اس لئے کہ اس میں بکثرت دینی مفاسد ہیں، اس موقع پر گذشتہ عہد کی مثالیں دی جاسکتی تھیں کہ سلف میں بعض علماء و صلحاء نے اپنے زمانہ کے خلفاء و سلاطین کی پیشکش بعض اوقات قبول کی ہیں، امام غزالی اس عہد کے ملوک و سلاطین اور ان دونوں زمانوں کے حالات کا فرق بیان کرتے ہیں:-

• دور اول کے ظالم سلاطین خلفاء راشدین کے عہد کے قرب کی وجہ سے اپنے ظالمانہ رویہ کا احساس رکھتے تھے، اور ان کو صحابہ و تابعین کی دیکھنی اور استقامت کا خیال رہا کرتا تھا، اور اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ وہ کسی طرح ان کے عطیے اور انعامات قبول کر لیں، وہ ان کے پاس یہ قمیص اور نذرانے بغیر ان کی طلب کے اور ان کی شان اور مرتبہ پر حوت آئے بغیر ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے، بلکہ ان کے قبول کر لینے پر ان کے احسان مند ہوتے تھے، اور سرت کا اظہار کرتے تھے، وہ حضرات بھی ان چیزوں کو لے کر تقسیم کر دیا کرتے تھے، وہ سلاطین کی اغراض میں ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے، نہ ان سے ملاقات کرنے آتے تھے، نہ ان کے ساتھ اجتماع کو پسند کرتے تھے، نہ ان کو ان کی درازی عمر اور جاہ و اقبال کے باقی رہنے کی خواہش تھی، بلکہ وہ ایسے ظالموں کے لئے بد دعا کرتے تھے، ان کے بارہ میں آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے، اور ان کے منہ پر ان کے خلاف شرع امور پر ٹوک دیا کرتے تھے، اور تردید کرتے تھے، اس لئے اس کا خطرہ نہ تھا کہ جتنا ان کو سلاطین سے فائدہ پہنچا ہے اتنا ہی ان کو سلاطین کے اس تعلق سے دینی نقصان پہنچے گا، اس لئے ان کے قبول کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

لیکن اس کے برعکس آج سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں جن کے متعلق ان کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ ان سے کام لے سکیں گے، ان سے ان کو سہارا حاصل ہوگا، وہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے، ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی، اور وہ ہمیشہ دعا گوئی، ثنا خوانی اور

حاضر وغائب ان کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے اس سلسلے میں پہلا درجہ سوال کی ذلت کا ہے دوسرا خدمت کے لئے آمد و رفت کا، تیسرا تعریف و دعا گوئی کا، چوتھا یہ کہ ضرورت کے وقت ان کے اعراض میں ان کی مدد کی جائے، پانچواں حاضر باشی اور دربارداری جلوس کی شرکت، چھٹا اظہار محبت، دوستی اور حریفوں کے مقابلہ میں ان کی امداد و نصرت، ساتواں ان کے ظلم اور ان کے عیوب اور بد اعمالیوں کی پرہیزگاری، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی درجہ کے لئے تیار نہیں ہے، تو خواہ وہ امام شافعی کے مرتبہ کا ہو یا سلاطین ایک پیسہ بھی ان پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے اس لئے اس زمانہ میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ حلال ہے، اس لئے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس مال کا تو کیا ذکر جس کے متعلق معلوم ہے کہ حرام یا مشتبہ ہے، اب اگر کوئی شخص ان سلاطین کے اموال کو جرأت کے ساتھ قبول کرتا ہے، اور صحابہ و تابعین کی مثال دیتا ہے، تو وہ درحقیقت فرشتوں کو لوہاروں پر قیاس کرتا ہے، اس لئے کہ ان کے اموال کو قبول کرنے کے بعد ان سے ملنے جلنے اور اختلاط کی ضرورت پیش آئے گی، ان کا بجا کرنا پڑے گا، ان کے اہلکاروں اور عمال کی خدمت کرنا پڑے گی، اور ان سے دینا اور ان کے سامنے جھکنا گوارا کرنا پڑے گا، پھر ان کی تعریف اور ان کے در پر حاضری دینے سے پیارہ نہیں، اور یہ سب معصیت کی باتیں ہیں۔

جب گذشتہ بیان سے سلاطین کی آمدنی کے ابواب اور اس میں سے حلال و حرام کی... تفصیل معلوم ہوگئی تو اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ انسان شاہی رقوم میں سے اتنا جز قبول کرے جو حلال ہے، اور وہ اس کا حق ہے، اور وہ رقم اس کے پاس گھر بیٹھے آتی ہو، اور کسی حاکم یا ملازم کی تلاش و خدمت اور ان سلاطین و حکام کی تعریف و تصدیق کی ضرورت بھی نہ ہو، اور نہ ان کی امداد و اعانت کی شرط ہو، تو پھر (مسئلہ کے اعتبار سے) ایسی رقم کا قبول کرنا حرام نہیں ہے، لیکن دوسری خرابیوں اور بعد کے نتائج کے لحاظ سے مکروہ ضرور ہے۔

ایک دوسری جگہ سلاطین سے کنارہ کشی اور ان کے افعال و مظالم سے نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں۔

المحالة الثابتة ان يعتزل عنهم فلا يرام  
دوسری حالت یہ ہے کہ انسان ان سلاطین سے الگ

ولا يرونه وهو الواجب والسلامة  
تھلک رہے کہ ان کا سامنا ہی نہ ہونے پائے اور یہ وہاں

فيه فحليه ان يعتقد بغضهم على  
ہے اور اسی میں حفاظت سے انسان کو ان کے مظالم کی بنا

ظلمهم ولا يحب بقائهم ولا يثني  
پر ان سے بغض کا اعتقاد رکھنا چاہئے وہ نہ ان کی

عليهم فلا يستخبر عن احوالهم ولا يتقرب  
زندگی کا خواہشمند ہو نہ ان کی تعریف کئے نہ ان کے

الى المصلين بهم۔  
حالات کی جستجو رکھے نہ ان کے مقربین سے میل جول۔

شخصی سلطنت اور جابر و مستبد بادشاہوں اور خود مختار وزراء و حکام کے اس دور میں کہ جب پوری کی پوری قوم اور اس کے عیش و عشرت سے عیش و عشرت افراد کی زندگی ان کے رحم و کرم پر تھی اور جب شہرہ پر قتل عام ہو سکتا تھا، امام غزالی کی یہ صاف گوئی اور سلطنت کے نظام بالیات آمد و صرف پر یہ کھلی ہوئی تنقید اور علماء کو سلاطین و حکام کے عطیوں کو قبول نہ کرنے کی ترغیب و تبلیغ (جو حکومت سے عدم تعاون اور اظہار ناراضگی یا بے تعلقی کی علامت سمجھی جاتی تھی) ایک چھٹا خاصا جہاد تھا جس کی نزاکت کا اندازہ اخبارات اور تقریروں کی آزادی کے اس عہد اور جمہوری اور دستوری (خواہ برائے نام) دور میں صحیح طور پر نہیں لگایا جاسکتا۔

امام غزالی نے صرف تخریر و تصنیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ جب ان کو بادشاہ وقت سے ملنے کا اتفاق ہوا تو پھر سے دربار میں بھی انھوں نے کلمہ حق بلند کیا، ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر پوپے خراسان کا فرمانراوا تھا، امام غزالی نے ملاقات کے وقت اس سے خطاب کر کے کہا کہ۔

انہوں نے مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی

گردنیں طوقہائے زرین کے بار سے!

محمد بن بلک شاہ کو جو سب سے بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوفِ خدا، اور اصلاحِ ملکی کی طرف متوجہ کیا۔

مشرقی سلطنتوں میں عموماً حکومت کا تمام نظم و نسق چونکہ وزراء کے ہاتھ میں ہوتا تھا، اور وہی دروہست حکومت کے منتظم اور ذمہ دار ہوتے تھے، اس لئے انہی کی اصلاح و توجیہ سے مملکت کی اصلاح ہو سکتی تھی، امام غزالی اس حقیقت سے واقف تھے، اس لئے انھوں نے سلاطین سلجوقیہ سے زیادہ ان کے وزراء کی طرف توجیہ کی، ان کو مفصل خطوط اور ہدایت نامے لکھے، اور بڑی جرأت و صفائی کے ساتھ حکومت کی بدنیوں، حقوق کی پامالی، حکام کی مردم آزاری، اہل کاران دولت کی دولت ستانی، ذمہ داروں کی غفلت کی طرف توجیہ دلائی اور خدا کا خوف دلا کر اور پچھلے وزراء اور صدور حکومت کا انجام یاد دلا کر اصلاح و تنظیم کی طرف متوجہ کیا، ان کے یہ خطوط شخصی جرأت، اظہارِ حق اور تاثیر و قوت، انشاء و تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

فخر الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

• بدایں کہ اس شہر از قحط و ظلم و یران بود و تاخیر تو از اسفرائن و دامنہاں بود ہمہ می ترسیدند و ہتھانان  
از بیم غلہ می فروختند و ظالمان از مظلومان عذری خواستند اکتوں کہ اینجا رسیدی ہمہ ہر اس و خوف برقا  
و دہقانان و خبازان بتدبر غلہ دوکان نہادند و ظالمان دلیر گشتند اگر کسی کار این شہر بخلاف این  
شکایت می کند دشمن دین تست، بدایں کہ دعائے مردمان طوس بہ نیکی و بدی مجرب است و عمید را این نصیحت  
بسیار کہ دم نپذیرفت تا حال و عہدت ہمہ گشت بشو این سخنہا بے تلخ یا منفعت از کسی کہ او طح گاہ غمیش را  
بہم سلاطین و داع کردہ است تا این سخن می تواند گفت و قدر این بشناس کہ نہ ہمانا از کسی دیگر شنوی

۱۔ مکتوبات امام غزالی ۱۹۱۱ء لکھے یہ ہدایت نامہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے، اور نصیحت الملوک کے نام سے موسوم ہے

چونکہ محمد شاہ کی زبان فارسی تھی، اس لئے یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔



بدانکہ ہر کس کہ خبر اس می گوید با تو طح وے حجاب است میان او و کلہ ہستی“  
 مجیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”اما فریاد ز سیدن خلقی بر عموم واجب است کہ کار ظلم از حد گذشتہ و بعد از ان کہ من شاہد این حال  
 می بودم قریب یک سال است کہ از طوس ہجرت کردہ ام تا باشد کہ از شاہدہ ظالمان بے رحمت  
 و بے حرمت خلاص یا بم ہوں بحکم ضروری معاودت افتاد ظلم ہچنان متواتر است“  
 پھر وزراء سابقین کا انجام لکھ کر مجیر الدین کو متنبہہ کرتے ہیں:-

”و بحقیقت شناسد کہ ہیچ وزیر بدیں بلا مبتلا نبود کہ وے درد و زکار ہیچ وزیر آن ظلم و خرابی نہ  
 رفت کہ انہوں می رود، و اگر چہ وے کارہ است و لیکن درد خیر چہیں است کہ چون ظالمان را روز قیامت  
 مواخذہ کنند ہم متعلقان را وہم ایشان را بدان ظلم بگیرند، مسلمانان را کار با سخاں رسیدتہ کی گشتہ  
 و ہر دینارے کہ قسمت کردہ اضعاف آن از رحمت بشد و بسطان ترید و در میانہ ارذال عوامان و  
 ظالمان ہر دند“

## مسلمانوں کے دوسرے طبقے

طبقہ اعلیٰ و طبقہ اسلاطین و حکام کے علاوہ انہوں نے عام زندگی کا بھی جائزہ لیا ہے اس میں جس قدر  
 غیر دینی عناصر بدعات و منکرات، مغالطے اور خود فریبیاں داخل ہو گئی ہیں ان کی تنقید کی ہے، احیاء العلوم  
 کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال اور عالمانہ زندگی کے باوجود وہ اس وقت کی سوسائٹی اور  
 عام زندگی سے واقف ہیں اور ان کا زندگی کا مطالعہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے انہوں نے مسلمانوں کی عمومی  
 زندگی اور امت کے مختلف طبقات اور ان کی مختلف بیماریاں اور کمزوریوں کی جو نشاندہی کی ہے اس سے  
 ان کی قوت مشاہدہ اور قوت نظر کا اندازہ ہوتا ہے انہوں نے ایک مستقل باب ان منکرات کی تفصیل میں

لکھا ہے، جو عادات میں داخل ہو چکے ہیں اور لوگوں کو ان کا منکر (خلافِ شرع و اخلاق) ہونا محسوس نہیں ہوتا، اس سلسلہ میں انھوں نے پوری شہری زندگی پر نظر ڈالی ہے اور اس کے نمایاں منکرات کا تذکرہ کیا ہے اور مساجد سے لے کر بازاروں، سڑکوں، حمام اور دعوت کی محفلوں تک کے منکرات کو شمار کر دیا ہے۔

انھوں نے آجیاد العلوم کا ایک مستقل حصہ (کتاب فی الغرور) ان لوگوں کے متعلق لکھا ہے جو مختلف قسم کے مغالطوں اور فریب نفس میں مبتلا ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے ہر طبقہ کے فریب خوردہ اشخاص اور ان کی غلط فہمیوں اور خود فریبیوں کا حال بیان کیا ہے اور ان کے بعض ایسے نفسیاتی امراض اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے، جن کو صرف ایک دقیق النظر مصلح اور ایک تجربہ کار ماہر نفسیات ہی دیکھ سکتا ہے، اس باب میں انھوں نے علماء عباد و زہاد امراء و اعیان اور اہل تصوف سب کا جائزہ لیا ہے اور سب کے خصوصی امراض اور بے اعتدالیوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ہر ایک کے متعلق بڑے پتہ کی باتیں لکھی ہیں، جس سے ان کی ذہانت دقیقہ رسی اور حقیقت شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے زمانہ کے علمائے جن جن علوم کے اشتغال میں حد سے تجاوز کر رکھا تھا، مثلاً فقہی جزئیات و خلافیات علم کلام و مباحثہ و مجادلہ و عطا و تذکیر، علم حدیث اور اس کے متعلقات نحو، لغت، شعر و مفردات کی تحقیق و حفظ میں غلو و مبالغہ اور زاہدوں کے ملفوظات و حالات کے یاد رکھنے پر اکتفا، اس سب پر انھوں نے تنقید کی اور ان کو اپنے ان مضامین کے بارہ میں جو غلط فہمی اور خوش گمانی تھی، اس کی تحقیق کی اور حقیقت حال بیان کی اور آخر میں اپنا یہ تجربہ بیان کیا، جو بالکل قرن قیاس ہے کہ دنیاوی علوم مثلاً طب و حساب اور صنعتوں کے علم میں اس قدر خوش گمانی اور خود فریبی نہیں ہے جتنی علوم شرعیہ میں ہے، اس لئے کہ کسی شخص کا یہ خیال نہیں ہے کہ دنیاوی علوم فی نفسہ ذریعہ مغفرت ہیں، بخلاف علوم شرعیہ کے کہ وہ اپنے نتائج و مقاصد سے قطع نظر کر کے بجائے خود بھی ذریعہ مغفرت و تقرب سمجھے جاتے ہیں، اپنے زمانہ کے عباد و زہاد اور اہل تصوف

کو بھی انھوں نے بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور ان کی بڑی باریک باریک کوتاہیوں، خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کو محسوس کیا ہے ان کے بہت سے ظاہری اعمال و رسوم کی تہ میں ان کو نفس پرستی، جاہ طلبی، ریاکاری، ظاہری نقالی اور بے روح رسمیت نظر آئی ہے اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ اس کو ظاہر کر دیا۔ اہل دولت اور اغنیاء پر بھی انھوں نے بڑی صحیح گرفت کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے قلم سے حقائق نکل گئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں:-

ان دولت مندوں میں بہت سے لوگوں کو حج پر روپیہ صرف کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے وہ بار بار حج کرنے میں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھوکا پھوڑ دیتے ہیں اور حج کرنے چلے جاتے ہیں، حضرت عبدالشہین مسعود نے صحیح فرمایا ہے کہ اخیر زمانہ میں بلا ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہوگی، سفر ان کو بہت آسان معلوم ہوگا، روپیہ کی ان کے پاس کمی نہ ہوگی، وہ حج سے محروم وہی دست واپس آئیں گے، وہ خود ریتوں اور چٹیل میدانوں کے درمیان سفر کرتے ہوں گے، اور ان کا ہمسایہ ان کے پہلو میں گرفتار بلا ہوگا، اس کے ساتھ کوئی سلوک اور غمخواری نہیں کریں گے۔

ابونصر تارکیتے ہیں کہ ایک شخص بشرین الحارث کے پاس آئے اور کہا کہ میرا قصد حج کا ہے، آپ کا کچھ کام ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تم نے خرچ کے لئے کیا رکھا ہے؟ اس نے کہا دو ہزار درہم بشرین نے کہا کہ تمہارا حج سے مقصد کیا ہے؟ اظہار زہد یا شوق کعبہ یا طلب رضا، اس نے کہا طلب رضا انھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر میں تمہیں ایسی تدبیر بتلا دوں کہ تم گھر بیٹھے اللہ کی رضا حاصل کر لو، اور تم یہ دو ہزار درہم خرچ کر دو، اور تم کو یقین ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہوگی تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا بخوشی فرمایا کہ اچھا پھر جاؤ، اس مال کو ایسے دس آدمیوں کو دے دو جو مقروض ہیں، وہ اس سے اپنا قرض ادا کر دیں، فقیر اپنی حالت درست کرے، صاحب عیال اپنے بال بچوں کا سامان کرے، یتیم کا منتظم یتیم کو کچھ دے کہ اس کا دل خوش کرے اور

اگر تمہاری طبیعت گوارا کرے تو ایک ہی کو پورا مال دے دو اس لئے کہ مسلمان کے دل کو خوش کرنا، بیکس کی امداد کسی کی مصیبت دور کرنا، کمزور کی اعانت سونفلی جوں سے افضل ہے، جاؤ جیسا میں تم سے کہا ہے ویسا ہی کر کے آؤ ورنہ اپنے دل کی بات ہم سے کہہ دو اس نے کہا کہ شیخ سچی بات یہ ہے کہ سفر کار حجان غالب ہے، بشر سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ مال جب گندہ اور شتبہہ ہوتا ہے تو نفس تقاضا کرتا ہے، کہ اس سے اس کی خواہش پوری کی جائے اور وہ اس وقت اعمال صالحہ کو سامنے لاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد فرمایا ہے کہ صرف متقین کے عمل کو قبول فرمائے گا۔

دولت مندوں کا ایک گروہ بر بنائے نخل دولت کی حفاظت میں مشغول رہتا ہے، اور ایسی بدنی عبادت سے اس کو بچسپا ہوتی ہے جس میں کچھ خرچ نہیں، مثلاً دن کا روزہ، رات کی عبادت اور تم قرآن وہ بھی قریب میں بتلا ہیں، اس لئے کہ مہلک نخل ان کے باطن پر ستولی ہے، اور اس کے ازالہ کے لئے مال کے خرچ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن وہ ایسے اعمال میں مشغول ہیں، جس کی ان کو کوئی خاص ضرورت نہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کے کپڑے کے اندر سانپ گھس گیا ہے، اور اس کا کام تمام ہوتے والا ہے، اور وہ سکنجبین کے تیار کرنے میں مشغول ہے، تاکہ صفر کو نکسین ہو، حالانکہ جو سانپ کا مارا ہے، اس کو سکنجبین کی ضرورت کب پڑے گی؟ بشر سے کسی نے کہا کہ فلاں دولت مند کثرت سے روزہ رکھتا ہے، اور نمازیں پڑھتا ہے، انھوں نے فرمایا کہ بیچارہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں مشغول ہے، اس کے مناسب حال تو یہ تھا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا، مساکین پر خرچ کرتا، یہ اس سے افضل تھا کہ اپنے نفس کو بھوکا رکھتا ہے اور اپنے لئے (نفل) نمازیں پڑھتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دنیا بھی سمیٹنے میں مشغول ہے، اور فقیر کو محروم رکھتا ہے۔

عوام کے امراض اور خود فریبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عوام دولت مندوں اور فقرا میں سے کچھ لوگ ہیں جن کو مجالس و عطا کی شرکت سے دھوکا لگا ہے،  
 ان کا اعتقاد ہے کہ محض ان مجالس میں شرکت کافی ہے، انھوں نے اس کو ایک معمول بنا لیا ہے، وہ سمجھتے  
 ہیں کہ عمل اور نصیحت پذیری کے بغیر بھی محض مجالس و عطا میں شرکت باعث اجر ہے، وہ بڑے دھوکہ میں مبتلا  
 ہیں، اس لئے کہ مجالس و عطا کی فضیلت محض اس لئے ہے کہ اس سے خیر کی ترغیب ہوتی ہے، اگر اس سے خیر کی  
 آادگی اور اس کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تو اس میں کچھ خیر نہیں، رغبت بھی اس لئے محمود ہے کہ وہ عمل کی  
 محرک ہے، اگر اس میں عمل پر آمادہ کرنے کی قوت نہیں تو اس میں بھی کوئی خیر نہیں، جو چیز کسی مقصد کا ذریعہ  
 ہوتی ہے اس کی قیمت محض مقصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو تو وہ بے قیمت  
 ہے، کبھی واعظ سے مجالس و عطا اور گریہ و بکا کی فضیلتیں سن کر اس کا دھوکا ہوتا ہے، کبھی کبھی اس پر  
 عورتوں کی طرح ایسی رقت طاری ہوتی ہے، اور وہ رونے لگتا ہے، لیکن عزم کا کہیں پتہ نہیں  
 ہوتا، کبھی کبھی کوئی ڈرانے والی بات سنتا ہے اور وہ تالیاں پیٹتا ہے، اور کہتا ہے، 'اللہ تو بہ اذیاء  
 نیری پناہ، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا، حالانکہ وہ دھوکہ میں ہے، اس کی مثال اس  
 مریض کی سی ہے، جو کسی طبی کے مطب میں بیٹھتا ہے اور نسخے سنتا رہتا ہے، لیکن اس سے اس کو  
 صحت نہیں ہو سکتی، یا ایک بھوکا آدمی کسی سے کھانے کے انواع و اقسام کی فہرست سنتا ہے، اس سے  
 اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی، اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا، اسی طرح سے طاعات و اعمال کی تشریح  
 و تفصیل کا سنتے رہنا اللہ کے یہاں کچھ کام نہیں آئے گا، اسی طرح سے ہر وعظ جو تمہاری حالت میں ایسا  
 تغیر نہ پیدا کرے جس سے تمہارے اعمال میں تغیر ہو جائے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف اتنا ثابت اور  
 رجوع (قوی ہو یا ضعیف) پیدا ہو، اور دنیا سے بے رغبتی اور اعراض پیدا ہو وہ وعظ تمہارے لئے وبال  
 اور تمہارے خلاف ایک دلیل کا کام دے گا، اگر تم خالی خالی وعظ کو وسیلہ نجات اور ذریعہ مغفرت سمجھتے ہو، دھوکہ میں  
 ہے۔"

## ایک اصلاحی و تربیتی کتاب

لیکن احیاء العلوم نری تنقیدی کتاب نہیں ہے، وہ اصلاح و تربیت کی ایک جامع اور مفصل کتاب ہے، اس کے مصنف نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کی کوشش کی ہے، جو ایک طالب حق کے لئے اپنی اصلاح و تربیت اور دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کے لئے تنہا کافی ہو سکے اور بڑی حد تک ایک وسیع اسلامی کتب خانہ کی قائم مقامی کر سکے اور دینی زندگی کا دستور العمل بن سکے، اس لئے یہ کتاب عقائد و فقہ، تزکیہ نفس و تہذیب اخلاق اور حصول کیفیت احسانی (جس کے مجموعہ کا نام تصوف ہے) تینوں شعبوں کی جامع ہے اس کتاب کی ایک نمایاں صفت اس کی تاثیر ہے، مولانا شبلی کے اس تاثر میں ہزاروں پڑھنے والے شریک ہوں گے کہ احیاء العلوم میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے ہر فقرہ شکر کی طرح دل میں چھب جاتا ہے، ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی، خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے، مصنف کے ان حالات و کیفیات کا (جو اس سفر اور کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ان پر طاری تھیں) اور جن سے یہ کتاب متاثر ہوئی ہے، پڑھنے والوں پر بعض اوقات یہ اثر پڑتا ہے کہ دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو جاتا ہے، زہد و تقشف کا ایک شدید اور بعض اوقات غیر معتدل رجحان پیدا ہوتا ہے، خوں و ہیبت کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو کبھی کبھی صحت و مشاغل پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ خود مصنف پر اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہیبت کا غلبہ تھا، اس لئے بہت سے مشائخ مبتدیل کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ نہیں دیتے، اعتدال کامل اور توازن صحیح تو صرف سیرت نبوی اور احادیث

لے امام غزالی چونکہ شافعی ہیں اور فقہ شافعی کا اس زمانہ میں زور بھی تھا، اس لئے اس کتاب میں انھوں نے فقہ شافعی ہی کو

کے مجموعہ کے مطالعہ اور کسی نمونہ کمال کی صحبت و تربیت ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

## احیاء العلوم اور فلسفہ اخلاق

امام غزالی صرف ایک بلند پایہ فقیہ، ایک صاحب جہاد متکلم اور ایک صاحب دل صوفی نہیں ہیں، اخلاقیات اسلامی اور فلسفہ اخلاق کے ایک نامور مصنف اور ایک دقیق النظر اور نکتہ رس ماہر اخلاق و نفسیات بھی ہیں، اخلاق اسلامی اور فلسفہ اخلاق کی کوئی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، احیاء العلوم اس موضوع پر بھی ان کا ایک کارنامہ ہے، امراض قلب اور کیفیات نفسانی پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی دقت نظر اور سلامت فکر کا نمونہ ہے، یہاں اس کا بھی ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

## حب جاہ

احیاء العلوم میں "بیان سبب کون الجاہ محبوباً بالطبع حتی لا یخلو عنہ قلب لا یشدید المجاہدۃ" (جاہ انسان کو کیوں طبعی طور پر محبوب ہے، یہاں تک کہ شدید مجاہدہ کے کسی قلب کا بھی اس سے خالی ہونا مشکل ہے) کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہئے کہ جس بنا پر سونا چاندی اور مال کی بقیہ اقسام محبوب ہیں، بعینہ اسی بنا پر جاہ بھی محبوب ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سونا چاندی سے زیادہ محبوب ہے، خواہ وہ مقدار میں برابر ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح جاہ کو مال پر فوقیت حاصل ہونا چاہئے، یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ درہم و دینار کی ذات میں کوئی کشش اور معنویت نہیں، اس لئے نہ وہ کھانے کے کام کے ہیں، نہ پینے کے، نہ شادی بیاہ کے، نہ پوشاک و لباس کے، نہ اپنی

لے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ استاد جامعہ القاہرہ کی تصنیفات "تاریخ الاخلاق" اور "فلسفۃ الاخلاق"

وصلاتھا بالفلسفۃ الغریقیۃ

ذات کے لحاظ سے تو وہ اور زکیاں برابر ہی ہیں، لیکن ان دونوں میں کشتش اور محبوبیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ محبوبیت کا ذریعہ اور خواہشات کی تکمیل کا سامان ہیں، یہی معاملہ جاہ کا ہے، اس لئے کہ جاہ دلوں کی تسخیر کا نام ہے اور جس طرح سے سونے چاندی کی ملکیت ایسی قدرت عطا کرتی ہے جس سے انسان اپنے تمام اغراض و مقاصد تک پہنچ سکتا ہے، اسی طرح سے بندگانِ خدا کے قلوب کی تسخیر تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر سونا چاندی اور جاہ انسان کو محبوب ہے۔

لیکن محبوبیت میں شریک ہونے کے ساتھ جاہ کو مال پر کئی وجوہ سے ترجیح حاصل ہے اور اس کی محبوبیت مال کی محبوبیت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اس کے تین نمایاں اسباب ہیں، پہلا سبب تو یہ ہے کہ جاہ کے ذریعہ سے مال تک پہنچنا، مال کے ذریعہ سے جاہ تک پہنچنے کے مقابلہ میں آسان ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عالم یا زاہد جس کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بٹھا ہوا ہے، اگر مال حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں اس لئے کہ لوگوں کے مال و دولت ان لوگوں کے دلوں کے تابع ہوتے ہیں، اب اگر ان کے دل کسی کے تابع ہو جائیں تو ان کے مال بھی اسی کے تابع ہو جائیں گے، اور وہ اپنی دولت بھی اسی کے قدموں پر تشار کر دیں گے، اس کے برخلاف ایک کم مرتبہ اور ذلیل آدمی جس میں کمال کی کوئی صفت نہیں ہے، اگر اس کو کوئی خزانہ بھی مل جائے اور اس کو وہ جاہ حاصل نہیں ہے، جس سے وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے، اگر اس مال کے ذریعہ جاہ تک پہنچنا چاہے گا تو نہیں پہنچ سکے گا، اس لئے کہ جاہ مال کا آلہ اور وسیلہ ہے، جو جاہ کا مالک ہے، وہ باسانی مال کا بھی مالک بن سکتا ہے، لیکن جو مال کا مالک ہے، وہ ہر حالت میں جاہ کا مالک نہیں بن سکتا، اس لئے جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مال کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی آزمائش میں آجائے، پوری یا غصب کے ذریعہ تلف ہو جائے، بادشاہ اور ظالم بھی اس کی تباہی لگے رہتے ہیں، یوں بھی اس کو محافظوں، پہرہ داروں اور محفوظانہ قوتوں کی ضرورت ہے، پھر بھی اس کے لئے ہزار خطرے ہیں، لیکن دل جب کسی کا غلام بن جائے



توان کے لئے کوئی آفت نہیں وہ دراصل محفوظ خزانے ہیں جو چوروں غارت گروں اور غاصبین کی دست رس سے باہر ہیں ملکیتوں میں سب محفوظ ملکیت زمین اور جائیداد ہے، لیکن اس میں بھی خاصانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا خطرہ ہے اور پھرہ اور حفاظت کی اس کو بھی ضرورت ہے، لیکن دلوں کے خزانے خود ہی محفوظ و مامون ہیں اور جاہ کو کسی غصب و سرقت کا خطرہ نہیں، ہاں دلوں پر بھی تھوڑا بہت تصرف کیا جاسکتا ہے اور جس سے عقیدت مندی ہے، اس کی طرف سے اعتقاد پھیرا جاسکتا ہے اور بدگمانی پیدا کی جاسکتی ہے، لیکن اس کا ازالہ مشکل نہیں اور ایسا عمل ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی ملکیت میں از دیار دنو اور اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے لئے کسی محنت و جفاکشی کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ قلوب جب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے حلقہ بگوش اور معتقد ہو جاتے ہیں تو زبانیں اس کے کلمات کا کلمہ پڑھنے لگتی ہیں، لوگوں و سروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور نئے نئے دل اس کے مفتوح ہوتے جاتے ہیں، اسی بنا پر انسان طبعی طور پر شہرت اور ناموری کا دلدادہ ہے، اس لئے کہ جب اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتا ہے، نئے نئے دل تکرار ہوتے ہیں اور اس کے حلقہ بگوش بنتے ہیں، اسی طرح اس کی محبت و عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی اور بڑھتی رہتی ہے، اور کہیں جا کر کئی نہیں، برخلاف مال کے کہ جو جتنی مقدار کا مالک ہے، اس کا مالک ہے، اس میں بغیر محنت اور جانفشانی کے اضافہ نہیں ہو سکتا، لیکن جاہ خود بخود نمود پذیر ہے اور اس کی کوئی حد نہیں، مال میں ٹھہراؤ اور وقوف ہے، جاہ پھلتا پھولتا رہتا ہے، اسی لئے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے، اور شہرت عام حاصل ہو جاتی ہے، اور لوگ کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں، تو مال دولت اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتا ہے، یہ تو مال کی جاہ پر ترجیح کے نمایاں اسباب ہیں، اگر تفصیل کی جائے تو اور بہت سے وجوہ نکلیں گے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ ہے کہ انسان کو مال و جاہ سے اسی قدر محبت ہونی

چاہئے کہ ان کے ذریعہ لذتیں حاصل کر کے اور کلفتیں دور کر دے، اس لئے کہ مال و جاہ محبوباً کا ذریعہ ہیں اور محبوبات کے حصول کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ بات یہیں جا کر نہیں رکتی اور انسان انموال کے جمع کرنے، خزانہ پر خزانہ اور ذخیرہ پر ذخیرہ کرنے میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ضروریات کی سرحد کو بھی پار کر جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہو جاتا ہے (جو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے) کہ اگر بندے کے پاس سونے کی دو گھاٹیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہشمند ہوگا اسی طرح سے انسان جاہ میں وسعت و ترقی کی فکر میں رہتا ہے، اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت ان دور دراز ملکوں تک بھی پہنچ جائے، جن کے متعلق وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ ان ملکوں میں کبھی قدم بھی نہیں رکھے گا، اور کبھی وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کی بھی امید نہیں کہ ان کی تعظیم سے اس کو خوشی حاصل ہوگی یا وہ اپنی دولت اس پر خرچ کریں گے، یا اس کی غرض برآری کریں گے، یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو اس بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے، اور دل میں اس کا مزہ لیتا رہتا ہے کہ اس کا ان ملکوں میں چرچا ہو، اور اس کو وہاں جاہ حاصل ہو، بظاہر یہ ایک حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز کی خواہش ہے جس کا دنیا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی جاہ کی ایسی محبت دلوں کی ایک عمومی کیفیت ہے، جس کا ازالہ ممکن نہیں، اس کے دو سبب ہیں، ایک، حلی جس کا ادراک سب کر سکتے ہیں، ایک، نفعی جو بڑا سبب ہے، لیکن اتنا نازک ہے کہ نفعی تو عینی ذکی بھی اس کو بمشکل محسوس کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اس کا تعلق نفس و طبیعت کی ایک ایسی خاصیت ہے جس کا علم باریک بین اور ان اشخاص کو ہے جو طبائع انسانی کی گہرائیوں میں غوطہ کھا سکتے ہیں، پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان فطرۃً محبوب کے بارہ میں بدگمان واقع ہوا ہے، اور خطرات کو دور کرنا چاہتا ہے۔

عشق است و ہزار بدگمانی

انسان کی بسراوقات کے لئے خواہ ضروری سامان موجود ہو، لیکن اس کی آرزوئیں بہت

طویل ہوتی ہیں اس کے دل میں بار بار خطرہ گزرتا ہے، کہ جو مال فی الحال اس کی ضروریات کے لئے کافی ہے شاید تلف ہو جائے اور اس کو دوسرے مال کی ضرورت ہو، جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو اس کے دل میں فکر و غم کا بوش اٹھتا ہے، غلش اس کی چھٹی دور ہو سکتی ہے، جب اس کو دوسرے مال کے مل جانے سے اطمینان حاصل ہو جائے کہ اگر یہ پہلا مال ضائع ہو گیا، یا اس پر کوئی آفت آئی تو یہ دوسرا مال موجود ہے، اپنی ذات سے دلچسپی اور زندگی کی محبت کی بنا پر اپنی زندگی کا بہت طویل اندازہ لگاتا ہے، اور نئی نئی ضرورتوں کے پیش آنے کا حتی رکھتا ہے، اور نئے نئے خطروں اور نئی نئی آفتوں کو فرض کرتا رہتا ہے، اور ان کے تصور سے لرزہ بر اندام رہتا ہے، اس لئے ان خطروں کو زائل کرنے کے وسائل سوچتا رہتا ہے، اور اس کا سب سے بڑا وسیلہ اس کی نظر میں یہ ہے کہ مال اتنا کثیر ہو کہ اگر اس کے کسی حصہ پر کوئی زد پڑے تو دوسرے حصہ سے وہ اپنا کام نکال سکے، یہ خوف اور فکر مندی اس کو مال کی کسی مخصوص مقدار پر قانع نہیں ہونے دیتی، اور وہ کسی حد پر بھی جا کر نہیں ٹھہرتا، یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی ملک بنا لینے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "دو در لیں ایسے ہیں، جو کبھی سیر نہیں ہوتے، علم کا در لیں، اور مال کا در لیں" بعینہ یہی علت دو در راز کے شہروں اور بیگانہ لوگوں کے دلوں میں اعتقاد اور جاہ پیدا ہونے کی خواہش میں ہوتی ہے، حسب جاہ کا در لیں بھی ان خیالی خطرات کو سوچتا رہتا ہے، جو پیش آسکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑے، ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کے شہر میں آجائیں اور اس کو ان سے کام پڑ جائے، اور جب تک یہ سب کچھ ممکن ہے اور یہ کوئی ناممکن الوقوع بات نہیں ہے، کہ اس کو ان کی ضرورت پڑے، نفس کو اس بات کی فرحت و لذت ہوتی ہے کہ اس کا اعتقاد اور عظمت ان بعید الوطن لوگوں کے دل میں قائم ہے، جن سے کبھی کام پڑ سکتا ہے۔

دوسرا سبب جو زیادہ طاقت ور ہے، وہ یہ کہ روح ایک مربانی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے  
 "وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" حکم ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم  
 کاشفہ کے اسرار میں سے ہے، اور اس کے اظہار کی اجازت نہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی  
 حقیقت کا اظہار نہیں فرمایا، لیکن اس کی حقیقت کا علم حاصل کئے بغیر بھی تم کو اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ  
 قلب میں ایک تو ایسی صفات (کھلنے پینے اور جماع) کا میلان پایا جاتا ہے، ایک میلان درندوں کی صفات  
 قتل و ضرب و انڈا کا، اور ایک شیطانی صفات کروفریہ کا اور اسی کے ساتھ ایک میلان صفار بوبیت  
 کبر و عظمت، عزت و تہجد اور سر بلندی کا بھی پایا جاتا ہے، اس لئے کہ قلب انسانی مختلف اصول و عناصر  
 سے مرکب ہے، جن کی شرح و تفصیل میں بڑی طوالت ہے، قلب میں امر ربانی کا جو حصہ ہے، اس کی بنا پر انسان  
 کے اندر طبعی طور پر بوبیت کی خواہش پائی جاتی ہے، بوبیت کیا ہے؟ کمال میں یکتائی اور مستقل وجود جو  
 کسی کا شرمندہ احسان نہ ہو، اس لئے کمال صفات الوہیت میں سے ہے، اور وہ انسان کو بالطبع محبوب ہے  
 اور کمال یہی ہے کہ وجود میں یکتا ہو، اس لئے کہ وجود میں کسی اور کی شرکت یقیناً ایک نقص ہے، آفتاب کا  
 کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے، اگر کوئی دوسرا آفتاب ہوتا، تو یہ اس آفتاب کے چہرہ کمال کے لئے داغ  
 ہوتا، اس لئے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں یکتا نہ ہوتا اور وجود کی یکتائی اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کو حاصل  
 ہے، اس لئے اس کے سامنے کوئی موجود (حقیقی) نہیں، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، وہ اس کی قدرت کا  
 ایک کرشمہ ہے، جو اپنے بل بوتے پر نہیں رہ سکتا، وہ اسی کے سہارے قائم ہے، تو درحقیقت اس کے  
 سامنے کوئی موجود ہی نہیں، اس لئے کہ معیت کے لئے رتبہ کی مساوات ضروری ہے، اور رتبہ کی مساوات  
 کمال کے لئے نقص ہے، کامل وہی ہے، جس کا کوئی ہم مرتبہ نہ ہو، اور جس طرح سے آفتاب کے نور کی تابش  
 آفاق عالم میں آفتاب کا نقص نہیں، بلکہ اس کا کمال ہے، آفتاب کے لئے نقص تو دوسرے ہم مرتبہ آفتاب کا  
 وجود ہے، جبکہ اس کی ضرورت بھی نہیں، اسی طرح سے عالم میں ہر چیز کا وجود انوار قدرت کی تابش کا فیضان

ہے یہ سب تابع ہیں انبوع نہیں پس ربوبیت کی شان وجود کی کیتائی ہے اور یہی کمال ہے انسان بھی بالطبع اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ کمال میں کیتا ہو، بعض مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کے باطن میں وہی بات مضمر ہے جس کو فرعون نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "أَنَا رَبُّكُمْ الْأَخْلَى" لیکن اس کو اس کا موقع نہیں ملتا، عبودیت نفس اسی لئے نفس پرشاق اور ربوبیت اسی لئے طبعاً سہل اور مرغوب ہے یہ اسی نسبت ربانی کی وجہ سے ہے جس کی طرف "قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" میں اشارہ ہے۔

لیکن جب انتہائے کمال تک پہنچنے سے عاجز رہا تو اس کے کمال کی خواہش بالکل زائل نہیں ہوئی، اب بھی وہ کمال کا خواہشمند اور متمنی ہے اور اس کو کمال سے بالذات لذت حاصل ہوتی ہے، کمال کے علاوہ کسی اور مقصود کی خاطر نہیں (جس کا کمال ذریعہ ہے) بلکہ نفس کمال کی خاطر دنیا میں جو کچھ بھی موجود ہے، اس کو اپنی ذات سے محبت اور اپنی ذات کے کمال سے محبت اور ہر ایک کو ہلاکت اور فنا مرغوب ہے، اس لئے کہ اس میں اپنی ذات اور اپنی صفات کمال کا فنا سمجھتا ہے، کمال تو یہی ہے کہ وجود میں کیتائی حاصل ہو اور تمام موجودات پر غلبہ اور حکمرانی، اس لئے کہ کامل ترین کمال یہ ہے کہ دوسرے کا وجود تمہارا ہی رہیں منت ہو، اگر وہ تمہارا رہیں منت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ تم اس پر غالب ہو، اس بنا پر سب پر غلبہ حاصل کرنا انسان کو طبعی طور پر محبوب ہے، اس لئے کہ یہ کمال کی ایک قسم ہے، ہر موجود جو اپنی ذات کا شناسا ہے، وہ اپنی ذات کا عاشق ہے اور اپنی ذات کے کمال کا بھی عاشق ہے، اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، اگر کسی چیز پر غلبہ کے معنی میں یہی کہ تم اس پر اثر ڈال سکو اپنے ارادہ کے مطابق اس میں تغیر کر سکو اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرو، انسان نے چاہا تو یہ تھا کہ اس کو تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جائے لیکن موجودات میں کچھ موجود ایسے ہیں جو

۱۔ مولانا روم نے اس معنیوں کو بیان کیا ہے:-

لیک اور اعون مار اعون نیست

نفس مار اکثر از فرعون نیست

کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے، جیسے اللہ کی ذات و صفات اور بعض موجودات جیسے ہیں جو تغیر کو قبول کرتے ہیں، لیکن ان پر مخلوق کی کوئی دست رس نہیں، اور اس پر ان کا کوئی زور نہیں چلتا، جیسے افلاک کو اکب، ملکوت، سماوات، نفوس، ملائکہ، جن و شیاطین اور جیسے پہاڑ و سمندر اور ان کے بیچ کی چیزیں، تیسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنی قدرت سے تغیر کر سکتا ہے، جیسے زمین اور اس کے اجزاء معدنیات، نباتات، حیوانات اور انہی میں سے انسانوں کے دل بھی ہیں، جو بدن ہی کی طرح تاثر اور تغیر قبول کرتے ہیں، جب موجودات کی ایک قسم وہ ہوئی جن پر انسان تصرف کی قدرت رکھتا ہے، جیسے ارضیات اور ایک وہ جن پر قدرت نہیں رکھتا، جیسے ذات الہی، ملائکہ، افلاک، تو انسان کے اندر اس کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کم سے کم آسمانوں کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے، ان کی حقیقت کو سمجھے اور ان کے اسرار کو فاش کرے، اس لئے کہ یہی ایک طرح کا غلبہ ہے، اس لئے جس کا پورا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے، وہ علم کے ماتحت ہو جاتا ہے اور عالم ایک طرح سے غالب کی شان رکھتا ہے، (گویا اس علم سے اس کے جذبہ حکومت و استعمار کی کسی درجہ میں تسکین ہوتی ہے) اسی بنا پر اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، ملائکہ، افلاک، کو اکب، عجائب، سموات، سیاروں اور سمندروں کے عجائبات وغیرہ کے علم کا شوق ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ ایک طرح کا تغلب ہی اور تغلب کمال کی ایک قسم ہے، اسی بنا پر تم دیکھتے ہو گے کہ جو شخص کوئی عجیب چیز بنا نہیں سکتا، وہ کم سے کم اس کے بنانے کا طریقہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے، (گویا اس طرح سے وہ صنعت کی خواہش کی تسکین کرتا ہے) جو خطرناک وضع کرنے سے عاجز ہے، وہ کم سے کم شرطیہ کھیلنے کا طریقہ سیکھ لینا چاہتا ہے، اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ شرطیہ کیسے بنائی گئی ہے، جو شخص کسی ہندسہ یا شعبہ یا جزئیہ کے آئے کو دیکھتا ہے، اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسا آکر بنانے سے قاصر ہے، تو وہ اس کے بنانے کی کیفیت جاننا چاہتا ہے، اس کو اپنے اس عجز سے تکلیف اور علم کے کمال سے لذت حاصل ہوتی ہے، گویا وہ اس کی کمی اس سے پوری کرنا چاہتا ہے۔

دوسری قسم جس پر انسان قدرت حاصل کر سکتا ہے جیسے ارضیات وغیرہ تو وہ طبعی طور پر ان پر غلبہ اور اتنی قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ان میں اپنی غنما کے مطابق تصرف کر سکے ان کا بھی دو قسمیں ہیں اجسام اور ارواح، اجسام تو روپیہ پیسہ سامان ہے، لہذا کے بارہ میں تو انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو، وہ ان کو اٹھا بٹھا سکے، جس کو چاہے لے جس کو چاہے نہ لے، اس لئے کہ یہ قدرت ہے اور قدرت کمال ہے اور کمال صفات ربوبیت میں ہے اور ربوبیت بالطبع محبوب اسی لئے اس کو اموال کی محبت ہے چاہے اس کو اپنے پہننے کھانے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کبھی بھی اس کی ضرورت نہ ہو، اسی طرح سے غلام رکھنا، اور آزاد شریف لوگوں کو اپنا غلام بنانا خواہ زبردستی اور قہراً ہو یہاں تک کہ ان کے اجسام اور ان کی ذات میں تصرف کر سکے، یعنی بیگار لے سکے، چاہے ان کے دل غلام نہ بنیں، اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے دل میں اس کا اعتقاد نہیں ہوتا، اور ان کو اس سے محبت نہیں ہوتی، لیکن کبھی محض غلبہ ہی محبت کا قائم مقام بن جاتا ہے، انسان کو ایسا عیب و آہ بھی لذیذ اور عزیز ہے، جو زبردستی کی بنا پر ہو، اس لئے کہ اس میں قدر کا اظہار ہوتا ہے اور انسان اس کا دیوانہ بھی ہے۔

دوسری قسم آدمیوں کے نفوس اور قلوب ہیں اور یہ روئے زمین کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور نفیس چیز ہے اور انسان چاہتا ہے کہ اس کو ان قلوب پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے تاکہ وہ اس کے لئے سخر ہو جائیں اور اس کے ایک اشارہ پر کاکا کریں اس لئے کہ اس میں غلبہ کمال پایا جاتا ہے اور صفات ربوبیت کے شاہد ہے، قلوب صرف محبت سے سخر ہوتے ہیں اور محبت کمال کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ ہر کمال محبوب ہے اور کمال اس لئے محبوب ہے کہ وہ صفا اللہ میں ہے اور صفا اللہ سب انسان کو بالطبع محبوب ہیں، اس لئے کہ انسان میں ایک نسبت ربانی پائی جاتی ہے اور یہ نسبت غیر فانی ہے نہ موت اس کو ختم کر سکتی ہے اور نہ مٹی اس پر قابو پاسکتی ہے، یہی نسبت ربانی ایمان و معرفت کا محل ہے، وہی بقائے الہی تک پہنچنے والی ہے اور وہی اس کے لئے کوشش کرنے والی ہے، جاہ کے معنی قلوب کا سخر ہونا ہے اور جس کے لئے قلوب سخر

ہو گئے اس کو ان پر قدرت و استیلا حاصل ہو گیا، اور قدرت و استیلا کمال ہے اور کمال اوصافِ ربوبیت میں سے ہے پس قلب کو جو چیز بالطبع محبوب ہے، وہ کمال ہے، خواہ علم سے حاصل ہو، خواہ قدرت سے، مال و جاہ بھی اسبابِ قدرت ہیں، اس لئے کہ وہ محبوب و سیلہ ہیں اور محبوب و سیلہ بھی محبوب ہوتا ہے پھر معلوم کی کوئی انتہا ہے، نہ مقدرات کی کوئی انتہا ہے اور جب تک کہ ایک چیز بھی دنیا میں باقی ہے، جو معلوم کی جاسکتی ہے، اور ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے جس پر قدرت حاصل کی جاسکتی ہے، تو نہ شوق کو سکون سکون اور نہ نقص کو زوال، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو چیزیں کبھی آسودہ نہیں ہو سکتی:

## محاسبہ و نفس

کتاب کا موثر ترین حصہ وہ ہے، جہاں امام غزالی نصیحت اور ترغیب و ترمیم پر قلم اٹھاتے ہیں، اور دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی عظمت، ایمان و عمل صالح کی ضرورت، اصلاح و تہذیبِ نفس کی اہمیت اور امراضِ قلبی و نفسانی کی مضرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اس موقع پر وہ بیک وقت ایک شہدہ بیان و اعطاء ایک نکتہ شناس حکیم اور ایک تجربہ کار و ماہر نفسیات معالج کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، جو اپنے مخاطبین کے حالات اور کمزوریوں اور ضرورتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی طرف سے ان سے بہتر و کالت کرتا ہے، اور بڑی قابلیت اور انصاف کے ساتھ ان کے عذر اور دلائل پیش کرتا ہے، پھر ایک ماہر مقلق و عالم نفسیات کی طرح ان میں سے ایک ایک کا جواب دیتا ہے، پھر ایک شفیق معالج اور ایک خیر خواہ مری کی طرح ان کا علاج تجویز کرتا ہے، اس لئے ان کے مواضع صرف و اعظانہ تاثیر ہی کا نمونہ نہیں، حکمت و بلاغت کا بھی نمونہ ہیں، ہر دور میں ہزاروں آدمیوں نے ان کے مواضع و مکالمات سے فائدہ اٹھایا ہے، اور کثیر التعداد آدمیوں کی اصلاح و انقلاص کا ذریعہ بنے ہیں، کتاب کے آخری پونچھ حصہ (ربیع رابع) میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے، یہاں اس کا ایک اقتباس



پیش کیا جاتا ہے، جہاں انہوں نے نفس کو زبرد تو بیخ کیا ہے اور پڑھنے والوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کو اپنے نفس سے کس طرح مکالمہ کرنا چاہئے اور منزلِ آخرت کے لئے کس طرح اس کو تیار کرنا چاہئے۔ المرباطة الساجدة فی توبیح النفس ومعابقتها“ عنوان کے تحت نفس سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”اے نفس ذرا انصاف کر اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ ترین کھانا تیرے لئے مضر ہے تو تو صبر کرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے، کیا انبیاء کا قول جن کو معجزات کی تائید حاصل ہوتی ہے اور فرمان الہی اور صحیف سماوی کا مضمون تیرے لئے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے، جتنا کہ اس یہودی کا ایک قیاس و اندازہ، عقل کی کمی اور علم کی کمی اور کوتاہی کے ساتھ تعجب ہے، اگر ایک بچہ کتاب ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے تو بغیر دلیل طلب کیے اور سوچے سمجھے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے، کیا انبیاء علماء اور اربابِ حکماء کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچہ کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے، یا جہنم کی آگ اس کی بیڑیاں، اس کے گرز اس کا عذاب اس کا زقوم اور اس کے آنکڑے، اس کے سانپ، بچھو اور زہریلی چیزیں تیرے لئے ایک بچھو سے بھی کم تکلیف دہ ہیں، جس کی تکلیف زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے کم رہتی ہے، یہ عقلندوں کا شیوہ نہیں، اگر کہیں بہائم کو تیری حالت کا علم ہو جائے تو وہ تجھ پر ہنسیں اور تیری دانائی کا مذاق اڑائیں، پس اگر اے نفس! تجھ کو یہ سب چیزیں معلوم ہیں اور ان پر تیرا ایمان ہے تو کیا بات ہے کہ تو عمل میں تساہل اور مالِ مٹول سے کام لیتا ہے، حالانکہ موت کین گاہ میں منتظر ہے کہ وہ بغیر مہلت کے تجھے اچکے جائے اور فرض کر کہ تجھے سو برس کی مہلت بھی مل گئی ہے تو کیا تیرا خیال ہے کہ جس کو ایک گھائی طے کرنی ہے اور وہ اس گھائی کے نشیب میں اطمینان سے اپنے جانور کو کھلا رہا ہے، وہ کبھی بھی اس گھائی کو طے کر سکے گا، اگر تو یہ گمان رکھتا ہے تو تو کس قدر نادان ہے، ایسے شخص کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے جو علم حاصل کرنے کی غرض سے پردیس کا سفر کرتا ہے اور وہاں کئی سال بیماری اور تعطیل میں گزار دیتا ہے، اس خیال سے کہ وطن کی واپسی کے سال سب علم حاصل کرے گا، تو اس کی عقل پر ہنستا ہے اور اس کے

اس وہم کا مذاق اڑاتا ہے کہ علم و تفقہ اتنی قلیل مدت میں حاصل ہو جائے گا، یا قضا کا منصب لغیر علم و تفقہ کے توکل کی برکت سے ہاتھ آجائے گا، پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آخر عمر کی کوشش مفید ہوتی ہے اور بلند درجات تک لے جاتی ہے، تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی آج کا دن تیری عمر کا آخری دن ہو تو اس دن تو اس کام میں کیوں مشغول نہیں ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے تباہی دیا ہے کہ تجھے بہت بے دی گئی ہے، تو پھر بھی عجلت کرنے سے کیا چیز مانع ہے اور آج کل آج کل کرنے کی کیا وجہ ہے، یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ تجھے اپنی خواہشات نفس کی مخالفت مشکل معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس میں محنت و مشقت ہے، کیا تو اس دن کا منتظر ہے جب خواہشات کی مخالفت تیرے لئے آسان ہو جائے گی، ایسا دن تو اللہ تعالیٰ نے مطلق پیدایہ نہیں کیا اور زید اکرے گا جنت ہمیشہ ناگوار یوں اور مکارہ سے گھری ہے گی، اور مکارہ کبھی نفس کے لئے آسان نہیں ہو سکتے ایسا ہونا محال ہے، کتنا ایسا ہوتا ہے کہ تو کہتا ہے کہ کل سے یہ کام کریں گے، تجھے معلوم نہیں کہ جو کل آپکل ہے، وہ گذشتہ دن کے حکم میں ہے، جو کام تو آج انجام نہیں دے سکا، کل اس کا انجام دینا تیرے لئے اور بھی مشکل ہے، اس لئے کہ شہوت کی مثال ایک تناور درخت کی سی ہے جس کو آدمی اکھاڑنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اگر کوئی اس کے اکھاڑنے سے عاجز ہو گیا، اور اس نے اس کو کل پر رکھا تو اس کی مثال اس نوجوان کی سی ہے جس سے ایک رخت اکھاڑا نہیں گیا، اور اس نے اس کام کو دوسرے سال کے لئے ملتوی کر دیا، وہ جانتا ہے کہ جتنا زمانہ گزے گا درخت مستحکم اور اس کی جڑیں مضبوط اور وسیع ہو جائیں گی، اور اکھاڑنے والے کی کمزوری اور ضعف میں اضافہ ہوگا، ظاہر ہے کہ جس کو شباب میں نہیں اکھاڑ سکا، اس کو بڑھاپے میں کیا اکھاڑے گا، بڑھاپے کی ورزش اور محنت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے، بھیرے کی تربیت و اصلاح ایک عذاب، سرسبز شاخ لچک کھتی ہے اور جھکائی جاسکتی ہے، جب کھ جائے گی، اور ایک زمانہ گزر جائے گا تو اس کا موڑنا ناممکن ہو جائے گا، پس اگر انے نفس اتوان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا، اور سہل انگاری سے کام لیتا ہے، تو تجھے کیا ہو گیا ہے کہ حکمت و دانش کا دعویٰ دار ہے، اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہو سکتی ہے، غالباً تو یہ کہے کہ انتقامت سے

روکنے والی چیز شہوت پرستی اور آلام و مصائب پر بے صبری ہے اگر یہی بات ہے تو تیری عبادت کتنی بڑھی ہوئی ہے اور تیرا عذر کتنا ننگ ہے اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ایسی لذت کیوں نہیں تلاش کرتا جو تمام کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو اور ابداً باذنک کے لئے ہو، اور یہ نعمت جنت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے اگر تو خواہشات کا حوصلہ ہے اور تجھے لذت ہی عزیز ہے تو ان کی خاطر بھی تجھے نفس کی وقتی خواہشات کی مخالفت کرنی چاہئے، اس لئے کہ بسا اوقات ایک لقمہ کئی لقموں سے محروم کر دیتا ہے تیرا کیا خیال ہے اس مرضی کے بائے میں جس کو طبیعت نے صرف تین روز کے لئے ٹھنڈے پانی سے پرہیز بتایا ہو تاکہ وہ صحت حاصل کر سکے، پھر زندگی بھر ٹھنڈے پانی کا لطف اٹھائے، اس نے اس کو خیردار کر دیا ہو کہ ٹھنڈا پانی اس حالت میں اس کے لئے سخت مضر ہے اگر اس نے بد پرہیزی کی تو زندگی بھر اس ٹھنڈے پانی سے اس کو ہاتھ دھو لینا پڑے گا، اس وقت سچ سچ بتلا عقل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا اس کو تین دن صبر کر لینا چاہئے، تاکہ زندگی آرام سے گزریے یا اپنی خواہش پوری کر لینی چاہئے، پھر تین سو دن یا تین ہزار دن برابر اس نعمت محروم رہے؟ تین دن کی کبھی پوری عمر کے مقابلہ میں وہ حقیقت نہیں جو تیری پوری عمر کی ابدالاً بادی کی زندگی کے مقابلہ میں ہے (جو اہل جنت اور اہل جہنم کی مدت ہے) کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کے ضبط کرنے کی تکلیف طبقاتِ جہنم میں عذابِ ناری سے زیادہ سخت اور طویل ہے؟ جو شخص ایک معمولی تکلیف بھی نہیں برداشت کر سکتا، وہ عذابِ الہی کو کیسے برداشت کر سکتا ہے!

میں دیکھتا ہوں کہ تو درودِ جہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے، ایک کفرِ خفی اور ایک صریح حماقت، کفرِ خفی یہ ہے کہ یومِ حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے، اور ثوابِ عقاب سے تو ناواقف ہے، اور صریح حماقت اللہ تعالیٰ کی تدبیرِ مخفی اور اس کے استدراج کا خیال کے بغیر اس کے عفو و کرم پر اعتماد ہے، اس کے باوجود کہ تو روٹی کے ایک ٹکڑے، غلہ کے ایک انہ اور زبان سے نکلے ہوئے ایک کلمہ کے لئے خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار

نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حصول کے لئے ہزار عین کرتا ہے، اور اسی جہالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے کہ الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والآخر حق اتبع نفسه، ہواھا و تمثی علی اللہ الامانی“ (ہو شیار وہ ہے جو اپنے نفس کا حاسب کرے، اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے، اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگا دے، اور اللہ پر آرزوئیں باندھتا ہے) افسوس! نفس! تجھ کو زندگی کے دام ہمرنگ زمین سے ہو شیار رہنا چاہئے تھا، اور شیطان کے فریب نہیں کھانا چاہئے تھا، تجھے اپنے اوپر ترس کھانا چاہئے، تجھے اپنی ہی فکر کا حکم دیا گیا ہے، دیکھ تو اپنے اوقات ضائع نہ کر تیرے پاس گئی چینی سانس میں، اگر تیری ایک سانس بھی رانگاں گئی تو گویا تیرے سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہو گیا، پس غنیمت سمجھ صحت کو مرض سے پہلے، فراغت کو مصروفیت سے پہلے، دولت کو غربت سے پہلے، شباب کو صیفی سے پہلے، زندگی کو ہلاکت سے پہلے، اور آخرت کے لئے تیاری کر، اسی لحاظ سے جتنا تجھے وہاں رہنا ہے، اے نفس! کیا جب موسم سرما سر پر آجاتا ہے تو اس پوری مدت کے لئے تو تیاری نہیں کرتا، خوراک کا ذخیرہ، لباس کی ضروری مقدار اور ایندھن کا ایک ٹھہر جمع نہیں کر لیتا، تو تمام ضروری سامان جاڑے کا ہیا کر لیتا ہے، اور اس بھروسہ پر نہیں رہتا کہ بارہ جز اول اور ایندھن کے بغیر جاڑا گزارے گا، اور تجھ میں اس کی طاقت ہے، کیا تیرا گمان ہے کہ جہنم کی زہریں جاڑوں کی سخت سردی سے کم ہے، ہرگز نہیں، اور اس کا کوئی امکان نہیں، شدت و برودت میں ان دونوں کے درمیان کوئی تناسب نہیں، کیا تو سمجھتا ہے کہ تو بغیر سعی کے اس سے نجات حاصل کرنے کا، جیسے کہ سردی بغیر اونی کپڑے، بارہ آگ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بغیر نہیں جاتی، اسی طرح دوزخ کی گرمی اور سردی تو حید کے قلعہ اور طاعت کے خندق کے بغیر نہیں جاسکتی، اور اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہے کہ اس نے تجھے حفاظت کی تدابیر سے آگاہ کر دیا ہے، اور اسباب آسان کر دیئے ہیں، اس کا کرم یہ نہیں کہ وہ سرے سے عذاب ہی کو ٹال دے، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے، وہ جاڑا پیدا کرتا ہے تو اس کے لئے آگ بھی پیدا کرتا ہے، اور تجھے چھتاق کے طریقہ پر

پتھروں سے آگ نکالنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے کہ تو ان طریقوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھے اور جیسے کہ لکڑی خریدنا اور اونی کپڑے حاصل کرنا، خدا کی ضرورت نہیں، انسانوں کی ضرورت ہے، اسی طرح طاعت و عبادت بھی خدا مستغنی ہے اور یہ تمہارا فریضہ ہے کہ اس کے وسیلہ سے نجات حاصل کرو، "مَنْ أَحْسَنَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلِمَ أَنَّهُ وَآلَهُ عَنِّي عَنِ الْعَالَمِينَ" (جس نے اچھائی کی تو اپنے نفس کے لئے اور جس نے برائی کی، اس کا بوجھ بھی اسی پر ہے اور اللہ جہان والوں سے بے پرواہ ہے) تیری خرابی ہوائے نفس اجمالت کی قباحت کر اور اپنی آخرت کو اپنی دنیا پر قیاس کر "فَمَا خَلَقَكُمْ وَلَا يَحْكُمُكُمْ إِلَّا كَفِيٌّ وَوَاحِدٌ" تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا برپا کرنا ایک جان کی طرح ہے، "لَمَّا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُمْ" (جیسے ہم نے پیدا کیا تھا پھر اُسے دہراتے ہیں) لَمَّا بَدَأْنَا خَلْقَ تَعْوِدُونَ" (جیسے اس نے تم کو ابتداً پیدا کیا تھا، ویسے ہی پھر تم واپس ہو جاؤ گے)۔

## احیاء کے ناقد

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے احیاء العلوم کی اجمالی تعریف و اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ "کلامہ فی الاحیاء غالبہ جید" (احیاء میں عموماً ان کا کلام اچھا ہے) اس کے ساتھ وہ چار باتوں میں اس کتاب پر تنقید کرتے ہیں، ان کی پہلی تنقید اس پر ہے کہ اس میں فلاسفہ کے بہت سے اقوال آگئے ہیں اور توحید، نبوت اور معاد سے متعلق ان کے بعض خیالات و بیانات شامل ہو گئے ہیں، ان کے نزدیک امام غزالی فلاسفہ کے اثرات سے ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے ہیں، وہ اگرچہ ان کے بڑے ناقد اور مخالف ہیں، مگر ان کی تصنیف میں ان کے خیالات کی (غیر شعور یا طور پر) کہیں کہیں جھلک جاتی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی جس فلسفہ و فلاسفہ کے بارہ میں چونکہ بہت تیز ہے، اس لئے کچھ عجیب نہیں کہ ان کے معیار سے امام غزالی کی بعض چیزیں فلسفہ سے متاثر ہوں۔

دوسری تنقید یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے کلامی مباحث ہیں، جو ابن تیمیہ کے نزدیک کتاب و سنت کی روح کے پونے طور پر مطابق نہیں ہیں، اور ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے، تیسری تنقید یہ ہے کہ اس میں اہل تصوف کے بعض تشددانہ اقوال اور مغالطے ہیں، چوتھی چیز یہ ہے کہ احیاء میں بہت سی ضعیف احادیث و آثار ہیں، بلکہ موضوع روایات تک ہیں، اس کے باوجود شیخ الاسلام لکھتے ہیں:-

وفیہ مع ذلك من کلام المشائخ الصوفیة	اس کے باوجود احیاء میں ان مشائخ صوفیہ کا جو صلابہ
العارفین المتقین فی اعمال القلوب	موزن انتقامت تھے اعمال قلوب کے بارہ میں بہت
الموافق للکتاب والسنۃ ما هو اکثرهما	ایسا کلام ہے جو کتاب و سنت کے موافق ہے اور اس کا
یرد منه فلفظہ المختلف فیہ اجتهاد	اکثر حصہ قابل قبول ہے، اسی بنا پر اس کتاب کے
الناس و تنازعوا فیہ۔ <sup>۵۲</sup>	بارہ میں علماء مختلف رائیں رکھتے ہیں اور سب اس کے مخالف نہیں۔

علامہ ابن جوزی کی بھی بڑی تنقید ضعیف اور موضوع روایتوں پر ہے، ان کے نزدیک اس کی وجہ امام صحابہ کا حدیث سے عدم اشتغال ہے، حافظ زین الدین العراقي صاحب الفیہ نے احیاء کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کی، ہر راوی اور حدیث کا درجہ اور اس کی حیثیت بیان کر دی ہے۔ ابن جوزی نے امام غزالی کے بعض تاریخی مسامحات اور فرود گذشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی طرح ان کو تاریخ سے بھی اشتغال کا موقع نہیں ملا تھا۔<sup>۵۳</sup>

ان کا دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ بعض امراض قلب (ریا و حُب جاہ) وغیرہ کے علاج کے سلسلہ میں اور نفس کشی اور اصلاح کے لئے انھوں نے صوفیہ کے بعض ایسے واقعات نقل کر دیئے ہیں جو قابل تقلید نہیں ہیں اور فقہی حیثیت سے ان کا جواز بھی ثابت ہونا مشکل ہے، ان نقائص کے باوجود وہ

۱۔ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ص ۱۹۴، اور التاج المکمل لآب صدیق حسن خاں ص ۲۸۸

۲۔ فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲ ص ۱۹۴ ۳۔ المنتظم ج ۹ ص ۱۷۹ ۴۔ ایضاً ۵۔ ایضاً ص ۱۶۹

اجزاء العلوم کی اہمیت و مقبولیت کے قابل ہیں اور انھوں نے خود منہاج القاصدین کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے جس میں انھوں نے قابل اعتراض چیزوں کو حذف کر دیا ہے، لیکن اس خلاصہ میں اصل کتاب کی روح اور اس کی تاثیر باقی نہیں رہی ہے۔

## امام غزالی اور علم کلام

امام غزالی جس مجتہدانہ دماغ کے آدمی تھے اس کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ متقدمین کے مباحث و تحقیقات کے ناقل محض یا ترجمان و شارح بن کر رہ جائیں اور کہیں ان کی شخصیت نمودار نہ ہونے پائے بد قسمتی سے چوتھی صدی میں علم کلام کا حلقہ بھی (جس کو تمام دوسرے علمی اداروں سے زیادہ اپنے زمانہ کی عقلی اور علمی سطح کے ساتھ چلنے کی ضرورت تھی) جمود و تقلید کا شکار ہو گیا تھا، متکلمین اشاعرہ کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ ان کے نتائج تحقیقات اور ان کے عقائد تسلیم کئے جائیں بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کے ثبوت کے لئے امام ابو الحسن اشعری اور علامہ ابو بکر باقلانی وغیرہ نے جو مقدمات و دلائل قائم کئے ہیں ان کو بھی بعینہ تسلیم کیا جائے اور ان کے علاوہ دوسرے مقدمات و دلائل سے کام نہ لیا جائے امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں مجتہدانہ انداز میں اصول و عقائد پر گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بعض ایسے نئے مقدمات و دلائل قائم کئے جو ان کے نزدیک زیادہ موثر و دلپذیر تھے، صفات باری تعالیٰ..... نبوت، معجزات، تکلیفات شرعیہ، عذاب و ثواب، برزخ، قیامت کے متعلق انھوں نے نئے متکلمانہ انداز سے گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بہت سے متکلمین کی طرح احتمال آفرینیوں، تشکیکات اور منطقی مقدمات و نتائج کے بجائے زیادہ عام فہم اور اطمینان بخش دلائل فراہم کئے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے پیشرو متکلمین کے استدلال زبان اور اصطلاحات اور ان کی ترتیب کی پابندی نہیں کی، اور اس طرح اشعری علم کلام کی تجدید کی خدمت انجام دی جس کے لئے متکلمین اشاعرہ کو ان کا ممنون اور

ان کی عظیم الشان دینی خدمت کا معترف ہونا چاہئے تھا، مگر چونکہ انھوں نے یہ کام عام تکلمین کی روش سے بہت کرانجام دیا تھا، اور کہیں کہیں امام ابوالحسن اشعری اور ان کے نامور تبعین کی تحقیقات کے اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے اشعری مکتب فکر (جس سے خود امام صاحب مسلک اورسوب تھے) ان کے اس علم کلام اور ان دلائل و مقدمات پر چسپیں بھیس تھا، اور اس حلقہ کے بہت سے پر جوش علماء اس میں زلیخ و ضلال اور مسلک سلف سے بعد و انحراف محسوس کرتے تھے، اجیار العلوم کی تالیف اور اس کی غیر معمولی اشاعت و مقبولیت کے بعد اس مسلک پر اشعری علماء میں چہ میگوئیاں بہت بڑھ گئیں، اور بہت سے لوگوں کو امام صاحب کے عقائد میں شبہات پیدا ہونے لگے، کسی مخلص نے امام صاحب کو خط لکھا اور اس صورت حال کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی قلبی تکلیف کا اظہار کیا، امام صاحب نے ان کو مفصل جواب دیا، ایک مستقل رسالہ (فیصل التفرقة بین الاسلام والنساقۃ) کے نام سے موجود ہے، اس کے شروع میں وہ تحریر فرماتے ہیں:-

• برادر شفیق! حاسدین کا گروہ جو میری بعض تصنیفات (متعلق باسرار دین) پر نکتہ چینی کر رہا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ یہ تصنیفات قدیمائے اسلام اور شائع اہل کلام کے خلاف ہیں، اور یہ کہ اشعری کے عقیدے سے بال برابر ہی ہٹنا کفر ہے، اس پر جو تم کو صدمہ ہوتا ہے، اور تمہارا دل جلتا ہے، میں اس واقعہ ہوں لیکن عزیز من! تم کو صبر کرنا چاہیے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطاعین سے نہ بچ سکے، تو میرا کیا ہستی ہے؟ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ اشاعرہ یا معتزلہ یا حنابلہ یا اور دیگر فرقوں کی مخالفت کفر ہے تو سمجھ لو کہ وہ اندھا مقلد ہے، اس کی اصلاح کی کوشش میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، اس کو خاموش کرنے کے لئے مخالفین کا دعویٰ کافی ہے، اس لئے کہ تمام مذاہب (کلامیہ) میں اشعری سے اختلافات پائے جاتے ہیں، اب اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ تمام تفصیلات و جزئیات میں اشعری کا اتباع ضروری ہے، اور ادنیٰ مخالفت بھی کفر ہے، تو اس سے سوال کرو کہ یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ حق اشعری کے ساتھ مخصوص ہے، اور انہی کی اتباع میں منحصر ہے، اگر ایسا ہے تو وہ شاید باقلانی کے کفر کا فتویٰ دیں گے۔



اس لئے کہ صفت بقا میں ان کو اشعری سے اختلاف ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ ذات الہی سے زائد کوئی صفت نہیں ہے اور پھر سوال یہ ہے کہ باقلانی ہی اشعری کی مخالفت کر کے کیوں کفر کے مستحق ہیں، اشعری باقلانی سے اختلاف کی بنا پر کیوں کفر کے مستحق نہیں، اور حق ان میں سے کسی ایک میں کیوں منحصر سمجھا جائے اگر کہا جائے کہ اشعری تقدم ہیں، تو خود اشعری سے معتزلا تقدم ہیں تو پھر معتزلا کو برحق ہونا چاہئے یا یہ محض علم و فضل کے تفاوت کی بنا پر ہے؟ تو بتلایا جائے کہ علم و فضل کا موازنہ کرنے کے لئے کون سا ترازو ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنے پیشوا کو علم و فضل میں سب سے بلند مرتبہ مانتا ہے، اگر باقلانی کو اشعری سے اختلاف کرنے کی اجازت ہے، تو باقلانی کے بعد آنے والے اس حق سے کیوں محروم رہیں اور اس میں کسی ایک شخص کی تخصیص کیوں کی جائے!

علم کلام پر مجتہدانہ گفتگو اور اس میں بیش بہا اضافہ کرنے کے بعد امام غزالی اپنی سلامت طبع، حق پسندی اور ذاتی تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ علم کلام کا فائدہ بہت محدود ہے اور بعض اوقات اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہے، نیز وہ ایک وقتی اور ضرورت کی چیز ہے اور ایک دوا ہے جس کی صحیح المزاج اور سلیم الطبع انسانوں کو ضرورت نہیں، عمومی چیز جو ایک صالح غذا کا حکم رکھتی ہے اور جس سے کوئی انسان مستثنیٰ نہیں، وہ قرآن مجید کا طرز بیان اور استدلال ہے جس سے سب کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے اور کوئی اس سے محروم نہیں، "الجمام العوام عن علم الکلام" میں جو ان کی آخری تصنیف ہے، لکھتے ہیں۔

فأدلة القرآن مثل الغذاء وينتفع به	قرآنی دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے انسان فائدہ
كل انسان وادلة المتكلمين مثل الدواء	اٹھاتا ہے اور تکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں جس سے
وينتفع به اعماد الناس ويستغربه الاكثر	کوئی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور اکثر آدمیوں کو اس سے
بل ادلة القرآن كالماء الذي ينتفع به	نقصان ہوتا ہے بلکہ قرآنی دلائل کی مثال پانی کی ہے

۱۰ فیصل التفرقة بين الاسلام والزندقة۔

الصبي الرضيع والرجل القوي  
وسائر الأدلة كالاطعمة التي ينتفع  
بها الأحياء مودة وعرضون بها الغرض  
ولا ينتفع بها الصبيان أصلاً<sup>۱</sup>  
جس سے دودھ پیتا بچہ اور طاقتور آدمی کیسے فائدہ  
اٹھاتے ہیں باقی دلائل (کلامیہ) کھانے کے اوریح و اقسام  
کا طرح ہیں اگر بھی ان طاقتور آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے  
اور بھی ضرر اور بچوں کے لئے وہ مطلقاً کارآمد نہیں۔

علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ اور تجربہ بیان کرتے ہیں:-

والدليل على تضرر الخلق به المشاهدة  
والعيان والتجربة وما تارة من الشر  
من نسيح التكلم وقت مناعة الكلام مع  
سلامة العصر الاول من العناية عن مثل  
ذلك<sup>۲</sup>  
لوگوں کو علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی  
دلیل خود مشاہدہ اور تجربہ ہے اہل تجربہ جانتے ہیں کہ  
جب سے تکلمیں پیدا ہوئے اور علم کلام کا پڑھا ہوا  
کیسی مصیبت آئی اور خرابی پھیلی صحابہ کا دور اس  
خرابی سے محفوظ تھا۔

## تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت

ذوالقعدہ ۴۹۹ھ میں امام غزالی نے نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کی مستدریس کو دوبارہ آباد کیا تھا، یہ  
سنجر سلجوقی (پسر ملک شاہ) کی سلطنت اور فخر الملک (پسر نظام الملک) کی وزارتِ عظمیٰ کا زمانہ تھا،  
(فخر الملک) محرم ۵۰۵ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا، اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد  
امام نے مدرسہ نظامیہ کی تدریس سے کنارہ کشی کی اور اپنے وطن طوس میں سکونت اختیار کی، گھر کے پاس ہی  
ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی، جہاں تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔  
۵۰۵ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ نے جب نظام الملک کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کیا تو

۱۔ انجام الحرام عن علم الکلام ص ۲۰  
۲۔ ایضاً

اس نے امام صاحب کو پھر بغداد میں بلانا چاہا، امام غزالی کی جگہ مدرسہ نظامیہ میں اگرچہ پرکردی گئی تھی، مگر

خالی تھی، امام غزالی کا جانشین پورے عالم اسلامی میں ملنا مشکل تھا، مدرسہ نظامیہ سلطنت عباسیہ کی زینت اور بغداد کی آبرو تھی، اس نقصان کا احساس سب کو تھا، بارگاہِ خلافت سے بھی اس کی تحریک ہوئی کہ امام غزالی مدرسہ نظامیہ کو پھر زینت بخشیں، توام الدین نظام الملک وزیر اعظم نے خود خط لکھا، اور مدرسہ نظامیہ کی اہمیت اور مرکزیت بیان کی، اور خود خلیفہ عباسی کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ لکھتا ہے

”و نیز از سر اے عزیز مقدس نبوی (یعنی ایوان خلافت) ذریعت نمودند و تدبیر آن را با الغما فرمودند“

و اس خطاب صادر شد تا صدر الدین بہ تحفظ اس خبر خواجہ اجل زین الدین حجۃ الاسلام، قریب الزمان ابو حامد

بن محمد الغزالی ادا ام الشکر، اہتمام نہ گیرد از انچہ او بیگناہ جہاں و قدوہ عالم و انگشت نمائے روزگار است“

اس فرمان پر دربارِ خلافت کے تمام ارکان کے دستخط ثبت تھے اور یہ ظاہر کیا گیا تھا، کہ ”حاشیہ بوسانِ خلافت اور ارکانِ سلطنت سب امام صاحب کے قدم کے لئے چشمِ براہ ہیں، احمد بن نظام الملک نے خود امام صاحب کو جو خط لکھا، اس کا حاصل یہ تھا کہ اگرچہ آپ جہاں تشریف رکھیں گے، وہی جگہ درگاہِ عام بن جائے گی، لیکن جس طرح آپ مقتدرائے روزگار ہیں، آپ کی قیامگاہ بھی وہی شہر ہونا چاہئے جو عالم اسلام کا مرکز اور قبلہ گاہ ہو، تاکہ تمام دنیا کے ہر حصہ کے لوگ آسانی وہاں پہنچ سکیں، اور ایسا مقام صرف دارالسلام بغداد ہے۔“

امام صاحب نے ان خطوط و فرامین کے جواب میں ایک طویل خط لکھا، اور بغداد میں نہ آنے کے متعدد عند لکھے، ایک یہ کہ یہاں (طوس میں) ڈیڑھ سو مستعد طلبہ مصروف تحصیل ہیں، جن کو بغداد جانے میں زحمت ہوگی، دوسرے یہ کہ جب میں پہلے بغداد میں تھا تو میرے اہل عیال نہ تھے، اب بال بچوں کا جھگڑا ہے، اور یہ لوگ کہ وطن کی زحمت نہیں اٹھا سکتے، تیسرے یہ کہ میں نے مقامِ خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا، اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں، اس کے سوا دربارِ خلافت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہونا ہوگا، اور

لے صدر الدین محمد نظام الملک طوسی کا پوتا اور سلطان سنجر کا وزیر اعظم تھا، جس کی حکومت میں طوس واقع تھا۔

میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا، اور بغداد میں میری کوئی جائیداد نہیں“ غرض خلافت اور سلطنت کی طرف سے گو بہت کچھ کد ہوئی، لیکن امام صاحب نے صاف انکار کیا، اور گوشہ عافیت سے باہر نہ نکلے۔

## بقیہ زندگی اور وفات

امام غزالی نے یہ زمانہ علمی و دینی اشتغال میں گزارا، ان میں اب بھی طالب علمانہ روح تھی، وہ حدیث کی طرف ایسی توجہ نہیں کر سکے تھے جیسی انھوں نے علوم عقلیہ اور بعض علوم نقلیہ کی طرف کی تھی، اس زمانہ میں ان کو اپنی اس کمی کو پورا کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ ایک مشہور محدث حافظ عمر بن ابی اسحاق اردابیل کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر ان سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا درس لیا، اور اس کی سند حاصل کی، یہ اخیر زمانہ ان کا حدیث کے مطالعہ اور اشتغال میں گذرا، ابن عساکر کہتے ہیں:-

وكانت خاتمة امره اقباله على حديث	ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیث نبوی
المصطفى صلى الله عليه وسلم وجماله	کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور علماء حدیث
اهله ومطالعة الصحیحین البخاری ومسلم	کی ہم نشینی اختیار کی اور صحیحین (بخاری و مسلم) کا
الذین هما حجة الاسلام <sup>۲۱</sup>	مطالعہ شروع کیا جو اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں

انتقال سے ایک سال پہلے ۵۰۴ھ میں انھوں نے ”المستصفیٰ“ لکھی، جو اصول فقہ کے ارکان ثلاثہ میں شمار کی جاتی ہے، اور علماء نے اس کے ساتھ بڑی اعتناء کی ہے، یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔

امام غزالی نے طبران میں ۱۲۲ ہجری الاخریٰ ۵۰۵ھ کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا، اور

۱۔ الغزالی ص ۲۱ — ۲۔ تبیین کذب المنقری ص ۲۹۶، ۳۔ تین کتابین جو اصول فقہ کے تین ستون سمجھے جاتے ہیں

حسب ذیل ہیں، ابوالحسن البصری کی (المعتمد) امام احرارین کی (البرہان) اور امام غزالی کی (المستصفیٰ)۔

یہ شیخ گرانمایہ اسی خاک میں ودیعت ہوا، ابن جوزی نے ان کے انتقال کا واقعہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے :-

”دوشنبہ کے دن وہ صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوا لیا، اور آنکھوں سے لگا کر کہا ”آقا کا حکم سر آنکھوں پر یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے لوگوں نے دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی“

## امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں

امام غزالی کی دو خصوصیتیں بڑی ممتاز ہیں، اخلاص، علو ہمت، ان کے اخلاص کا اعتراف موافق و مخالفت سب کو ہے، اور وہ ان کی تصنیفات کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اگرچہ ان کے ناقد ہیں، اور ان کی بہت سی چیزوں سے ان کو اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان کو کبار مخلصین میں شمار کرتے ہیں، ان کی کتابوں کی تاثیر اور مقبولیت کی اصل وجہ ان کا یہی اخلاص ہے، اسی اخلاص نے ان کے اقلیم علم کی مسند شاہی ترک کر والی، اور برسوں دشت و بیاباں کی خاک چھینوائی، اور باوجود طلبی و اصرار کے بادشاہوں کے دربار اور اپنے وقت کے سب سے بڑے اعزاز سے روگرداں اور بے نیاز رکھا، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آخری چیز جو صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے، وہ حُب جاہ ہے، ان کی آخری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس مقام سے محروم نہیں رہے۔

علو ہمت، ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہم عصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے، ان کا نون میں یہی صدائی کہ

مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

علوم نقلیہ میں بھی وہ اپنے زمانہ اور اپنے معاصرین کی عام سطح سے بہت بلند ہیں، فقہ و اصول فقہ میں

بہ اجماع، اشارة التتقين (شرح احياء العلوم) ص ۱۱۱

انہوں نے جو تصنیفات کیں، صدیوں تک علماء ان کی شرح و تحشیہ میں مشغول رہے پھر اپنے زمانہ کے رواج اور علمائے نقلیات کے دستور کے خلاف انہوں نے علوم عقلیہ کی طرف توجہ کی اور منطق و فلسفہ کا اس طرح مطالعہ کیا کہ بقول قاضی ابوبکر بن العربی فلسفہ کے جگر اور فلاسفہ کے شکم میں اتر گئے اور پھر ان کی تنقید و تردید میں ایسی کتابیں لکھیں جن سے اس کی عمارت ایک صدی تک متزلزل رہی۔

عمل کے سلسلے میں اپنی ذہنی، علمی، اخلاقی، اور روحانی ترقی و تکمیل کا انہوں نے کوئی گوشہ فرو گذار نہیں کیا، علمی تبحر اور جامعیت و کمال کے ساتھ اپنے وقت کے ایک مخلص و مبصر شیخ طریقت شیخ ابوالعلی فارسی (م ۵۳۷ھ) سے بیعت کی، اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، پھر اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے اس کے مقاصد و غایات کو پہنچنے اور اذواق صحیحہ سے لذت آشنا ہونے۔

اصلاح و انقلاب کے سلسلے میں صرف تصنیف و تالیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک نئی اسلامی سلطنت کی داغ بیل پڑنے میں بھی ان کا ہاتھ ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں:-

۱۰ امام صاحب کو ان باتوں پر تسلی نہ تھی، وہ دیکھتے تھے کہ موجودہ سلطنتوں کا سرے سے خمیر ہی بگڑ گیا ہے، اس لئے جب تک اسلامی اصول کے موافق ایک نئی سلطنت نہ قائم کی جائے، اصل مقصد نہیں حاصل ہو سکتا لیکن امام صاحب کو ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایسے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکتے، اتفاق یہ کہ جب اجار العلوم شائع ہوئی اور ۱۲۵۵ھ میں اسپین میں پہنچی تو علی بن یوسف بن تاشفین نے جو اسپین کا بادشاہ تھا، تعصب اور تنگ دلی سے اس کتاب کے جلانے کا حکم دیا، اور نہایت بیدری اس حکم کی تعمیل کی گئی، امام صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، تو سخت رنج ہوا، اسی اشار میں اسپین سے ایک شخص امام صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے آیا جس کا نام محمد بن عبدالشہر تو مرت تھا، یہ ایک نہایت محرز خاندان کا آدمی تھا، اور اس کے آبا و اجداد ہمیشہ سے آزادی پسند اور صلا و صلہ چلے آتے تھے

امام صاحب کی خدمت میں رہ کر اس نے تمام علوم میں نہایت کمال پیدا کیا، اور اپنے ذاتی حوصلہ یا اگلا حوصلہ کی فیض صحبت سے یہ ارادہ کیا کہ اسپین میں علی بن یوسف کی سلطنت کو ٹکا کر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالے یہ خیال اس نے امام صاحب کے سامنے پیش کیا، امام صاحب نے چونکہ خود ایک عادلانہ سلطنت کے خواہشمند تھے اس رائے کو پسند کیا لیکن پہلے یہ دریافت کیا کہ اس عہم کے انجام دینے کے اسباب بھی یہاں نہیں محمد بن عبداللہ نے اطمینان دلایا، تو امام صاحب نے نہایت خوشی سے اجازت دی، علامہ ابن خلدون اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

وَبَقِيَ فِيمَا زَعَمُوا بِالْحَمْدِ الْغُرَالِي وَفَافِيهِ  
 بَدَا لَهُ لُغُوْنٌ كَاخِيَالٍ بَدَا لَهُ الْوَحْدَانِيَّةُ  
 بِذَاتِ صَدْرِهِ فَارَادَ عَلَيْهِ طَاكُنَ فِيهِ  
 اَنَّ اَخِيَالَهُ كَمَا خَالَتْ كَيْفَ تَشُوْرُهُ كَمَا اَنَا حَمْدَانِي  
 اِسْلَامٌ يَوْمَئِذٍ بِاِقْطَارِ الْاَرْضِ مِنْ اِخْتِلَالِ  
 اِس كَا تَائِيْدِي كَيْفَ تَشُوْرُهُ كَمَا اَنَا حَمْدَانِي

لہ چونکہ محمد بن عبداللہ نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی اور اسی اصول پر قائم کی جو امام غزالی کا نشانہ تھا، اس لئے اس کا ایک مختصر سا حال طبقات الشافعیہ ابن ابی سے نقل کرتے ہیں:-

محمد بن عبداللہ اقصا مغرب کا رہنے والا تھا، اول اپنے وطن میں نشوونما پایا، پھر شرق کا سفر کیا اور فقہ و کلام کی تحصیل کی وہ نہایت پیمیزگار عابد اور قناعت پسند تھا قانع تحصیل ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر کمر بستہ ہوا، مصر میں پہنچا تو اس سختی سے لوگوں کو مناہی سے روکا کہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے، اور اس کو شہر بدر کر دیا، مصر سے اسکندریہ اور چند روز وہاں اقامت کی پھر بلاد مغرب کی طرف روانہ ہوا، ۵۵۰ھ میں ہمدیہ پہنچا، اور اپنے کام میں مشغول ہوا، وہاں چل کر بجایے اور بجایے سے مراکش گیا، یہاں بھی نہایت آزادی امر بالمعروف کی خدمت انجام دی، یہاں تک کہ خود شاہی خاندان سے متعرض ہوا، بادشاہ وقت علی بن یوسف تاشفین نے اس کو دربار میں طلب کیا اور با کلمتہ اس کے کہا کہ ایسے عادل اور منصف بادشاہ کی حکومت سے ناراضی کی کیا وجہ بیان کر سکتے ہو، محمد بن عبداللہ نے نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ کیا اس شہر میں حلانہ شراب کی خرید و فروخت نہیں ہوتی؟ اور کیا قیپوں کے ال پر دست رازی نہیں کی جاتی؟ اس کی پر جوش تقریب سے بادشاہ بھی متاثر ہوا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے، محمد مراکش سے نکل کر اغمت میں آیا، اور رفتہ رفتہ ایک جماعت کثیر اس کے ساتھ ہو گئی، پھر تمل میں قیام کر کے قبیلہ امصادک اعانت سے سلطنت کی بنیاد ڈالی، شروع کی اور کابلیا ہوا۔

الدولة وتقويض اركان السلطان  
 الجامع للأمة المقيم للملة بعد ان سألہ  
 عن له من العصاة والقبائل التي  
 يكون بها الاعتزاز والمنعة -

میں ضعیف ہو رہا تھا، اور کوئی ایسا سلطان موجود  
 نہ تھا جو تمام امت کو فراہم کر سکے اور دین اسلام کو  
 قائم رکھے لیکن پہلے امام حنائے اس پوچھ لیا کہ تمہارے  
 پاس اتنا مہر سامان اور جمعیت آیا نہیں جس سے

قوت اور حفاظت ہو سکے۔

غرض محمد بن عبدالشہر بن توہرت نے واپس جا کر امر بالمعروف کے شعار سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد  
 ڈالی، جو مدت تک قائم رہی اور موحدین کے لقب سے پکاری جاتی تھی، علی بن یوسف کی حکومت میں جو روٹوئی  
 بہت پھیل گئی تھی، فوج کے لوگ علاقہ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے، اور عفت مآب خاتونوں کے ناموں  
 کو برباد کرتے تھے، علی بن یوسف کے خاندان میں ایک مدت سے یہ الظاد سنور چلا آتا تھا کہ مرد منہ پر نقاب ڈالتے  
 تھے، اور عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں، اس لحاظ سے یہ لوگ ملتین کہلاتے تھے، محمد بن توہرت نے اول اول انہی  
 دونوں بدعتوں کے مٹانے پر کمر باندھی، اور رفتہ رفتہ اسی سلسلہ میں ملتین کی حکومت برباد ہو کر ایک نئی سلطنت  
 قائم ہو گئی، محمد بن توہرت نے خود فرماؤ والی کا قصد نہیں کیا، بلکہ ایک لائق شخص کو جس کا نام عبدالمؤمن تھا تخت نشین کیا،  
 عبدالمؤمن اور اس کے خاندان نے جس طرز پر حکومت کی، وہ بالکل اس اصول کے موافق تھی، جو امام غزالی کی  
 کتاب تھی، ابن خلدون کتاب ثالث اخبار بربر، فصل ثالث میں عبدالمؤمن اور اس کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں :-

ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علماء کی عزت کی جاتی تھی، اور تمام واقعات اور معاملات میں ان سے مشورہ لے کر  
 کا کیا جاتا تھا، ادواہوں کی فریادیں جاتی تھی، رعایا پر ظلم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی، ظالموں کا  
 ہاتھ روک دیا گیا تھا، شاہی ایوانوں میں سجدیں تعمیر کی گئی تھیں، تمام سرحدی ناکے جہاں یورپ کا ڈانڈا لگتا تھا  
 فوجی طاقت سے مضبوط کر دیئے گئے تھے، اور غزوات و فتوحات کو روز افزوں ترقی تھی :-



## امام غزالی کا عالم اسلام پر اثر

ان علمی و عملی کمالات، طاقتور اور جامع شخصیت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے عالم اسلام پر بڑا گہرا اثر ڈالا، ان کی عہد آفریں تصنیفات اور مباحث نے علمی حلقوں میں ایک ذہنی توجہ اور فکری حریت پیدا کر دی اور ان کو نئی غذا اور طاقت پہنچائی، اسلام کی جو چند شخصیتیں صدیوں تک عالم اسلام کے دل و دماغ پر اور اس کے علمی و فکری حلقوں پر حاوی رہی ہیں ان میں سے ایک امام غزالی کی شخصیت بھی ہے، جن کی اثر آفرینی علمی پایہ ان کی تصنیفات کی اہمیت اور تاثر مخالف اور موافق سب کو تسلیم رہی ہے، صدہا انقلابات کے بعد ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے، اور ان کی تصنیفات ایک بڑے حلقہ میں وسیع اور مقبول ہیں، اور پڑھنے والوں کو آج بھی متاثر کرتی ہیں۔

## عمومی دعوت و تہذیب کی ضرورت و اصلاح عام اور بغداد کے داعی الی اللہ

امام غزالی کی موثر شخصیت ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کی عظمت کے باوجود عمومی دعوت و تہذیب کی ضرورت باقی تھی، مسلمانوں کی بڑی تعداد علمی شہات اور خصوصی امراض کے بجائے عام اخلاقی کمزوریوں، علمی کوتاہیوں اور غفلت اور جہالت کا شکار تھی، اور اس کا جلد مدد و ضروری تھا، اس لئے فوری طور پر ایک سحر بیان خطیب اور ایک ایسی بلند روحانی شخصیت کی ضرورت تھی جس کا عوام سے زیادہ ربط ہو اور جو اپنی دعوت و مواعظ تہذیب و اصلاح سے جمہور اہل اسلام میں دینی روح، اور نئی ایمانی زندگی پیدا کر دے، مطلق العنان حکومت نے چار سو برس تک مسلمانوں کے اخلاق کو متاثر کیا تھا، اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا مقصد زندگی حصول دولت یا جاہ و عزت تھا، اور جو اگرچہ اعتقادی طور پر خدا و آخرت کا منکر نہ تھا، مگر عملاً خدا فراموش، آخرت سے غافل اور عیش میں مست تھا، جسکی تہذیب و معاشرت

نے بھی اسلامی زندگی میں اپنے پیچھے گرو رکھے تھے اور عجمی عادات اور جاہلی رسوم جزو زندگی بن گئی تھیں زندگی کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا، سوسائٹی کے مطالبات بہت بڑھ گئے تھے، حکام رس، مزاج شناس موقع پرست لوگوں کی ایک مستقل قوم پیدا ہو گئی تھی، متوسط طبقہ امراء کے نقش قدم پر تھا، اور عوام اور محنت کش متوسط طبقہ کے اخلاق و عادات متاثر ہو رہے تھے، جن کو وسائل معیشت حاصل تھے، وہ غلط طریقہ پران کو استعمال کر رہے تھے اور زندگی سے تمتع اور لطفت اندوزی میں مصروف تھے، ہوا میرا نہ ٹھاٹ سے محروم تھے، وہ کوفت میں مبتلا تھے، اور اپنے کو چوپایہ سے بدتر سمجھتے تھے، اہل دولت ایشیا و ہمدردی اور جذبہ شکر سے خالی اور تنگ حال اور محنت کش، صبر و قناعت، اور یقین و خودداری محروم ہوتے جا رہے تھے، اس طرح زندگی ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا تھی، اس وقت ایک ایسی دعوت کی ضرورت تھی جو دنیا طلبی کے بحران کو کم کرے، ایمان کو بیدار کرے، اور آخرت کے یقین کو ابھارے، خدا طلبی کا ذوق پیدا کرے، اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت، اس کی بندگی اور رضامندی میں عالی سمتی اور بلند وصلگی سے کام لے، اور اس راستہ میں سبقت کرنے کی دعوت دے، توحید کامل کو واٹنگان بیان کیا جائے، اہل دنیا اور ارباب دولت کی بے وقعتی، اور اسباب کی کمزوری کو طاقت اور وضاحت سے بیان کیا جائے۔

## داعی کی علمی صلاحیتیں

پانچویں صدی تاریخ اسلام میں علوم و فنون کی ترقی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، اس صدی میں دینی، عقلی اور ادبی علوم میں بڑے بڑے باکمال اور ائمہ فن پیدا ہوئے ہیں، اسی صدی کے آخر میں علامہ ابوالسختی شیرازی (م ۵۲۶ھ) اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جیسے تبحر عالم اور صاحب فنون، ابوالوفار ابن عقیل (م ۵۱۳ھ) جیسے فقیہ اور محقق، عبدالقادر جیلانی (م ۵۴۱ھ) جیسے صاحب ذوق اور مجتہد فن، ابو زکریا تبریزی (م ۵۲۰ھ) جیسے لغوی اور نحوی، ابوالقاسم انحریری (م ۵۱۶ھ) جیسے نثر اور صاحب طرز نظر آتے ہیں، جنہوں نے صدیوں دماغوں اور مذاقوں پر حکومت کی ہے، اس مردم خیز عہد اور بغداد جیسی شاداب سرزمین میں

دقیق دینی خدمت کے لئے اور ذہنوں اور طبیعتوں کا رخ موڑنے کے لئے اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور جامع کمالات شخص کی ضرورت تھی، جو اس عصر کے تمام مروجہ علوم میں بلند پایہ رکھتا ہو، اور جس کی روحانی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے علم و فضیلت کی کبھی تحقیر ممکن نہ ہو، وہ اس زمانہ کی معیاری اور بلند زبان میں گفتگو کرتا ہو، اس کی مجلس میں ہر ذوق کے لوگوں کو حظ حاصل ہو، اور کوئی اس کو "عابد جاہل" یا "واعظ بے علم" کہہ کر نظر انداز نہ کر سکے، پھر ضعیف الایمان لوگوں کو اس کی مجلس و عطا اور حلقہ درس میں یقین کی قوت، ایمان کی حرارت، اہل شک و ارباب کو شرح صدر کی دولت، مضطرب بے چین طبیعتوں اور مجروح دلوں کو سکون قلب کی نعمت، مخالف و معارف کے طالبین و ثائقین کو دقیق علوم اور لطیف مضامین کا خزانہ، بے عملوں اور افسردہ دلوں کو جذبات اور عمل کے محرکات اور قوت عمل حاصل ہو۔

## بغداد کے دو داعی

اس پر از کمالات دور میں اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت اور مسلمانوں میں از سر نو ایمانی حرکت و حرارت اور توجہ و اناہت کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے دو ہستیوں کو پیدا کیا، جن کی ذات سے دین کو بڑی قوت حاصل ہوئی، ان میں سے ایک کا نام نامی سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہے، دوسرے عبدالرحمن بن ابوحزری ہیں، ذوق و رجحان طبع کے اختلاف کے باوجود دونوں نے اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دین کو ان سے بڑا نفع پہنچایا، اس میں بھی خدا کی بڑی حکمت تھی کہ بغداد ان کے قیام و دعوت کا مرکز تھا، جو عالم اسلام کا مرکز اعصاب و اس کا علمی و سیاسی دارالسلطنت تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو خدمت کے لئے طویل عمر اور وسیع میدان بھی عطا فرمایا۔

مذہب حنبلی کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ دونوں صاحبوں کا تعلق اسی مذہب کی فقہ و

اصول سے ہے۔

# حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

تعلیم و تکمیل

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی ولادت گیلان میں ۳۷۴ھ میں ہوئی، آپ کا نسب س واسطوں سے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، ۱۸ سال کی عمر میں غالباً ۳۸۸ھ میں بغداد تشریف لائے، یہی وہ سال ہے جس سال امام عزالی نے تلاش حق و حصول یقین کے لئے بغداد کو خیر باد کہا تھا، یہ شخص اتنا قوی نہیں کہ ایک جلیل القدر امام سے جب بغداد محروم ہوا تو دوسرا جلیل القدر مصلح اور داعی الی اللہ کا وہاں ورود ہوا، آپ بغداد میں پوری عالی ہمتی اور بلند وصلگی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہو گئے، عبادت و مجاہدات کی طرف طبعی کشش کے باوجود آپ نے تحصیل علم میں قناعت و زہد سے کام نہیں لیا، ہر علم کو اس کے باکمال استادوں اور صاحب فن عالموں سے حاصل کیا، اور اس میں پوری دستگاہ پیدا کی، آپ کے اساتذہ میں ابوالوفاز ابن عقیل، محمد بن الحسن الباقلانی اور ابو زکریا تبریزی جیسے نامور علماء و ائمہ فن کا نام

لے جیلان یا گیلان کو ولیم بھی کہا جاتا ہے، یہ ایران کے شمالی مغربی حصہ کا ایک صوبہ ہے اس کے شمال میں روسی سرزمین تالیس واقع ہے، جنوب میں بزرگ پہاڑی سلسلہ ہے جو اس کو آذربائیجان اور عراق عجم سے علیحدہ کرتا ہے، جنوب میں ازبکان کا مشرقی حصہ ہے اور شمال میں بحر قزوقین کا مغربی حصہ، وہ ایران کے بہت خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتا ہے (دائرة المعارف)۔

۳۷۴ھ ابن کثیر ج ۱۲ ص ۱۳۹ ۳۷۵ھ ابدا یہ والنہایہ (للبنانی) ج ۱۲ ص ۱۳۹

نظر آتا ہے، طریقت کی تعلیم شیخ ابوالخیر حماد بن مسلم الدباس سے حاصل کی، اور قاضی ابوسعید مخزومی سے تلمیح کی اور اجازت حاصل کی۔

## اصلاح و ارشاد اور رجوع عام

ظاہری و باطنی تکمیل کے بعد اصلاح و ارشاد کی طرف متوجہ ہوئے، ہند درس، اور سند ارشاد کو بیک وقت زینت دی، اپنے استاد شیخ مخزومی کے مدرسہ میں تدریس اور وعظ کا سلسلہ شروع کیا، بہت جلد مدرسہ کی توسیع کی ضرورت پیش آگئی، مخلصین نے عمارت میں اضافہ کر کے اس کو آپ کی مجالس کے قابل بنا دیا، لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ مدرسہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی، سارا بغداد آپ کے مواعظ پر ٹوٹ پڑا، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسی وجاہت و قبولیت عطا فرمائی جو بڑے بڑے بادشاہوں کو نصیب نہیں، شیخ موفق الدین ابن قدامہ صاحب معنی کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی آپ سے بڑھ کر دین کی وجہ سے تعظیم ہوتے نہیں دیکھی، بادشاہ اور وزراء آپ کی مجالس میں نیاز مندانہ حاضر ہوتے اور آپ سے بیٹھ جاتے، علماء و فقہاء کا کچھ شمارہ نہ تھا، ایک ایک مجلس میں چار چار سو دو اتیس شمار کی گئی ہیں، جو آپ کے ارشادات قلب بند کرنے کے لئے لائی جاتیں۔

## محامد و اخلاق

بایں رفعت و منزلت حد درجہ متواضع اور منکر المزاج تھے، ایک بچہ اور ایک لڑکی بھی

۱۰ شرفانی نے لکھا ہے کہ مریدین کی تربیت میں ان کو بلند مقام حاصل تھا، اور بغداد کے اکثر شایخ اور صوفیاء انہی سے وابستہ تھے، ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا طبقاً الکبریٰ ج ۱ ص ۱۳۱ ۱۰ اصل نام مبارک بن علی بن اسعین، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ انہوں نے حدیث کا سماع، اور امام احمد کے مذہب پر علوم مذہبی میں کمال پیدا کیا، اور زیادہ تر مناظرہ اور درس اقرار سے مشغولیت رکھی، ستودہ صفا معتدل مسلک رکھنے والے اور اپنے فیصلوں

میں بہت صاحب الرائے تھے، ۵۵۰ھ میں وفات پائی۔ ۱۰ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذیل طبقات احنابلہ (ابن رجب)

باجد کے لگتی تو کھڑے ہو کر سنتے اور اس کا کام کرتے، غریبوں اور فقراء کے پاس بیٹھتے، اور ان کے کپڑوں کو صاف کرتے، جوں نکالتے، لیکن اس کے برسات کسی معزز آدمی اور ارکانِ سلطنت کی تعظیم میں کھڑے نہ ہوتے، خلیفہ کی آمد ہوتی تو قصداً دولت خانہ میں تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ خلیفہ آکر بیٹھ جاتا، پھر برآمد ہوتے، تاکہ تعظیماً کھڑا نہ ہونا پڑے، کبھی کسی وزیر یا سلطان کے دروازہ نہیں گئے۔<sup>۱۱۱</sup>

آپ کے دیکھنے والے اور آپ کے معاصرین آپ کے حسنِ اخلاق، علوِ حوصلہ، تواضع و انکسار، سخاوت و ایثار اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، ایک بزرگ (حزادہ) جنہوں نے بڑی طویل عمر پائی، اور بہت بزرگوں اور ناموروں کو دیکھا، اور ان کی صحبت اٹھائی، فرماتے ہیں:-

ماریت عینای احسن خلاقاً و اوسع	میری آنکھوں نے حضرت شیخ عبدالقادر سے بڑھ کر
صدراً و کراماً و کرم نفاً و لا الطفت قلباً	کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، کریم نفس، رقیب القلب
و لا لفظ عہداً و وداً من سیدنا الشیخ	محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا نہیں دیکھا، آپ
عبدالقادر و لقد کان مع جلالۃ قدما	عظمت اور علو مرتبت اور وسعت علم کے باوجود چھوٹے
و علوم منزلة و سعة علمہ یقف	کی رعایت فرماتے، بڑے کی توقیر کرتے، سلام میں سبقت
مع الصغیر و یوقر الکبیر و ید اباً بالاب	فرماتے، کمزوروں کے پاس اٹھے بیٹھے، غریبوں کے ساتھ
و یمالی الضعفاء و تواضع للفقراء	تواضع و انکساری سے پیش آتے، حالانکہ آپ کسی
و ما قام لاحد من العظماء و لا الاعیان	سربرآوردہ یا رئیس کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے
و لا الترمباب و وزیر و لا سلطان	اور نہ کسی وزیر یا حاکم کے دروازہ پر گئے۔

الامام الحافظ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف البرزالی الاصبہلی ان الفاظ میں آپ کی تعریف کرتے ہیں:-

کان مجاب الدعوة سریع الدمعة آپ ستجاب الدعوات تھے، اگر کوئی عبرت اور

لہ الطبقات الکبریٰ للشعرازی ج ۱ ص ۱۲۷ ۱۲۸ ایضاً ص ۱۲۹ ایضاً

دائم الذکر کثیر الفکر رقیق القلب  
 دائم البشر کریم النفس، متحنی الید  
 رقت کی بات کی جاتی تو جلدی آنکھوں میں آنسو  
 آجاتے ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے بڑے رقیق  
 اقلب تھے اخذہ پشانی، شگفتہ رو کریم النفس  
 غزیر العلم، شریف الاخلاق، طیب  
 فرخ دست، وسیع العلم بلند اخلاق، عالی نسب  
 الاعراق مع قدم راسخ فی العبادۃ  
 و الاجتهاد،

مفتی عراق محی الدین ابو عبد اللہ محمد بن حامد البغدادی لکھتے ہیں۔

ایحد الناس عن الفحش اقرب  
 الناس الی الحق شدید الباس  
 غیر مہذب بات سے انتہائی دودھن اور معقول  
 بات بہت قریب اگر احکام خداوندی اور  
 حد الہی میں کسی پر دست درازی ہوتی تو آپ کو  
 اذانتھکت محارم اللہ عزوجل  
 لا یغضب لنفسہ ولا ینتصر لغيرہ  
 جلال آجاتا، خود اپنے معاملہ میں کبھی غصہ نہ آتا، او  
 الشرع و جل کے علاوہ کسی چیز کے لئے انتقام نہ لیتے  
 کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرتے خواہ بدن کا  
 کپڑا ہی کیوں نہ اتار کر دینا پڑے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ضرورت مندوں پر بے دریغ خرچ کرنے کا خاص ذوق تھا، علامہ ابن  
 النجار آپ سے نقل کرتے ہیں کہ "اگر ساری دنیا کی (دولت) میرے قبضہ میں ہوتی میں بھوکوں کو کھانا کھلا دوں  
 یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری ستمیلی میں سوراخ ہے، کوئی چیز اس میں ٹھہرتی نہیں اگر ہزار  
 دینار میرے پاس آئیں تو رات نہ گزرنے پائے، صاحب "قلائد البواہر" لکھتے ہیں کہ حکم تھا کہ رات کو وسیع  
 دسترخوان بچھے، خود بہانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، کمزوروں اور غریبوں کی ہم نشینی فرماتے،

لہ قلائد البواہر ص ۹

۵۲ ایضاً

طلبہ کی باتوں کو برداشت کرتے اور تحمل فرماتے ہر شخص یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی ان کا مقرب اور ان کی یہاں معزز نہیں، ساتھیوں میں سے جو غیر حاضر ہوتا، اس کا حال دریافت فرماتے اور اس کی فکر رکھتے، تعلقات کا بڑا پاس اور کاٹھا، غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرتے، اگر کوئی کسی بات پر تم کھا لیتا تو اس کو مان لیتے اور جو کچھ (حقیقت حال جانتے تھے) اس کا اخفاء فرماتے۔<sup>۱۵</sup>

## مردہ دلوں کی مسیحائی

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامت کی کثرت پر مورخین کا اتفاق ہے، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام اور امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ شیخ کی کرامات حد تو اترو کو پہنچ گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی کرامت مردہ دلوں کی مسیحائی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی، آپ کا وجود اسلام کے لئے ایک باد بہاری تھا، جس نے دلوں کے قبرستان میں نئی جان ڈال دی، اور عالم اسلام میں ایمان و روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی، شیخ عمر کیسانی کہتے ہیں کہ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام نہ قبول کرتے ہوں، اور رہزن خونخوار اور جرائم پیشہ توبہ سے مشرف نہ ہوتے ہوں، فاسد الاعتقاد اپنے غلط عقائد سے توبہ نہ کرتے ہوں۔<sup>۱۶</sup>

جیانی کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہوتی ہے کہ زمانہ سابق کی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں رہوں، نہ مخلوق مجھے دیکھے، نہ میں اس کو دیکھوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا نفع منظور ہے، میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں، عیاروں اور جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔<sup>۱۷</sup>

مورخین کا بیان ہے کہ بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ حضرت کے ہاتھ پر توبہ سے مشرف ہوا، اور

<sup>۱۵</sup> تلامذہ ابوالہر ص ۹۰ ذیل طبقات الخصال ابن ربیع ص ۱۳۰ بلار العینین ص ۱۳۰-۱۳۱ تلامذہ ابوالہر مختلف کتب تذکرہ



بکثرت یہودی، عیسائی، اور اہل ذمہ مسلمان ہوئے۔

## تعلیمی مشاغل و خدمات

اعلیٰ مراتب ولایت پر فائز ہونے اور نفوس و اخلاق کی اصلاح و تربیت میں بہترین مشغول ہونے کے ساتھ آپ درس و تدریس، افتاء اور تصحیح اعتقاد اور مذہب اہل سنت کی نصرت و حمایت سے غافل نہ تھے، عقائد و اصول میں امام احمد اور محدثین کے مسلک پر تھے، مذہب اہل سنت اور سلف کے مسلک کو آپ بڑی تقویت حاصل ہوئی، اور اس کے مقابلہ میں اعتقادی و علمی بدعات کا بازار سرد ہو گیا ابن السمعانی کہتے ہیں کہ تابعین سنت کی شان آپ کی وجہ سے بڑھ گئی، اور ان کا پورا بھاری ہو گیا۔

مدرسہ میں ایک سبق تفسیر کا، ایک حدیث کا، ایک فقہ کا اور ایک اختلافات ائمہ اور ان کے دلائل کا پڑھاتے تھے، صبح شام تفسیر، حدیث، فقہ، مذاہب ائمہ، اصول فقہ اور نحو کے اسباق ہوتے، ظہر کے بعد تجوید کی تعلیم ہوتی، اس کے علاوہ افتاء کی مشغولیت تھی، بالعموم مذہب شافعی اور مذہب حنبلی کے مطابق فتویٰ دیتے، علماء عراق آپ کے فتاویٰ سے بڑے متعجب ہوتے اور بڑی تعریف کرتے۔

ایک مرتبہ استفقاء آیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ کوئی ایسی عبادت کرے گا جس میں عبادت کے وقت کوئی دوسرا شریک نہیں ہوگا، اگر اس نے قسم پوری نہیں کی تو اس کی بیوی کو تین طلاق، علماء استفقاء سن کر حیرت میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی عبادت ہو سکتی ہے جس میں وہ بالکل تنہا ہو اور روئے زمین پر کوئی شخص بھی اس وقت وہ عبادت نہ کر رہا ہو، حضرت شیخ زہ کے پاس استفقاء آیا تو بے تکلف فرمایا کہ سلطان اس کے لئے خالی کر دیا جائے، اور وہ سات چکر کر کے خانہ کعبہ کا طواف تنہا مکمل کرے، علمائے یہ جو اب سن کر بے ساختہ داد تحسین دی اور کہا کہ یہی ایک صورت ہے کہ وہ بلا شرکت غیرے عبادت کرے اور اپنی

لے قلائد الجواہر و مختلف کتب تذکرہ۔ ۲۵ الطبقات الکبریٰ للشرانی ج ۱ ص ۱۲۶، و طبقات احنابلہ ابن رجب۔

قسم پوری کرے اس لئے کہ طواف بیت الشریعہ موقوف ہے اور مطاف اس شخص کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اب اس عبادت میں کہیں بھی شرکت کا امکان نہیں ہے۔

## استقامت و تحقیق

حضرت شیخ استقامت کا پہاڑ تھے، اتباع کامل، علم راسخ، اور تائید غیبی نے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ حق و باطل، نور و ظلمت، الہام صحیح اور کید شیطانی میں پورا امتیاز پیدا ہو گیا تھا آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ شریعت محمدی کے احکام اور حلال و حرام میں قیامت تک کے لئے تغیر و تبدل کا امکان نہیں، جو اس کے خلاف دعویٰ کرے، وہ شیطان ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے، اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی، اس نے مجھ سے خطاب کر کے کہا کہ اے عبد القادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے ہیں، میں نے کہا دور ہو مردود! یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت سے بدل گئی، اور وہ صورت دھواں بن گئی، اور ایک آواز آئی کہ عبد القادر! خدا نے تم کو تمہارے علم و تفقہ کی وجہ سے بچا لیا، ورنہ اس طرح میں شتر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں، میں نے کہا کہ اللہ کی ہر بانی ہے، کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے، فرمایا اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔"

یہی آپ کا ارشاد ہے کہ اگر حدود الہی (احکام شرعی) میں سے کوئی حد ٹوٹی ہو تو سمجھ لو کہ تم فتنہ میں پڑ گئے ہو، اور شیطان تم سے کھیل رہا ہے، فوراً شریعت کی طرف رجوع کرو، اس کو مضبوطی سے تھام لو، نفس کی خواہشات کو جواب دو، اس لئے کہ ہر وہ حقیقت جس کی شریعت تائید نہیں کرتی، باطل ہے۔

لے الطبقات الکبریٰ للشیرازی ج ۱ ص ۱۲۶، و طبقات الخصال (ابن عربی) ص ۱۲۴ ایضاً۔

## تفویض و توجید

تسلیم و تفویض اور توجیدِ کامل حضرت کا خصوصی حال تھا، کبھی کبھی تعلیماً اس حال اور اس مقام کی تشریح فرماتے تھے، وہ دراصل آپ کا حال ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سز دلبران  
گفتہ آید در حدیث دیگران

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

”جب بندہ کسی بلا میں مبتلا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اگر نجات نہیں پاتا، تو مخلوقات میں سے اوروں سے مدد مانگتا ہے، مثلاً بادشاہوں یا حاکموں یا دنیا داروں یا امیروں اور درودکھ میں طلبیوں سے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا اس وقت اپنے پروردگار کی طرف دعا اور گریہ و زاری و حمد و ثنا کے ساتھ رجوع کرتا ہے (یعنی) جب تک اپنے نفس سے مدد مل جاتی ہے، خلق سے رجوع نہیں کرتا، اور جب تک خلق سے مدد مل جاتی ہے، خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، پھر جب خدا کی طرف سے (بھی) کوئی مدد نظر نہیں آتی تو (بے بس ہو کر) خدا کے ہاتھوں میں آ رہتا ہے اور ہمیشہ سوال و دعا اور گریہ و زاری اور تالیس و اظہار حاجت مندی، امید و بیم کے ساتھ کیا کرتا ہے، پھر خدا اس کو دعا سے (بھی) تھکا دیتا ہے اور قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ کل اسباب (مقطع ہو جاتے ہیں اور وہ سب) علیحدہ ہو جاتا ہے اس وقت اس میں (احکام) قضا و قدر کا نفاذ ہوتا ہے اور اس کے اندر (خدا اپنا) کام کرتا ہے، تب بندہ کل اسباب و حرکات سے بے پروا ہو جاتا ہے اور روح صرف رہ جاتا ہے اسے فعلِ حق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور وہ ضرور بالضرور صاحبِ یقین ہو جاتا ہے، قطعی طور پر جانتا ہے کہ درحقیقت خدا کے سوا نہ کوئی (کچھ) کرنے والا ہے اور نہ حرکت و سکون دینے والا، نہ اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں اچھالی اور برائی، نفع و نقصان بخشش و حرمان کشائش و بندش، موت و زندگی، عزت

ذلت، غنا و فقر، اس وقت (احکام قضا و قدر) میں بندہ کی یہ حالت ہوتی ہے، جیسے شیر خوار بچہ دایہ کی گود میں یا مردہ غسال کے ہاتھ میں یا (پولو کا) گیند سوار کے قبضہ میں کرنا پلٹا جاتا ہے اور بگاڑا بنایا جاتا ہے، اس میں اپنی طرف سے کوئی حرکت نہیں، نہ اپنے لئے، نہ کسی اور کے لئے، یعنی بندہ اپنے مالک کے فعل میں اپنے نفس میں غائب ہو جاتا ہے اور اپنے مالک و اس کے فعل کے سوا نہ کچھ دیکھتا سنتا ہے، نہ کچھ سوچتا سمجھتا، اگر دیکھتا ہے تو اس کی صنعت اور اگر سنتا ہے تو اسی کا کلام، اس کے علم سے (بہر چیز کو) جانتا ہے، اس کی نعمت سے لطف اٹھاتا ہے، اس کے قریب سے سعادت پاتا ہے، اس کی تقریب (جاہلیہ) سے آرامتہ پیراستہ ہوتا ہے، اس کے وعدہ سے خوش ہوتا ہے، سکون پاتا اور اطمینان حاصل کرتا ہے، اس کی باتوں سے مانوس ہوتا ہے، اور اس کے غیر سے وحشت و نفرت کرتا ہے، اس کی یاد میں سرنگوں ہوتا اور جی لگاتا ہے، اس کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے، اس کے توڑ معرفت سے ہدایت پاتا اور اس کا خرقہ لباس پہنتا ہے، اس کے علوم عجیب و نادر پر مطلع ہوتا ہے، اس کے قدرت کے اسرار سے مشرف ہوتا ہے، اس کی ذات پاک سے (بہر بات سنتا اور اسے یاد رکھتا ہے، پھر ان (نعمتوں) پر حمد و ثنا و شکر و سپاس کرتا ہے؛

## خلق خدا پر شفقت

عامۃ الناس اور امت محمدیہ کے ساتھ آپ کو جو تعلق، جو فکر اور اس کے حال پر جو شفقت تھی، اور جو نائبین رسول اور مقبولین کی خاص علامت ہے، اس کا اندازہ آپ کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جس میں آپ نے بازار میں جانے والوں کے احوال و مراتب بیان کئے ہیں، ان میں آخری مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اور دراصل حدیث دیگر ان میں اپنا ہی حال اور مقام بیان کرتے ہیں۔ اور پانچواں وہ شخص ہے کہ جب بازار میں داخل ہوتا ہے تو اہل شہر سے ان کا دل بھر جاتا ہے، ان لوگوں پر

رحمت کرنے کے لئے، اور یہ رحمت اسے کچھ دیکھنے ہی نہیں دیتی کہ ان لوگوں کے پاس کیا کچھ ہے، وہ تو اپنے داخلہ کے وقت سے باہر نکلنے کے وقت تک بازار والوں کے لئے دعا و استغفار و شفاعت میں اور ان پر رحمت و شفقت میں مشغول رہتا ہے، اس کا دل ان لوگوں کے لئے ان کے حال پر جلتا رہتا ہے اور آنکھیں روتی رہتی ہیں اور زبان ان نعمتوں پر جو خدا نے ان لوگوں کو اپنے فضل سے دی ہیں، خدا کا شکر اور اس کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہے۔

## حضرت شیخ کا عہد اور ماحول

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد میں ۳۷۳ سال گزائے اور عباسی خلفاء میں پانچ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مستد خلافت پر بیٹھے، جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستنصر باللہ ابو العباس (م ۵۱۲ھ) کا عہد تھا، ان کے بعد بالترتیب مستنصر راشد المقتضی لامر اللہ و المتعبد باللہ تحت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

شیخ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے، سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اس زمانہ میں پورے عروج پر تھی، یہ سلاطین عباسی حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں تھے، کبھی خلیفہ کی رضامندی کے ساتھ اور کبھی اس کی مخالفت و ناراضی کے باوجود، کبھی کبھی خلیفہ اور سلطان کے لشکروں میں باقاعدہ معرکہ آرائی بھی ہوتی، اور مسلمان ایک دوسرے کے بے دریغ خون بہاتے۔ اس طرح کے واقعات مستنصر کے زمانہ میں کئی مرتبہ پیش آئے، یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور معقول خلیفہ تھا، اور اکثر معرکوں میں فتح بھی اسی کو حاصل ہوتی، لیکن ۱۰ رمضان ۵۱۹ھ میں سلطان سعود

لے فتوح الغیب مقالہ (۷۲) ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کا کوروی (روز الغیب) ص ۱۷۵ ابن کثیر نے اس کے مناقب میں

لکھا ہے کہ مستنصر بہت شجاع، مصلحت مند، فصیح و بلیغ، شیریں کلام اور بہت عبادت گزار خلیفہ تھا، اور خاص عام (باقی ص ۲۰۷)

اور اس کے درمیان جو معرکہ ہوا اس میں اس کو شکست فاش ہوئی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں۔

• سلطان کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی، خلیفہ قید کر لیا گیا، اہل بغداد کی املاک کو لوٹ لیا گیا، اور یہ خبر دوسرے تمام صوبوں میں پھیل گئی، بغداد اس المناک خبر سے بہت متاثر ہوا، اور وہاں کے باشندے میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آگیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوالی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں اور خلیفہ کی قید، اور اس کی پریشانیوں و مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اور اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے، ملک سخر نے یہ اجوا دیکھ کر اپنے بھتیجے کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کر دے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی، لیکن خلیفہ کو باطنیوں نے بغداد کے راستے میں قتل کر دیا۔

یہ تمام الم انگیز واقعات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نگاہوں کے سامنے گزریں، انھوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق و خانہ جنگی اور دشمنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کی محبت کی خاطر اور ملک و سلطنت اور جاہ و مرتبہ کے حصول کے لئے لوگ سب کچھ کر گزرتے پر آمادہ ہیں، اور ان کو صرف دربار کی شان و شوکت سے دلچسپی باقی رہ گئی ہے، وہ اہل سلطنت کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں، اور صوبوں اور شہروں کی حکومت حاصل کرنے کے لئے سر دھڑکی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مادی وجود خواہ ان واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو، لیکن اپنے شعور و احساس کے ساتھ وہ اسی آگ میں جل رہے تھے، اور اسی سوز و زور نے ان کو پوری ہمت و طاقت اور اخلاص

(باقی صفحہ ۲۰۸ کا) سب کی نظروں میں محبوب تھا، وہ آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم برقرار رکھی، ۳۵ سال ۱۲۳۰ء

کی عمر میں اس کو تنہید کر دیا گیا، اس کی مدت خلافت ۷۷ سال اور ۲۰ روز ہے (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲۰۷)

کے ساتھ وعظ و ارشاد، دعوت و تربیت، اصلاح نفوس اور تزکیہ قلوب کی طرف متوجہ کیا، اور انھوں نے نفاق اور حسد دنیا کی تحقیر و تذلیل، ایمانی شعور کے احیاء عقیدہ آخرت کی تذکیر اور اس سرے فانی کی بے ثباتی کے مقابلہ میں اس حیات جاودانی کی اہمیت، تہذیب اخلاق، توحید خالص اور اخلاص کامل کی دعوت پر سارا زور صرف کر دیا۔

## مواعظ و خطبات

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے، اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے، فتوح الغیب اور الفتح الربانی کے مضامین اور آپ کی مجالس کے وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گراتے ہیں، ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے نابین اور عارفین کا ملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب و سامعین اور مخاطبین کے حالات و ضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا اور جن مغالطوں میں گرفتار تھے، انھیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اسی لئے حاضرین آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کا مرہم اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات و شبہات کا جواب پاتے تھے، اور تاثیر اور عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے، وہ دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت و عظمت بھی ہے، اور دل آویزی اور صلاوت بھی، اور صدیقین کے کلام کی یہی شان ہے۔

## توحید خالص اور غیر الشری بے حقیقتی

اس وقت ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا، لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ لیا تھا، اسباب کو اسباب کا درجہ دے دیا گیا

تھا، اور قضا و قدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا ایک ایسی فہم میں حضرت شیخ فرماتے ہیں۔

”کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور رعیت دابٹل ہلا دینے والا ہے، ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست پاٹ بہت بڑا تھا، بہت گہری بہاؤ بہت زوروں پر ہے، لٹکا دیا ہے اور تو ایک نفیس اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے، جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اب ان میں سے جو چیز چاہتا ہے، اٹھا کر اس ٹکے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے تو کیا (یہ تماشا) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر بٹالے اور اس خوف و امید ترک کر دے اور ٹکے ہوئے قیدی سے امید و ہم رکھے، کیا جو شخص ایسا کرے، عقل کے نزدیک بے عقل ہے اور ایک دیوانہ چوپایہ اور انسانیت سے خارج نہیں ہے، خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی، اور وصول کے بعد جدائی اور قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر ہے۔“

ایک دوسری مجلس میں توحید و اخلاق اور ماسوائے اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:-

”اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے، اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے، اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے، اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا، اور تم کو چہل کی تار کیوں نکال لے گا، اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کرے گا، تم کو تمہاری سزا بند اور بدبو اور پست بہتی اور نفس بدکار و رقیقان گمراہ و گمراہ کن سے نجات دے گا، جو شیاطین خواہشیں اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو نفیس اور ہر عمدہ اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت؟ کب تک خلق؟ کب تک خواہش؟ کب تک



رعونت؟ کب تک دنیا؟ کب تک آخرت؟ کب تک ماسوائے حق؟ کہاں چلے تم؟ (اس خدا کو چھوڑ کر جو) ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور بنانے والا ہے اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے، دلوں کی محبت رعوں کا اطمینان، گرائیوں سے بیکردوشی، بخشش و احسان، ان سب کا رجوع اسی کی طرف سے اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے۔<sup>۱</sup>

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح و اشکاف بیان فرماتے ہیں:-

”ساری مخلوق عاجز ہے، نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، بس حق تعالیٰ اس کو ان ہاتھوں کر دیتا ہے، اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے، جو کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے، اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، جو موجد اور نیکو کار ہیں، وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں، جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں، گو دولت مند ہیں، مگر حق تعالیٰ ان کے اندروں پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ہیں، جو صاف ہیں، جو شخص اس پر قادر ہو، اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی، اور کما بہادر پہلو ان ہے، بہادر رہی ہے جس نے اپنے قلب کو ماسوائے اللہ سے پاک بنایا، اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا، اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے، شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے، اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں۔“<sup>۲</sup>

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پر، اپنے دیناروں پر، اپنے درہموں پر، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر، ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرنے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص

۱۔ رموز الغیب مقالہ (۶۲) ص ۱۵۴ فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی، مجلس ۱۳ ص ۱۹

جس سے خوف کرے یا توقع رکھے، وہ تیرا معبود ہے اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی اس کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے تو وہ تیرا معبود ہے۔  
ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرکار سے نفرت اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

تم اگر کہتے ہو گے اور کہو گے میں جس سے محبت کرتا ہوں اس کی میری محبت رہنے نہیں پاتی اور خشنہ پڑ جاتا ہے یا تو جدائی ہو جاتی ہے یا وہ مرجاتا ہے یا بخش ہو جاتی ہے اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے اس نے تم کو اس لئے پیدا کیا اور تم غیر کے ہو رہنا چاہتے ہو کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے اور وہ اسے اور یہ ارشاد کہ میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے بتلا کرتا ہے پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے عرض کیا گیا یا رسول اللہ رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی اور خدا سے جو محبت اسے ہے متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا، وہ غیور ہے اور ہر چیز پر غالب زبردست تو وہ اپنے شریک کو ہلاک و معدوم کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے بندہ کے دل کو خالص کرے خاص اپنے لئے بغیر شریک کے اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آجاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو

دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ اسے یہاں تک کر دل جب (خدا کے ان مہنوی) شریکیوں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل و عیال، دولت و لذت اور خواہشیں ہیں، نیز ولایت و ریاست کرامات و حالات، منازل و مقالات، جنتوں اور درجات اور قرب و نزدیکی کی طلب سے پاک صاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے، جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے، خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے، تب اس کے دل کے گرد عظمت و جبروت و ہیبت کے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور اس کے گرد اگر دُکریائی اور سطوت کی خندقیں کھودی جاتی ہیں کہ دل میں کسی چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا، اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل و عیال و اصحاب اور کرامات و حکم و بیانات کچھ مضر نہیں ہوتے، کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں، تب اللہ تعالیٰ ان سے غیرت نہیں کرتا، بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لئے بطور لطف و کرامت و رزق و نعمت کے ہوتی ہیں اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں، انھیں نفع پہنچانے کے لئے لے

## شکستہ دلوں کی تسکین

حضرت شیخ کے زمانہ میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اپنے اعمال و اخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا، اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشرتی حیثیت سے پست اور دنیاوی ترقیات سے محروم، بے بضاعت و تہی دست، لیکن اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات و ترقیات سے بہرہ مند تھا، وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا، اور اپنے کسی وقت محروم و نامراد سمجھنے لگتا تھا، حضرت شیخ اس شکستہ دل

طبقت کی دیکھائی فرماتے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات ہیں ان کا ذکر فرماتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

”اے خالی ہاتھ فقیر! وہ کہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے اے گناہ اے بھوکے پیاسے ننگے، بگڑھلے ہوئے اے ہر مسجد و خرابی سے نکالے ہوئے اے ہر در سے پھٹکائے ہوئے اے وہ کہ ہر مراد سے محروم خاک پر پڑا ہے اے وہ کہ جس کے دل میں (مٹی ہوئی) آرزوؤں اور رامتوں کے (کشتوں کے) پستے لگے ہیں امت کہ خدا نے تجھ کو محتاج کر دیا، دنیا کو تجھ سے پھیر دیا، تجھے پامال کر دیا، چھوڑ دیا، تجھ سے دشمنی کی، تجھے پریشان کیا اور جمعیت (خاطر) نہ بخشی، تجھے ذلیل کیا اور دنیا سے میری کفایت نہ کی، تجھے گناہ کیا، اور خلق میں او میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا، اور غیر پر اپنی تمام نعمتیں نچھاور کر دیں جس میں اس کے رات دن گزرتے ہیں اے مجھ پر اور میرے دیار والوں پر فضیلت دی، حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے اور میں بھی اور ایک ماں باپ آدم و حوا کی اولاد میں و نون میں (اے فقیر) خدا نے تیرے ساتھ یہ بتاؤ اس لئے کیا ہے کہ تیری سرشت ٹیاز میں (کے مثل) بے ریت ہے اور رحمت حق کی بارشیں برابر تجھ پر ہو رہی ہیں از قسم صبر و رضا و یقین موافقت و علم اور ایمان و توحید کے انوار تیرے گرد اگر وہیں تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیج اپنی جگہ پر مضبوط ہے، کلمے سے رہا ہے، پھل رہا ہے، بڑھ رہا ہے، شاخیں پھیلا رہا ہے، سایہ سے رہا ہے، بلند ہو رہا ہے، روزانہ زیادتی اور نمو میں ہے، اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھا دینے کی ضرورت نہیں، اس بارہ میں خداوند تعالیٰ تیرے حکم سے فارغ ہے (کہ وہ خود تیری ضروریات کو بخوبی جانتا ہے) اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے، اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے اور عقبی میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کان نے سنی، نہ کسی انسان کے دل میں گزریں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کون سی آنکھوں کی ٹھنڈکان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے اس کا کہ بدلہ میں جو وہ کرتے رہے ہیں یعنی جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے

احکام کی بجا آوری ممنوعات کے ترک پر صبر، مقدرات میں تفویض تسلیم اور کل امور میں خدا کی موافقت کی ہے۔

اور وہ غیر جسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے اور نعمت دنیاوی دی، اور اس پر اپنا فضل فرمایا، اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ ریلی اور پتھری زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرنا اور درخت اگنا اور پھل کا پیدا ہونا وقت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو، اور وہ کھاد دنیا اس کا سامان ہے تاکہ اس سے درخت ایمان اور نہال اعمال کی جو اس زمین میں لگے ہیں، حفاظت ہو، اگر یہ چیز اس سے علیحدہ کر دی جائے تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے، اور پھل جاتے رہیں گے، پس گھر ہی اجڑ جائے گا، حالانکہ خداوند تعالیٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اے فقیر! دلتند آدمی کا درخت ایمان کمزور جزا کا ہوتا ہے، اور اس قوت سے خالی جو تیرے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے، اس کی مضبوطی، اور اس کا ٹکاؤ انہی چیزوں سے ہے جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس سمجھ کو نظر آتی ہیں، اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کر دی جائیں، تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار (پیدا) ہو جائے گا، اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا، البتہ (اگر) خداوند تعالیٰ دلت مند کی طرف صبر و رضا و یقین علم اور طرح طرح کی معرفتوں کے لشکر بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تو نگری اور نعمتوں کے علیحدہ ہوجانے

کی نہ پروا رہے گی!

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرت شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں، وہ دنیا کے استعمال اور اس کے بقدر ضرورت

انتفاع سے منع نہیں فرماتے اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں،

ان کے مواعظ و حقیقت حدیث نبوی "انّ الدّٰنیا خلقت لکم و انکم خلقتم للآخرة" (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی (یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر میں ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

• دنیا میں سے اپنا مقوم اس طرح مت کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو بلکہ اس کو بادشاہ کے

دروازہ پر اس طرح کھا کہ تو بیٹھا ہو اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی

ہے اس کی جو حق تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے اس کو

ذیل کرتی ہے کھاجی تعالیٰ کے ساتھ عزت و تو نگری کے قدم پر!

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:-

"دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جیب رکھنا جائز، باقی

قلب میں رکھنا جائز نہیں (کہ دل سے بھی محبوب سمجھنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز، باقی

دروازہ سے آگے گھسنا جائز ہے، نہ تیرے لئے عزت ہے؟

## خلفاء اور حکام وقت پر تنقید

حضرت شیخ صرف مواعظ، پند و نصیحت اور ترغیب و تشویق ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، جہاں

ضرورت سمجھتے تھے، بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام

دیتے، حکام و سلاطین اور خلیفہ وقت پر بھی تنقید اور ان کے غلط افعال اور فیصلوں کی مذمت سے بھی باز

نہیں رہتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی وجاہت اور اثر و نفوذ کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، حافظ

عبدالدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:-

کان یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر  
للخلفاء والوزراء والسلاطین والقضاة  
والخاصة والعامۃ یصدعہم بذلک  
علی رؤس الاشهاد ورؤس المناہر فی  
المحافل وینکر علی من یوتی الظلمۃ  
ولا تاخذہ فی اللہ لومة لائمہ

آپ خلفاء و وزراء، سلاطین، قضاة خواص و عوام  
سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے اور بڑی  
صفائی اور جرأت کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور  
برسر منبر علی الاعلان ٹوک دیتے، جو کسی ظالم کو حاکم  
بناتا، اس پر اعتراض کرتے اور خدا کے معاملے میں  
کسی ملامت کرنے والے کی آپ کو پرواہ نہ ہوتی۔

صاحب "قلندار جواہر" لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ مقتدی لامر اللہ نے قاضی ابوالوفاریحی بن سعید بن یحییٰ بن لطف کو  
قاضی بنایا جو ابن المرجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا تو حضرت نے برسر منبر خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔  
ولیت علی المسلمین اظلم الظالمین  
ما جوابک خدا عند رب العالین  
ارحم الراحمین۔

تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو  
اظلم الظالمین ہے کل کو قیامت دن تم اس رب  
العالین کو جو رحم الراحمین ہے کیا جواب دو گے؟

موتخ موصوف کا بیان ہے کہ خلیفہ یہ سن کر رزہ بر اندام ہو گیا، اور اس پر گریہ طاری ہو گیا، اور اس نے  
اسی وقت قاضی کو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔

حضرت شیخ ان درباری سرکاری "علماء اور مشائخ کی بھی پر زور تردید اور پردہ دری فرماتے تھے، جنہوں نے  
سلاطین اور ناخدا نرس حکام کی مصاحبت اختیار کی تھی اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا شعار تھا جن کی  
وجہ سے ان سلاطین و حکاکو زیادہ جرأت اور بے خونی پیدا ہو گئی تھی، ایک موقع پر اسی طبقہ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔  
"اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت! اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو!  
اے بندگان خدا کے ڈاکو! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں (بتلا) ہو یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے علمو"

۱۰۰ قلندار جواہر ص ۱۰۰ ایضاً

اور اے زاہد و ایشا ہاں و سلاطین کے لئے کب تک منافق بنے رہو گے کہ ان کے دنیا کا زرد مال اور اس کی شہوات و لذات لیتے رہو تم اور اکثر بادشاہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں؛ بار الہا انفقوں کی شوکت توڑ دے اور ان کو ذلیل فرمایا ان کو توبہ کی توفیق دے اور ظالموں کا قلع ترح فرما، اور زمین کو ان سے پاک کر دے، یا ان کی اصلاح فرما۔  
ایک دوسرے موقع پر اسی طبقہ کے ایک فرد کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فرماتے ہیں:-  
”تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری حرص نے تجھ کو ظالموں کی خدمت گاری اور حرام فوری پر آمادہ کر دیا تو کب تک حرام کھاتا اور دنیا کے ان (ظالم) بادشاہوں کا خدمت گار بنا رہے گا جن کی خدمت میں لگا ہوا ہے ان کی بادشاہت عنقریب مٹ جائے گی اور تجھے حق تعالیٰ کی خدمت میں آنا پڑے گا جس کی ذات کو کبھی زوال نہیں ہے۔“

## دین کے لئے دلسوزی اور فکر مندی

حضرت شیخ دینی اور اخلاقی انخطاط کو (جس کا سب سے بڑا مرکز خود بخود تھا) دیکھ دیکھ کر گڑھنتے تھے، اور عالم اسلام میں جو ایک عام دینی زوال رونما تھا، اس کے آثار دیکھ کر ان کے سینہ میں حمیت اسلامی اور خیریت دینی کا جوش اٹھتا تھا، وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض اوقات چھپا نہیں سکتے، اور یہ دریا ان کے خطبات اور مواظبات میں منڈاتا ہے۔  
ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:-

”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد کھری جاتی ہیں، اے باشندگان زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دین اور جو ڈھکے گیا ہے اس کو درست



کر دیں یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی، سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہئے، اے سورج، اے چاند اور اے دن  
تم سب آؤ!

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:-

”اسلام رورہا ہے، اور ان فاسقوں، اور ان بدعتیوں، گمراہوں، مکر کے کپڑے پہننے والوں، اور ایسی  
باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے (ظلم) سے جو ان میں موجود نہیں ہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے،  
اپنے تقدیر اور نظر کے سامنے والوں کی طرف خود کو رو کر امر و نہی بھی کرتے تھے اور کھاتے پیتے بھی تھے (اور رفتہ  
انتقال پا کر ایسے ہو گئے) گویا ہوئے ہی نہ تھے، تیرا دل کس قدر سخت ہے؟ کتابھی شکر کرنے اور کھیتی اور  
موشی کی نگہبانی اور مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کی خیر خواہی کرتا ہے، اور اسے دیکھ کر (خوشی کے  
ماتھے) کھلاریاں کرتا ہے، حالانکہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک ونو الے یا ذرا سی مقدار کھانا دیا  
کرتا ہے، اور تو ہر وقت اللہ کی قسم قسم کی نعمتیں شکم سیر ہو کر کھاتا رہتا ہے، مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اس کو  
مقصود ہے، نہ تو اس کو پورا کرتا ہے، اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے (بلکہ اس کے برعکس) اس کا حکم رد کرتا  
ہے، اور اس کی حدود و شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔“

## بیعت و تربیت

ان پر تاثر اور انقلاب آفریں مواعظ سے اگرچہ اہل بغداد کو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی نفع  
پہونچا، اور ہزار ہا انسانوں کی زندگی میں اس سے تبدیلی پیدا ہو گئی، لیکن زندگی کے گہرے تغیرات ہمہ گیر  
اصلاح اور مستقل تربیت کے لئے صاحب دعوت سے مستقل اور گہرے تعلق اور مسلسل اصلاح و تربیت کی  
ضرورت تھی، مجالس دعوت و ارشاد مدارس کی طرح منضبط اور مستقل تربیت گاہیں نہیں ہوتیں، جہاں

۱۷۹۹ (فیوض یزدانی) ۱۷۹۹ (فیوض یزدانی)

طالبین کی تسلسل و انضباط کے ساتھ تعلیم و تربیت اور نگرانی کی جائے، ان مجالس کے شرکار و سامعین آزاد ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ وعظ سن کر چلے جائیں، پھر بھی نہ آئیں یا ہمیشہ آتے رہیں، لیکن اپنی حالت پر قائم رہیں اور ان کی زندگی میں بدستور بڑے بڑے خلا اور دینی اور اخلاقی شکاف باقی رہیں۔

اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ مدارس کے ذریعہ سے (جن کو بہت سی رسوم و قیود کا پابند ہونا پڑتا ہے) عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جاسکتا تھا، اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی و روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں اور پابندیوں کو شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ دوبارہ قبول کرے، اس میں پھر ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اس کے افسرہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو، اور اس کے مضمحل قوی میں پھر حرکت اور نشاط پیدا ہو، اس کو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو، اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے، ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ خلافت جس کا یہ اصلی فرض تھا (اس لئے کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر یہ خلافت قائم تھی، بقول سیدنا عمر ابن عبدالعزیز وہ ہدایت کے لئے مبعوث ہوا تھا، جہاں تک تحصیل و حصول کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے فافل اور کنارہ کش ہو چکی تھی، بلکہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کے لئے مضر اور اس کے راستہ میں مزاحم تھی، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھی کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں وہ قیادت اور ریاست کی آمیزش پاتی، برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس کو فوراً کچل دیتی۔

ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ایمان و عمل اور اتباع شریعت کے لئے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی

سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں اور پھر وہ نائبِ پیغمبران کی دینی نگرانی اور تربیت کرنے اپنی کمی یا اثرِ صحبت اپنے شعراءِ محبت اپنی استقامت اور اپنے نفسِ گرم سے پھر ایمانی حرارت گری محبتِ خلوص و لہیتِ جذبہٴ اتباعِ سنت اور شوقِ آخرت پیدا کر دے ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کر انھوں نے ایک نئی زندگی سے توبہ کی ہے اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ بٹھے دیا ہے وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے اور اس محبت و اعتماد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے پھر اپنے تجربہ و اجتہاد اور کتاب و سنت کے اصول و تعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان و احتسابِ اخلاص اور ان کے اعمال و عبادات میں کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت و تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں اجاب و تجدید دین اور اصلاحِ مسلمین کا کام لیا ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا کو حقیقتِ ایمان اور درجہٴ احسان تک پہنچا دیا ہے اس سلسلہٴ زریں کے سر حلقہ اور گلِ سرسبد حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کا نام اور کام اس "طبِ نبوی" کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے، الفاظ و اصطلاحات اور علمی بحثوں سے الگ ہو کر اگر واقعات و حقائق پر بنیاد رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دورِ انتشار میں (جو ابھی تک قائم ہے) اصلاح و تربیت کا اس سے زیادہ سہل اور عمومی اور اس سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت شیخ سے پہلے دین کے داعیوں اور مخلص خادموں نے اس راستہ سے کام کیا ہے اور ان کی تاریخ محفوظ ہے، لیکن حضرت شیخ نے اپنی محبوب و دلاویز شخصیت، خدا داد روحانی کمالات، فطری علو استعداد اور ملکہٴ اجتہاد سے اس طریقہ کو نئی زندگی بخشی، وہ نہ صرف اس سلسلہ کے ایک نامور امام اور ایک مشہور سلسلہ (قادریہ) کے بانی ہیں، بلکہ اس فن کی نئی تدوین و ترتیب کا سہرا آپ ہی کے

سر ہے، آپ سے پہلے وہ اثنائے دن و مرتب اور مکمل و منضبط نہ تھا، نہ اس میں اتنی عمومیت اور وسعت ہوئی تھی، جتنی آپ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے پیدا ہو گئی، آپ کی زندگی میں لاکھوں انسان اس طریقہ سے فائدہ اٹھا کر ایمان کی حلاوت سے آشنا، اور اسلامی زندگی اور اخلاق سے آراستہ ہوئے اور آپ کے بعد آپ کے مخلص خلفاء اور باعظمت اہل سلسلہ نے تمام ممالک اسلامیہ میں دعوت الی اللہ اور تجدید ایمان کا یہ سلسلہ جاری رکھا، جن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا، یمن، حضرموت اور ہندوستان میں پھر حضرمی مشائخ و تجار کے ذریعہ جادہ اور سماڑ میں اور دوسری طرف افریقہ کے بڑے اعظم میں لاکھوں آدمیوں کی تکمیل ایمان اور لاکھوں غیر مسلموں کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، وارضاه وجزاه عن الاسلام خیر الجزاء۔

## زمانہ پر اثر

حضرت شیخ کا وجود اس مادیت زدہ زمانہ میں اسلام کا ایک زندہ معجزہ تھا، اور ایک بڑی تائید الہی آپ کی ذات آپ کے کمالات آپ کی تاثیر اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کی مقبولیت کے آثار اور خلق اللہ میں قبولیت و وجاہت کے کھلے ہوئے مناظر، آپ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ اصحاب کے اخلاق اور ان کی سیرت و زندگی سب اسلام کی صداقت کی دلیل اور اس کی زندگی کا ثبوت تھا، اور اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اسلام میں سچی روحانیت، تہذیب نفس اور تعلق مع اللہ پیدا کرنے کی سب سے بڑی صلاحیت ہے اور اس کا خزانہ عامرہ کبھی جو اہرات و نادرات سے خالی نہیں۔

## وفات

ایک طویل مدت تک عالم کو اپنے کمالات ظاہری و باطنی سے مستفید کر کے اور عالم اسلام میں

روحانیت اور رجوع الی اللہ کا عالمگیر ذوق پیدا کر کے ۱۵۶۱ء میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی، صاحبزادہ حضرت شرف الدین عیسیٰؒ آپ کی وفات کا حال بیان کرتے ہیں :-

• جب آپ اس مرض میں بیمار ہوئے کہ جس میں انتقال فرمایا تو آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالوہاب نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیے کہ آپ کے بعد اس پر عمل کروں فرمایا ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہو اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو اور نہ اس کے سوا کسی سے امید رکھو اور اپنے تمام ضروریات اللہ کے سپرد کرو، صرف اسی پر بھروسہ رکھو اور سب کچھ اسی سے مانگو خدا کے سوا کسی پر وثوق اور اعتماد نہ رکھو توحید اختیار کرو کہ توحید پر سب کا اجماع ہے اور فرمایا جب دل خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے تو کوئی چیز اس سے چھوٹی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس سے باہر نکل کر جاتی ہے اور فرمایا میں مغز بے پوست ہوں اور اپنے صاحبزادوں سے فرمایا میرے گرد سے ہٹ جاؤ، میں ظاہر میں تمہارے ساتھ ہوں اور باطن میں دوسروں کے ساتھ ہوں میرے پاس تمہارے سوا اور لوگ (فرشتے) حاضر ہیں ان کے لئے جگہ خالی کرو، اور ان کے ساتھ ادب کرو یہاں بڑی رحمت نازل ہے ان کے لئے جگہ تنگ نہ کرو، اور آپ بار بار فرماتے تھے تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں! اللہ میری اور تمہاری مغفرت کرے اور میری اور تمہاری توبہ قبول کرے، بسم اللہ! آؤ اور واپس نہ جاؤ، اور یہ آپ ایک دن ایک رات برابر فرماتے رہے اور فرمایا تم پر افسوس! مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں، نہ کسی فرشتہ کی، نہ ملک الموت کی، اے ملک الموت! ہمارے کارساز تھے سے زیادہ ہم کو بہت کچھ دے رکھا ہے، اور اس دن جس کی شب کو آپ نے رحلت فرمائی ایک بڑی سخت چیخ ماری تھی اور آپ کے دو صاحبزادے شیخ عبدالزاق و شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ بار بار دونوں ہاتھ اٹھا کر پھیلاتے اور فرماتے تھے، تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور برکتیں! حق کی طرف رجوع کرو، اور صفت میں داخل ہو، میں ابھی تمہارے پاس آیا، اور آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ نرمی کرو، پھر آپ پر امر حق آیا، اور موت کے نشہ نے غلبہ کیا، اور آپ نے فرمایا، میرے اور تمہارے اور

تمام خلق کے درمیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے مجھے کسی پریاس نہ کرو، اور نہ کسی کو مجھ پر پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کی تکلیف اور حال دریافت کیا تو فرمایا مجھ سے کوئی نہ پوچھے، میں علم الہی میں پٹے کھا رہا ہوں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کے مرض کو پوچھا تو فرمایا میرے مرض کو نہ کوئی جانتا ہے، اور نہ کوئی سمجھتا ہے، نہ انسان نہ جن، نہ فرشتہ، خدا کے حکم سے خدا کا علم نہیں ٹوٹتا، حکم بدل جاتا ہے، اور علم نہیں بدلتا، حکم نسوخ ہو جاتا ہے، علم نسوخ نہیں ہوتا، انشور چاہتا ہے مٹاتا ہے، اور باقی رکھتا ہے، اور اس کے پاس اصلی تحریر ہے، جو کچھ وہ کرتا ہے، اس سے باز پرس نہیں ہوتی، اور خلق سے باز پرس ہوتی ہے، صفات کی خبریں گزر رہی ہیں، جیسی آئی ہیں، پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے جسم میں کہاں تکلیف ہے؟ فرمایا میرے کل اعضاء مجھے تکلیف دے رہے ہیں، مگر میرے دل کو کوئی تکلیف نہیں، اور وہ خدا کے ساتھ صحیح ہے، پھر آپ کا وقت اخیر آیا، تو آپ فرمانے لگے میں اس خدا سے مدد چاہتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک و برتر ہے، اور زندہ ہے، جسے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں، پاک ہے، وہ جس نے اپنی قدرت سے عزت ظاہر کی، اور موت سے بندوں پر غلبہ دکھایا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ نے لفظ "تَعَزَّزَ" فرمایا اور یہ لفظ صحت کے ساتھ آپ کی زبان سے ادا نہ ہوا، تب آپ بار بار اسے دہراتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے آواز بلند اور سخت کر کے لفظ "تَعَزَّزَ" اپنی زبان سے ٹھیک ٹھیک فرمایا پھر (تین بار) اللہ اللہ اللہ فرمایا، اس کے بعد آپ کی آواز غائب ہو گئی، اور زبان تالو سے چپک گئی، اور روح مبارک رخصت ہو گئی۔ رضی اللہ عنہ و اس صلواتہ

حضرت شیخ اس دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن اپنے پیچھے دین کے داعیوں اور نفوس و اخلاق کے مربیوں

کی ایک جماعت چھوڑ گئے جس نے آپ کے کام کو جاری رکھا، اور پڑھتی ہوئی ماہیت اور عقلیت کا مقابلہ کرتے رہے۔

اے حضرت شیخ کے بعد جن عارفین و مصلحین نے دعوت و تذکیر اور تربیت نفوس کا کام پوری طاقت اور عزم و ہمت سے جاری رکھا، اور عقلیت اور دنیاوی انہماک کا مقابلہ اور اخلاقی اور نفسانی امراض کا علاج کیا، ان میں حضرت شیخ کے فیض یافتہ اور شیخ بغدادی شیخ ابوالنجیب بہروردی کے بھتیجے اور خلیفہ شیخ الشیوخ ابو حفص شیخ شہاب الدین بہروردی (۵۵۹۳-۵۶۳۲ھ) سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے، جو طریقت بہروردیہ کے بانی اور تصوف کی مقبول کتاب "عوارث العارفین" کے مصنف ہیں۔

ابن خلکان لکھتے ہیں: لم یکن فی آخر عمرہ فی عصرہ مثله وکان شیخ الشیوخ ببغداد (آخر عمر میں ان کے زمانہ میں ان کی نظیر نہ تھی) اور وہ بغداد کے سب سے بڑے شیخ اور اپنے فن میں مرجع تھے (ابن النجار کہتے ہیں: "انتهت الیہ الریاستہ فی تربیۃ المریدین ودعاء الخلق الی احدثہ") (تربیت مریدین اور دعوت الی اللہ کے کام میں وہ مرجع خلافت تھے) ابن خلکان کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے شائع دور دور سے ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور استفادہ کرتے رہتے تھے، شیخ کے مواعظ سے خلق اللہ کو بہت نفع ہوا، ابن خلکان کے الفاظ ہیں: وکان لہ مجلس وعظ وعلی وعظہ قبول کثیر ولہ نفس مبارک (وہ اہتمام سے وعظ فرمایا کرتے تھے، ان کے وعظ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت عطا فرمائی، اور ان کے انعام سے لوگوں کو بڑا نفع تھا۔)

تصوف کو بدعات سے پاک کرنے اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ بنانے کی کوشش میں حضرت شیخ کا تجدیدی حصہ ہے، ان کی کتاب "عوارث العارفین" کو اگر اس فن کی قدیم کتابوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو ان کی اس تجدیدی کام کا اندازہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ شہاب الدین کو بڑے بلند پایہ اور عالی استعداد خلفاء عظام فرمائے جنہوں نے دعوت و تربیت کا کام بڑی قوت و وسعت کے ساتھ انجام دیا، ان کے صرف ایک خلیفہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہندوستان میں جو فیض پہنچا اور خلق اللہ کو ہدایت ہوئی، وہ ان کی جلالت قدر اور عظمت شان کے لئے کافی ہے۔

(حاشیہ علی الحاشیہ) اے وفيات الاعیان ج ۳ ص ۱۱۹ (النهضة الصریہ) اے مرآة الجنان لیلیٰ فی ج ۲ ص ۱۰۰

۱۰۰ وفيات الاعیان ج ۳ ص ۱۱۹ اے نواب صدیق حسن خان مرحوم لکھتے ہیں: "در تصوف سنی کتابی بہتر از عوارث"

زیست "تقصا وچوہد الاحرار" ص ۶۳

## علامہ ابن جوزی

عبد الرحمن ابن جوزی دعوت و اصلاح کا ایک دوسرا نمونہ ہیں وہ اپنے زمانہ کے یکتائے روزگار مفسر، محدث، مورخ، ناقد، مصنف اور خطیب ہیں اور ان میں سے ہر موضوع پر ان کی ضخیم تصنیفات اور علمی کارنامے ہیں۔

### ابتدائی حالات اور تحصیل علم

شہر میں بغداد میں پیدا ہوئے، گویا حضرت شیخ سے ۲۷ سال چھوٹے ہیں، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو ماں نے مشہور محدث ابن ناصر کی مسجد میں چھوڑ دیا، ان سے حدیث سننی، قرآن مجید حفظ کیا، اور تجوید میں مہارت پیدا کی، شیوخ حدیث سے حدیث کی سماعت اور کتابت کی، اور بڑی محنت و انہماک اور جفاکشی سے علم کی تحصیل کی، اپنے صاحبزادہ سے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

مجھے خوب یاد ہے کہ میں چھ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوا، بڑی عمر کے طلبہ میرے ہم سبق تھے، مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی راستہ میں بچوں کے ساتھ کھیلا ہوں یا زور سے ہنسا ہوں، سات برس کی عمر میں جامع مسجد کے سامنے کے میدان میں چلا جایا کرتا تھا، وہاں کسی مداری یا شعبدہ باز کے حلقہ میں کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے کے بجائے محدث کے درس حدیث میں شریک ہوتا، وہ حدیث و سیرت کی جو بات کہتا، وہ مجھے زبانی



یاد ہو جاتی، پھر گھر جا کر اس کو لکھ لیتا، دوسرے لڑکے دجلہ کے کنارے کھیلا کرتے تھے، اور میں کسی کتاب کے اوراق لے کر کسی طرف چلا جاتا اور الگ تھلگ بیٹھ کر مطالعہ میں مشغول ہو جاتا۔

میں اساتذہ و شیوخ کے حلقوں میں حاضری دینے میں اس قدر جلدی کرتا تھا کہ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگتی تھی، صبح اور شام اس طرح گزرتی کہ کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مخلوق کی اجماع مندی سے بچایا<sup>۱</sup>۔

## کتابت حدیث میں انہماک

حدیث کی سماعت و کتابت میں اتنا اشتغال رہا، اور اپنے ہاتھ سے مرویات حدیث کی اتنی کتابت کی کہ بعض موجدین کا بیان ہے کہ انھوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کے غسل کا پانی اس کترن اور بڑادہ سے گرم کیا جائے جو حدیث کے لکھنے کے لئے قلم بنانے میں جمع ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اتنا تھا کہ پانی گرم ہو گیا اور وہ کچھ گرم

## ذوق مطالعہ

مطالعہ کا ذوق اور اس کی حرص بچپن ہی سے بڑھی ہوئی تھی، بغداد عظیم الشان کتابی ذخیروں اور وسیع کتب خانوں سے مالامال تھا، ابن جوزی کا محبوب مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا، ان کا مطالعہ کسی خاص فن یا موضوع سے مخصوص نہ تھا، وہ ہر موضوع کی کتابیں پڑھتے تھے، اور ان کو آسودگی نہیں ہوتی تھی، "اصید الخاطر" میں جو ان کے خیالات و تاثرات کا کشکول ہے، لکھتے ہیں:-

"میں اپنا حال عرض کرتا ہوں، میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح ریز نہیں ہوتی، جب

کوئی نئی کتاب نظر پڑ جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دفتہ ہاتھ آ گیا، اگر میں کہوں کہ میں بیس ہزار

کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو بہت زیادہ معلوم ہوگا، اور یہ طالب علمی کا ذکر ہے، مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے سلف کے حالات و اطلاق، ان کی عالی ہمتی، قوتِ حافظہ، ذوقِ عبادت اور علومِ نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا، جو ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی سطحِ پست معلوم ہوتے لگی، اور اس وقت کے طلبہ علم کی کم ہمتی منکشف ہو گئی۔

## تصنیف و تالیف اور تحریر علمی

علامہ ابن جوزی تصنیف و تالیف کی طرف نو عمری ہی سے متوجہ ہوئے، روزانہ چار جزو لکھنے کا زندگی بھر معمول رہا، حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کی تالیفات شمار کیں، تو ہزار تک پہنچیں، حدیث میں ایسا بلند پایہ رکھتے تھے کہ دعویٰ سے کہتے تھے کہ ہر حدیث کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ صحیح ہے یا حسن یا محال ہے، ادب و انشا و خطابت میں بغداد میں ان کی نظیر نہ تھی۔

## تقویٰ اور ذوقِ عبادت

ان علمی کمالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دیانت و تقویٰ اور ذوقِ عبادت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، ان کے نواسہ ابو المنظر کہتے ہیں کہ وہ ہر ہفتہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، کبھی کسی سے مذاق نہیں کیا، بچپن میں کسی بچہ کے ساتھ کھیلے نہیں، کبھی کوئی مشتبہ چیز نہیں کھائی، ساری عمر ہی حال رہا، ابن النجار کہتے ہیں کہ ان کو از ذوق صحیحہ حاصل تھی، اور صلاوت، مناجات و لذتِ دعا کے ذوق آشنا تھے، ابن الفارسی کا بیان ہے کہ شب بیدار تھے اور ذکر اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے، ان کی تصنیفات اور حالات و اشارات سے خود معلوم ہوتا ہے کہ چشمِ بنا اور دل بیدار رکھتے تھے، اور جمعیتِ خاطر اور تعلق

محشر کو سرمایہ زندگی سمجھتے تھے اور اس میں کمی آنے سے بچپن و مضطرب ہو جاتے تھے، تصدیر الخاطر میں اپنی ایک حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ابتداءً عمر ہی سے میرے اندر طریق زہد اختیار کرنے کی رغبت اور اندرونی تقاضا تھا، روزے اور نوافل کا اہتمام و التزام تھا، اور تنہائی مرغوب تھی اس وقت میرے دل کی بڑی اچھی حالت تھی، میری چشم بصیرت روشن اور سریح الادراک تھی، عمر کا جو لمحہ بغیر طاعت کے گزر جاتا، اس پر افسوس ہوتا، ایک ایک گھڑی غنیمت معلوم ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ عمل اور خدا کی رضا کا کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا، مجھے اللہ کے ساتھ ایک تعلق اور انس اور دعائیں لذت و حلاوت محسوس ہوتی، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ بعض حکام و اہل کاران سلطنت میری حسن تقریر اور وعظ سے متاثر ہوئے اور انہوں نے مجھے اپنی طرف مائل کیا، اور طبیعت بھی مائل ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حلاوت جو دعا و مناجات میں محسوس ہوتی تھی، جاتی رہی پھر دوسرے حاکم نے اپنی طرف مائل کیا (مشتبہ چیزوں کے ڈر سے) اس کے اختلاط اور کھانے پینے سے بچتا تھا، اور میری حالت کچھ بڑی نہ تھی، پھر رفتہ رفتہ تاویل کا دروازہ کھل گیا، اور میں نے مجالس میں آزادی سے کام لیا، تو وہ ساری کیفیت جاتی رہی، جتنا میں ان حاکموں سے ملتا اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، قلب کی تاریکی بڑھتی جاتی، یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا کہ وہ روشنی بچھ گئی، اور قلب تاریک ہو گیا، اس صورت حال سے میری طبیعت میں ایک بھلپتی پیدا ہوئی، اس بچپنی کا اثر مجلس و عطا کے سامعین پر یہ پڑا کہ وہ بھی بچپن اور متاثر ہونے لگے اس بچپنی کے اثر سے ان کو بکثرت توبہ اور اصلاح کی توفیق ہوتی، اور میں خالی ہاتھ کا خالی ہاتھ رہتا، اپنی اس مفلسی اور بدقسمتی کو دیکھ کر میرا اضطراب اور بڑھا، لیکن کوئی علاج بن نہ آیا، آخر میں نے صاحبین کی قبور کی زیارت کی، اور اللہ سے اپنے دل کی اصلاح کی دعا کی، بالآخر اللہ کے لطف و کرم نے میری دستگیری کی، اور مجھے کشاں کشاں خلوت کی طرف مائل کیا، جس سے

مجھے وحشت تھی اور وہ دل جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا، پھر قابو میں آیا، اور جو حالت مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اس کا عیب مجھ پر ظاہر ہوا، میں اس خوابِ غفلت سے بیدار ہوا اور میں نے اپنے مہربان و شفیع آقا (خدا) کا دل کھول کر شکر ادا کیا!

## ظاہری محاسن و اوصاف

ابن جوزی اس لازوال دولت کے ساتھ دولت دنیا و دولت عافیت اور دولتِ جمال سے بھی بہرہ مند تھے، موقوف عبد اللطیف کہتے ہیں کہ وہ نہایت خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش مذاق، اور نفیس طبع تھے، ابن الدینی کہتے ہیں کہ وہ شیریں زبان، شیوہ بیان، خوش آواز، موزوں قامت اور خوش اندام تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فراخ دست اور باحرمت رکھا، اپنی صحت اور اعتدال مزاج کا بڑا اہتمام رکھتے، اور ایسی چیزوں کا استعمال کرتے رہتے، جو ذکاوت و لطافت مزاج میں محلیں ہیں، "صید الخاطر" میں جا بجا صحت کی حفاظت، اعتدال مزاج، اور بد پرہیزی سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے، تلبیس ابلیس میں زہد کے مبالغہ آمیز اور تشددانہ عجیب رجحانات پر جا بجا تنقید کی ہے۔

## بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق

ان کی خاص صفت ان کی عالی ہمتی اور کسب کمالات اور جامعیت کا شوق ہے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے حالات میں جا بجا کیا ہے، انھوں نے جب کبھی مشہور و موصلہ مندوں اور بلند ہمتوں کا جائزہ لیا ہے، ان کی موصلہ مندی اپنی بلند ہمتی کے سامنے لپست اور محدود و نظر آئی ہے، "صید الخاطر" میں ایک جگہ تفصیل سے لکھتے ہیں۔

"انسان کے لئے سب سے بڑی ابتلا اس کی بلند ہمتی ہے، اس لئے کہ جس کی ہمت بلند ہوتی ہے، وہ

بلند سے بلند مراتب کو انتخاب کرتا ہے، پھر کبھی زمانہ مساعد نہیں ہوتا، کبھی وسائل مفقود ہوتے ہیں، تو ایسا شخص ہمیشہ کوفت میں رہتا ہے، مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے بلند حوصلہ عطا فرمایا ہے اور اس کی وجہ سے میں بھی تکلیف میں ہوں، لیکن میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کاش مجھے یہ بلند حوصلہ عطا ہوتا، اس لئے کہ زندگی کا پورا لطف اور بے فکری بے عقلی اور بے حسی کے بغیر نہیں، اور صاحب عقل یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی عقل کم کر دی جائے اور زندگی کا لطف بڑھا دیا جائے، میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بلند ہمتی کا بڑی اہمیت سے ذکر کرتے ہیں، لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی ساری بلند ہمتی صرف ایک ہی صفت اور شعبہ میں ہے، اس کے علاوہ دوسرے شعبوں میں (جو بعض اوقات ان کے شعبہ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں) ان کو اپنی کمی یا پستی کی کوئی پروا نہیں، شریف رضی اپنے ایک شعر میں کہتا ہے کہ ہر جسم کی لاغری کا ایک سبب ہے، اور میرے جسم کی مصیبت میری بلند ہمتی ہے، لیکن میں نے اس کے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ حکومت کے سوا اس کا کوئی مطمح نظر نہ تھا، ابو مسلم خراسانی اپنی جوانی کے زمانہ میں سوتانہ تھا، کسی نے اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ دماغ روشن، اہمیت بلند، نفس بندیوں کا حلیہ، اس سبب سے ہوتے ہوئے پست اور محدود زندگی، بھلا نیند کس طرح آئے؟ کسی نے کہا کہ تمہاری تسکین کس طرح ہو سکتی ہے؟ کہا کہ صرف اس طرح کہ سلطنت حاصل ہو جائے، لوگوں نے کہا کہ پھر اس کی کوشش کرو، اس نے کہا کہ یہ خطروں میں پڑے اور جان کی بازی لگانے بغیر ممکن نہیں، لوگوں نے کہا کہ پھر کیا مانع ہے؟ کہا کہ عقل روکتی ہے، پوچھا گیا کہ پھر کیا ارادہ ہے؟ کہا کہ پھر عقل کا مشورہ قبول نہیں کروں گا، اور نادانی کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور دے دوں گا، نادانی سے خطرہ مول لوں گا اور جہاں عقل کے بغیر کام نہیں چلتا، وہاں عقل سے کام اداں گا، اس لئے کہ گناہی اور افلاس لازم و ملزوم ہیں، میں نے اس فریب خوردہ حوصلہ مند (ابو مسلم) کے حالات پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ اس نے سب اہم مسئلہ ہی کی سیخ کنی کر دی، اور وہ مسئلہ آخرت ہے، وہ حکومت کی طلب میں دیوانہ رہا، اس کی خاطر

اس نے کتنا خون بہایا، کتنے بے گناہ بندگان خدا کو قتل کیا، یہاں تک کہ اس کو دنیاوی لذتوں کا ایک قلیل حصہ حاصل ہوا، جو اس کا مطلوب تھا، لیکن اس کو آٹھ سال سے زیادہ اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ ملا، اس کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا، وہ اپنی عقل سے اپنا کوئی بندوبست نہ کر سکا، اور (سفاح کے ہاتھوں) قتل ہو کر دنیا سے بڑی بڑی حالت میں رخصت ہو گیا، اسی طرح منتہی نے اپنی بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کا بڑا ترانہ گایا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ اس کو محض دنیا کی ہوس تھی۔

لیکن میری عالی ہمتی کا ساتھ عجیب ہے، میں علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک مجھے یقین ہے کہ پہنچ نہیں سکوں گا، اس لئے کہ میں تمام علوم کا حصول چاہتا ہوں، خواہ ان کا کچھ موضوع ہو، پھر ان میں سے ہر علم کی تکمیل اور احاطہ چاہتا ہوں، اور اس مقصد کے ایک حصہ کا حصول بھی اس چھوٹی سی عمر میں ناممکن ہے، پھر میرا یہ حال ہے کہ اگر کسی فن میں کسی کو کمال حاصل ہوتا ہے، اور دوسرے فن میں وہ ناقص ہوتا ہے، تو مجھے وہ ناقص نظر آتا ہے، مثلاً محدث فقہ سے بے بہرہ ہے، فقیہ حدیث سے بے خبر، میرے نزدیک علم کا نقص ہمت کی پستی کا نتیجہ ہے، پھر علم سے میرا مقصود پورا پورا عمل ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ مجھ میں بشر خانی کی احتیاط اور معروف کرخی کا زہد جمع ہو جائے، پھر یہ بات تصانیف کے مطالعہ، عامۃ الناس اور بندگان خدا کو تعلیم و افادہ اور ان کے ساتھ رہنے سہنے کے مشاغل کے ساتھ بہت مشکل ہے، پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مخلوق سے مستغنی رہوں، اور بجائے ان کا احسان لینے کے ان پر احسان کرنے کے قابل بن سکوں، درآئمی ایک علم کے ساتھ اشتغال کسب معاش سے مانع ہے، دوسروں کا ممنون ہونے اور ان کے شلوک و ہدایا کو قبول کرنے کو میری ہمت گوارا نہیں کرتی، پھر مجھے اولاد کی بھی خواہش ہے، اور بلند پایہ تصانیف کا بھی شوق ہے، تاکہ یہ سب میری یادگار اور دنیا سے جانے کے بعد میرے قائم مقام ہوں، اس کا اہتمام کیا جائے تو دل کے پسندیدہ اور محبوب مشغلہ خلوت و تنہائی میں فرق آتا ہے، اور طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر کچھ طبیعت

مستحبات سے جائز لطف لینے کا بھی شوق ہے، لیکن اس میں مال کی کمی سدا رہے، پھر اگر اس کا سامان بھی ہو جائے تو جمعیت خاطر خصت اسی طرح میں ان غذاؤں اور ایسے کھانے پینے کا بھی شائق ہوں، جو جسم کے موافق اور اس کے لئے مفید ہوں، اس لئے کہ میرا جسم نفاست پسند اور شائق واقع ہوا ہے، لیکن بال کی کمی یہاں بھی رکاوٹ بنتی ہے، یہ سب درحقیقت اضداد کو جمع کرنے کی کوشش ہے، بھلا اس عالی ہمتی کا مقابلہ وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں، جن کو صرف دنیا مطلوب ہے، پھر میری خواہش یہ بھی ہے کہ دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ میرے دین پر آئینہ نہ آئے، اور وہ بالکل محفوظ ہو، اور نہ میرے علم اور عمل پر کچھ اثر پڑے، میری بے چینی کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے، ایک طرف مجھے شب بیداری عزیز ہے، احتیاط و تقویٰ کا اہتمام ہے، دوسری طرف علم کی اشاعت و افادہ اور تصنیف و تالیف اور جسم کے مناسب غذائیں بھی مطلوب ہیں، اور یہ بغیر قلب کی مشغولیت کے ممکن نہیں، ایک طرف لوگوں سے منا جلتا اور ان کی تعلیم بھی ضروری ہے، دوسری طرف خلوت و تنہائی کی دعا و مناجات کی حلاوت میں کمی ہو تو اس پر سخت تاسف و رنج ہوتا ہے، متعلقین کے لئے قوت بالاموت کا انتظام کیا جائے تو زبرد احتیاط کے معیار میں فرق آتا ہے، لیکن میں نے اس ساری تکلیف اور کوفت کو گوارا کر رکھا ہے، اور راضی برضا ہو گیا ہوں، اور شاید میری اصلاح و ترقی اسی تکلیف و کشمکش میں ہے، اس لئے کہ بلند ہمت ان اعمال کی فکر میں رہتے ہیں، جو خدا کے یہاں باعث تقرب ہیں، میں اپنے انفاس کی حفاظت کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں کہ ایک سانس بھی کسی لایعنی کام میں صرف ہو،

اگر میرا مطلوب حاصل ہو گیا تو سبحان اللہ ورنہ نیت المؤمن خیر من عملہ<sup>۱</sup>۔

## مجالس و عطا اور تاثیر

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے انقلاب انگیز مواعظ اور مجالس درس ہیں، ان مجالس و عطا

نے سارے بغداد کو زیر و زبر کر رکھا تھا، خلفاء و سلاطین، وزراء اور اکابر علماء ان میں بڑے بڑے اہتمام اور بڑے شوق سے شرکت کرتے، ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک ایک لاکھ آدمی ایک ایک وعظ میں شمار کئے گئے ہیں، دس ہزار ہزار آدمیوں سے تو کسی طرح کبھی کم نہ ہوتے، تاثیر کا یہ عالم تھا کہ لوگ غش کھا کھا کرتے، وجد و شوق میں گریبا پھاٹے، لوگوں کی چینیں نکل جاتیں، آنسوؤں کی بھڑیاں لگ جاتیں، توبہ کرنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا، اندازہ کیا گیا ہے کہ بیس ہزار یہودی عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور ایک لاکھ آدمیوں نے توبہ کی تھی۔

ابن جوزی نے اپنی مجالس و عظائم بدعات و منکرات کی کھل کر تردید کی عقائد صحیحہ اور سنت کا اظہار کیا، اپنی بے مثل خطابت، زبردست علمیت اور عام رجوع کی وجہ سے اہل بدعت کو ان کی تردید کا حوصلہ نہ ہوا، سنت کو ان کے مواعظ و درس اور تصنیفات سے بہت فروغ ہوا، اور خلیفہ وقت اور امرا بھی انما اجم کے (جو اس زمانہ میں مسلک سلف اور طریقہ سنت کی نشانی سمجھے جاتے تھے) معتقد اور ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

## ان کی ناقدانہ تصانیف

ابن جوزی نے زبانی وعظ و تقریر پر اکتفا نہیں کیا، انھوں نے متعدد کتابیں ایسی لکھیں، جنھوں نے علمی طبقہ پر اثر ڈالا، اور غلط رجحانات کی اصلاح کی۔

## کتاب الموضوعات

یہ موضوعات حدیث پر ان کی ایک کتاب ہے، جس میں انھوں نے ان حدیثوں کی حقیقت بیان کی ہے، جن سے اس زمانہ کے اہل ہوی یا ضعیف العلم متصوفین استدلال کرتے تھے، اور وہ لوگوں کی گمراہی اور



صدر غلط فہمیوں کا باعث بنتی تھیں اس طرح انھوں نے اس شاخ پر تیشہ چلایا جس پر اہل بدعت نے  
 آشیانہ بنایا تھا، اگرچہ اس میں ان سے خود کہیں کہیں بے اعتدالی ہوئی ہے، اور انھوں نے کہیں کہیں سخت  
 فیصلہ صادر کیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب نے ایک مفید خدمت انجام دی۔

## تلبیس ابلیس

ان کی دوسری ناقدانہ تصنیف تلبیس ابلیس ہے، جو ان کی نقاد طبیعت اور سلفی ذوق کا اصلی  
 نمونہ ہے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے، اور مسلمانوں کے  
 ہر طبقہ اور ہر جماعت کو سنت و شریعت کے معیار سے دیکھا ہے، اور اس کی کمزوریوں بے اعتدالیوں اور  
 غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے، اور دکھلایا ہے کہ شیطان نے کس کس طرح سے اس امت کو دھوکا دیا ہے، اور  
 کن کن راہوں سے اس کے عقائد، اعمال اور اخلاق میں رخنہ اندازی کی ہے، انھوں نے اس کتاب میں کسی طبقہ اور  
 کسی شخص کی رعایت نہیں کی، اور کسی کو معاف نہیں کیا ہے، اس میں علماء و محدثین فقہاء و واعظین، ادباء  
 شعراء، سلاطین و حکام، عباد و زہاد، صوفیہ اہل دین، اور عوام کی علیحدہ علیحدہ کمزوریاں، غلط رسوم و عادات  
 مغالطے اور بے اعتدالیاں بیان کی ہیں، یہ کتاب ان کی وسعت نظر زندگی سے واقفیت، باریکی بینی اور  
 دقیقہ رسی کا کامیاب نمونہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شیطان کی نفسی دستاویز کا گہرا مطالعہ  
 کیا تھا، اور مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد سے وہ بہت باخبر تھے۔

## مختلف طبقات پر تنقید

اس کتاب میں اگرچہ کہیں کہیں وہ اپنی تنقید میں حد سے بڑھ گئے ہیں، اور انھوں نے فیصلہ کرنے میں

مجلات اور شدت سے کام لیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب میں بڑی کارآمد چیزیں بڑے بیش قیمت

اقتباسات اور بہت سی صحیح تنقیدیں ملتی ہیں اور اکثر جگہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کی گرفت صحیح اور ان کی تنقید حق بجانب ہے، یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

اپنے زمانہ کے ان علماء پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جو فقہ کے مسائل و جزئیات میں دن رات منہمک تھے اور اس فن میں موثکافیاء کرتے رہتے تھے۔

ان فقہاء کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کا سارا انہماک اسی خورد و فکر میں ہے، انہوں نے اپنے فن میں ان چیزوں کو شامل نہیں کیا ہے جن سے قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید کی تلاوت، حدیث و سیرت کی سماعت اور صحابہ کرام کے حالات کا مطالعہ و بیان، سب جانتے ہیں کہ محض ازالہ رنج اور استغناء کے مسائل کے بار بار دہرانے سے قلوب میں نرمی اور خشیت نہیں پیدا ہو سکتی، قلوب کو تذکر اور مواظف کی ضرورت ہے، تاکہ آخرت طلبی کی ہمت اور شوق پیدا ہو، اختلافی مسائل اگرچہ علوم شریعت سے خارج نہیں، مگر حصول مقصد کے لئے کافی نہیں ہیں، جو سلف کے حالات اور ان کے حقائق و اسرار سے واقف نہیں اور جن کے مذہب کو اس نے اختیار کیا ہے، ان کے حالات سے باخبر نہیں، وہ ان کے راستے پر کیسے چل سکتا ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ طبیعت چور ہے، اگر اس کو اسی زمانہ کے لوگوں کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اہل زمانہ کے طبائع سے اخذ کر لے گی، اور ان ہی کی طرح ہو جائے گی، اور اگر متقدمین کے حالات اور طریقوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے گی، اور ان کا رنگ اور ان کے سے اخلاق پیدا ہوں گے، سلف میں سے ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ایک حدیث جس سے میرے دل میں رقت پیدا ہو، قاضی شریح کے سو فیصلوں سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔<sup>۱</sup>

واعظین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ان میں سے اکثر لوگ بڑی آراستہ اور بڑی پر تکلف عبارت بولتے ہیں جو اکثر بے معنی ہوتی ہے۔“  
 اس زمانہ میں مواعظ کا بڑا حصہ حضرت موسیٰ کوہ طور، یوسف زلیخا کے قصوں سے متعلق ہوتا ہے۔  
 فرائض کا بہت کم تذکرہ آنے پاتا ہے، اسی طرح گناہ سے بچنے کا ذکر کبھی نہیں ہوتا، ایسے مواعظ سے  
 ایک زانی، ایک سود خوار کو توبہ کرنے کی ترغیب اور توفیق کیسے ہو سکتی ہے اور کب عورت کو شوہر کے  
 حقوق ادا کرنے اور اپنے تعلقات درست کرنے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے، اس لئے کہ یہ مواعظ ان  
 مضامین سے خالی ہوتے ہیں، ان واعظوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے، اسی لئے ان کا  
 بازار خوب گرم ہے، اس لئے کہ حق ہمیشہ طبیعتوں پر بھاری ہوتا ہے اور باطل ہلکا اور خوشگوار ہے  
 آگے لکھتے ہیں:-

• کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واعظ سچا اور خیر خواہ ہوتا ہے، لیکن جاہ طلبی اس کے دل میں سرایت  
 کر چکی ہوتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کی عزت و تعظیم کی جائے، اور اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرا  
 واعظ اس کی قائم مقامی کرے، یا اصلاح کے کام میں اس کی مدد کرنا چاہے تو اس کو ناگوار ہوتا  
 ہے، حالانکہ اگر یہ مخلص ہوتا، تو اس کو اس سے کبھی ناگواری نہ ہوتی<sup>۱</sup>۔  
 یہی تنقید ان کی علماء پر بھی ہے کہ:-

• اگر طلبہ کسی اور عالم یا مدرس کے پاس چلے جائیں، جو علم میں اس سے فائق ہے تو اس عالم کو  
 اس سے بڑی گرانی ہوتی ہے، یہ مخلص کی شان نہیں ہے، اس لئے کہ مخلص علماء اور مدرسین کی مثال طباء  
 کی سی ہے، جو لوہہ اللہ مخلوق کا علاج کرتے ہیں، اس لئے کہ اگر کسی مریض کو کسی طبیب کے ہاتھ سے شفا  
 ہو جائے تو دوسرا خوش ہوتا ہے<sup>۲</sup>۔

حکام و سلاطین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

۱۔ تبلیس ابلیس ص ۱۲۵ ۲۔ ایضاً ۳۔ تبلیس ابلیس ص ۱۳۱ (نقد مسالک العلماء انکالمین)۔

یہ حضرات شریعت کے مقابل میں اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں، کبھی اس شخص کا ہاتھ کاٹتے ہیں جس کا ہاتھ کاٹنا جائز نہیں، اور کبھی اس کو قتل کرتے ہیں جس کا قتل حلال نہیں، ان کو یہ دھوکہ ہے کہ یہ سیاست ہے جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے، اس کو تکملہ اور ضمیر کی ضرورت ہے، اور ہم اپنی رائے سے اس کی تکمیل کر رہے ہیں۔ یہ شیطان کا بہت بڑا فریب ہے، اس لئے کہ شریعت سیاست الہی ہے، اور محال ہے کہ خدائی سیاست میں کوئی خلل یا کمی ہو، جس کی وجہ سے اس کو مخلوق کی سیاست کی ضرورت ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا فَوْضْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی) اور ارشاد ہے كَلَّا مَعْقَبَاتِ الْمَكِيْمِ (اس کے حکم کو کوئی مٹانے والا نہیں) تو جو اس سیاست کا مدعی ہے، وہ دراصل شریعت میں خلل اور کمی کا دعویٰ کرتا ہے، اور یہ کفر کی بات ہے۔

ان حکام و امراء اور سلاطین کی ایک دوسری کمزوری اور مغالطہ کا ذکر کرتے ہیں:-

”معاہدے پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان کو صلحی اور لڑائی کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے، اور ان سے وہ اپنے حق میں دعائیں کرتے ہیں، شیطان اس کو سمجھاتا ہے کہ اس سے گناہوں کا پورا ہلکا ہو جائے گا، حالانکہ اس خیر سے اس شر کا وہ فائدہ نہیں ہو سکتا، ایک مرتبہ ایک تاجر ایک محصول وصول کرنے والے کے پاس گزرا، اس جنگی وائے نے اس کی کشتی روک لی، وہ تاجر اپنے زمانہ کے مشہور مرد صالح مالک بن دینار کے پاس آیا، اور ان سے واقعہ بیان کیا، مالک بن دینار جنگی وائے کے پاس گئے، اور اس تاجر کی سفارش کی، اس نے اس کی بڑی تعظیم کی، اور کہا کہ آپ کیوں زحمت فرمائی، وہیں سے کہلوادیا ہوتا، ہم تمہیں لے کر آتے، پھر اس نے ان سے دعا کی درخواست کی، انھوں نے اس برتن کی طرف اشارہ کر کے (جس میں وہ جنگی کاناجائز روپیہ وصول کر کے رکھتا تھا) فرمایا کہ اس برتن سے کہو کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے، پھر فرمایا کہ میں تمہارے حق میں کیا دعا کروں جبکہ ہزار آدمی تمہارے لئے بد دعا کرتے ہیں، کیا ایک آدمی کی سن لی جائے گی، اور ہزار کی نہ سنی جائے گی“

ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ "ان امراء اور دنیا داروں کو علماء و فقہار سے زیادہ خلافت شرع پیروں اور گانے بجانے والے صوفیوں کی عقیدت و محبت ہوتی ہے" اور ان پر وہ بڑی فرائح دلی سے خرچ کرتے ہیں، جبکہ اہل علم پر ایک پیسہ خرچ کرنا ان کو بار ہوتا ہے، اس لئے کہ علماء اطباء کی طرح ہیں اور دوامیں خرچ کرنا انسان کو بڑا بار معلوم ہوتا ہے، لیکن ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا مغنیات (گانے والی عورتوں) پر خرچ کرنا، یہ بھی ان کے لئے گویوں اور مداریوں کی طرح سامان تفریح اور لازمہ ریاست ہیں۔

اسی طرح سے یہ لوگ بناوٹی زاہدوں اور تارک الدنیا درویشوں کے بڑی جلدی معتقد ہوتے اور ان کو علماء پر ترجیح دیتے ہیں، یہ لوگ اگر سب سے بڑے جاہل کے جسم پر درویشی کا لباس دیکھ لیں تو فوراً معتقد ہو جائیں اور اگر وہ سر کو جھکائے اور خشوع و خضوع کا اظہار کرے تو فریفتہ ہونے میں دیر نہیں لگتی اور کہتے ہیں کہ بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ، یہ تارک الدنیا وہ طالب دنیا، یہ اچھی غذائیں کھاتا ہے، نہ شادی کرتا، نہ نکاح، حالانکہ محض بہالت ہے، اور شریعت محمدی کی تحقیر ہے کہ ایسے زہد کو علم پر ترجیح دی جائے، خدا کا بڑا احسان ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے، ورنہ اگر آپ کو شادیاں کرتے، پاک و صاف چیزیں کھاتے، اور بیٹھے اور شہد کی رغبت رکھتے ہوئے پاتے تو آپ سے بھی بد اعتقاد ہو جاتے۔

عوام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"شیطان نے بہت سے عوام کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے کہ وعظ و ذکر کی مجالس میں شریک ہونا اور متاثر ہو کر رونا ہی سب کچھ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ مقصود محفل خیر میں شرکت اور رقت ہے، اس لئے کہ وہ واعظوں سے اس کے فضائل سنتے رہتے ہیں، اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود عمل ہے، تو یہ سنا اور عمل کرنا ان کے لئے گرفت کا باعث اور وبال جان ہے، میں ذاتی طور پر بہت سے آدمیوں کو

جاتا ہوں جو سالہا سال سے مجلس وعظ میں شریک ہوتے ہیں اور روتے ہیں متاثر ہوتے ہیں لیکن نہ سو دینا چھوڑتے ہیں نہ تجارت میں دھوکہ دینے سے باز آتے ہیں ارکان صلوة سے جیسے وہ بے خبر برسوں پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں، مسلمانوں کی غیبت والدین کی نافرمانی میں جس طرح پہلے مبتلا تھے اسی طرح اب بھی مبتلا ہیں شیطان نے ان کو یہ چل دینے رکھا ہے کہ مجلس وعظ کی حاضری اور گریہ بکاؤں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا بعض کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ علماء و صالحین کی صحبت ہی مغفرت کا ذریعہ ہے۔

دولت مندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ان میں سے بہت سے لوگ مساجد اور پلوں کی تعمیر میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں مگر ان کا مقصود ریا اور شہرت ہوتی ہے اور یہ کہ ان کا نام چلے اور یادگار رہے چنانچہ وہ اس تعمیر پر اپنا نام کندہ کر دیتے ہیں اگر رضائے الہی مقصود ہوتی تو اس کو کافی سمجھتے کہ اللہ دیکھتا اور جانتا ہے ایسے لوگوں سے اگر صرف ایک یو ارب بنانے کو کہا جائے جس پر ان کا نام کندہ نہ ہو تو وہ منظور نہ کریں گے۔ اسی طرح سے رمضان مبارک میں شہرت کے لئے موم بتیاں بھجیتے ہیں حالانکہ ان کی مسجدوں میں سال بھر اندھیرا پڑا رہتا ہے اس لئے کہ روزانہ تھوڑا تھوڑا ساتیل مسجدوں میں دینے سے وہ شہرت اور ناموری حاصل نہیں ہوتی جو رمضان میں ایک موم بتی بھیج دینے سے حاصل ہوتی ہے۔“

## ”صيد الخاطر“

”صيد الخاطر“ ایک کشکول ہے جس میں مصنف نے اپنے قلبی تاثرات بے تکلف خیالات زندگی کے تجربات اور منتشر افکار و حوادث قلب بند کئے ہیں اور اپنی بہت سی کمزوریوں اور غلطیوں کا بے تکلف

۱۲ تلبیس ابلیس علی العوام ۳۹۳-۳۹۴ ۱۳ تلبیس ابلیس علی اصحاب الاموال ص ۳۹۵

اعتراض کیا ہے، اس کتاب میں جا بجا نفس سے مکالمے، سوال و جواب، ذہنی کشمکش کی روداد، معاشرتی زندگی کے تجربے عورتوں، نوکروں اور دوستوں کے متعلق تجربہ کی باتیں اور مفید ہدایات روزمرہ کے واقعات کی تحلیل، امراض نفسانی کا بیان، مختلف طبقات پر تنقید، نفس کا احتساب اور صدمہ ہا کام کی باتیں ہیں، اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت صداقت اور سادگی و بے تکلفی ہے پوری کتاب اپنے زمانہ کے ادباء و مصنفین کے طرز کے خلاف نہایت رواں و بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہے اور اپنے موضوع پر غالباً ایک عرب عالم و مصنف کی پہلی کتاب ہے۔

## عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج

ابن جوزی اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں اور یہی ایک عامی اور ایک صاحب نظر میں فرق ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”میں نے دو مزدوروں کو دیکھا کہ ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لے جا رہے ہیں اور دونوں کچھ گام لے رہے ہیں، ایک مصرعہ پڑھتا ہے، دوسرا ترنم کے ساتھ اس کا جواب دیتا ہے، ایک پڑھتا ہے، تو دوسرا کان لگا کر سنتا ہے، پھر دوسرا اس کو دہراتا ہے، یا اسی طرح کے مصرعے سے جواب دیتا ہے، مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کو محنت اور بوجھ کا احساس زیادہ ہو، لیکن اس ترکیب سے ان کا کام آسان ہو جاتا ہے، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر مستالیتا ہے اور کچھ سرور حاصل کر لیتا ہے، اور جواب کی فکر میں غول ہو کر اس میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح راستہ طے ہو جاتا ہے اور بوجھ کے احساس سے غفلت ہو جاتی ہے، اس سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ انسان نے شرعی ذمہ داریوں اور فرائض کا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے اور سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست ہے، بڑا کام یہ ہے کہ اس کو

اس کے مرغوبات سے روکا جائے اور جن چیزوں سے اس کو رغبت نہیں ان پر اس کو قائم رکھا جائے، میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ صبر کے راستے کو تسلی اور نفس کی جائز دلداری کی مدد سے قطع کیا جائے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے کہ "رات بھر چلنے سے سواریاں تھک جائیں اور فریاد کریں، تو صبح کی روشنی کی امید دلاؤ اور دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کر لو۔"

اسی طرح کی حکایت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ اور ان کے ایک ساتھی کہیں جا رہے تھے، ساتھی کو پیاس لگی، اس نے کہا کہ اس کنویں سے پانی پی لیں، بشرحانی نے کہا کہ اگلے کنویں سے پی لیں گے، جب وہ کنواں آیا تو بشرحانی نے آگے کے کنویں کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں تک صبر کرو، اسی طرح تسلی دیتے ہوئے بہت دور لے آئے، پھر اس سے کہا کہ اسی طرح دنیا کا سفر طے ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا، وہ اپنے نفس کو بہلائے گا، اور اس کی دُجوئی کرے گا، اور اس سے وعدہ کرتا ہے گا، تاکہ وہ اپنے بوجھ کو سنبھال سکے، اور اس پر صبر کرے، بعض بزرگانِ سلف فرماتے تھے کہ "اے نفس میں تجھے تیرے مرغوب چیز سے جو روکتا ہوں تو محض شفقت اور خون کی بنا پر، بائزید بسطامی کا قول ہے کہ "اپنے نفس کو خدا کی طرف بڑھانے لے جاتا اور وہ روٹا ہوتا تھا، پھر رفتہ رفتہ ہنستا کھیلتا اللہ کی طرف بڑھنے لگا، یاد رکھنا چاہئے کہ نفس کی خاطر داری اور ملاحظت ضروری ہے، اور راستہ اسی طرح طے ہوتا ہے۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"میں نے دیکھا ہے کہ شکاری کتے جب محلہ کے کتوں کے پاس سے گزرتے ہیں، تو نلہ کے کتے تو ان کو بھونکتے ہیں، اور بہت شور مچاتے ہیں، اور ان کے پیچھے دوڑتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ان کتوں کی بڑی عزت ہے، ان پر جھول پڑی ہے، تو ان کو ان پر حسد آتا ہے، لیکن اس کے برخلاف شکاری کتے ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، اور ان کو خاطر میں نہیں لاتے، اور ان کے بھونکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، اس سے ایسا معلوم



ہوا شکاری کتے گویا ان کتوں کی قوم ہی میں سے نہیں ہیں، اس لئے کہ مقامی کتے موٹے موٹے بدن اور بھدے اعضاء کے ہیں، ان میں امانت کی صفت نہیں، لیکن شکاری کتے نازک اور پھرتیلے ہیں اور جیسا ان کا بدن نازک اور پھرتیلا ہے، اسی طرح ان کے عادات ہذب ہیں، وہ جب شکار کرتے ہیں تو کیا مجال ہے کہ اس کو منہ لگائیں، مالک کے ڈر سے یا اس کے احسانات کے شکر یہ میں وہ اس شکار کو جوں کا توں پہنچا دیتے ہیں، اس سے ایک بات تو میں سمجھا کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت ہوتی ہے، اگر وہ لطیف ہے، تو یہ بھی لطیف ہیں، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کو اس پر حسد نہیں آتا جس کو وہ اپنے طبقہ یا اپنی سطح کا نہیں سمجھتا، اسی طرح جس کو اللہ تعالیٰ ایمان و عقل کی دولت سے سرفراز کرے، اس کو اپنے اس حاسد پر حسد نہیں ہوتا، جو ایمان و عقل سے محروم ہو، اور وہ اس کو قابل التفات نہیں سمجھتا، اس لئے کہ وہ دوسرے عالم میں ہے، اور یہ دوسرے عالم میں وہ دنیا کی بنا پر حسد کرتا ہے، اور اس کا مصلح نظر آخرت ہے، اور دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

## واقعات زندگی اور نفس سے مکالمہ

وہ واقعات کی پوری تحلیل کرتے ہیں، اور خود اپنی زندگی کے واقعات میں نفس سے حکیمانہ مکالمہ کرتے ہیں، ایک مرتبہ انھوں نے دعا کی ایک دوسرے صاحب بزرگ دعائیں شریک تھے، دعا قبول ہوئی، لیکن کس کی دعا قبول ہوئی، اس پر ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہوا۔

مجھے ایک مرتبہ ایسا معاملہ پیش آیا، جس میں اللہ سے مانگنے اور دعا کی ضرورت تھی، میں نے دعا کی، او

اللہ سے سوال کیا، ایک صاحب صلاح اور اہل خیر بھی میرے ساتھ دعائیں شریک ہو گئے، میں قبولیت

کے کچھ آثار دیکھے، میرے نفس نے کہا کہ یہ اس بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے، تمہاری دعا کا نتیجہ نہیں، میں نے کہا کہ

مجھے اپنے ایسے گناہوں اور کوتاہیوں کا علم ہے جن کی وجہ سے واقعی مجھے اس کا حق نہیں کہ میری دعا قبول ہو، لیکن کیا تعجب ہے کہ میری ہی دعا قبول ہوئی ہو، اس لئے کہ یہ مرد صالح ان گناہوں اور تقصیرات سے محفوظ ہے جن کا مجھے اپنے تعلق علم ہے، لیکن مجھ میں اور اس میں ایک فرق ہے، مجھے اپنی تقصیر کی بنا پر دل شکستگی اور ندامت ہے، اور اس کو اپنے معاملہ پر فرحت و سرور ہے، اور کبھی اعتراضِ تقصیر ایسی ضرورتوں کے موقع پر زیادہ کارآمد اور موثر ہوتا ہے، اور ایک بات میں ہم اور وہ مساوی ہیں، وہ یہ کہ ہم دونوں میں سے کوئی اپنے اعمال کی بنا پر فضل کا طالب نہیں، تو اگر میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ندامت سے گردن جھکا کر اور اپنے گناہوں کا اعتراض کرتے ہوئے کہوں کہ خدایا مجھے محض اپنے فضل سے عطا فرما، میں بالکل خالی ہاتھ ہوں تو مجھے امید ہے کہ میری سن لی جائے گی، اور ممکن ہے کہ اس کی نظر اپنے حسن عمل پر پڑے، اور یہ اس کے لئے روک بن جائے تو لے میرے نفس میرا دل زیادہ نہ توڑو، پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے، مجھے اپنے حالات کا ایسا علم ہے جس کا تقاضا ادب اور تواضع ہے، پھر اپنی تقصیروں کا اقرار ہے جس چیز کا میں نے سوال کیا ہے، اس کا بے حد محتاج ہوں اور جس سے سوال کیا ہے، اس کے فضل کا یقین ہے، اور یہ سب باتیں اس عابد کو حاصل نہیں تو اللہ اس کی عبادت میں برکت کرے، میرا تو اعتراضِ تقصیر ہی بڑے کام کی چیز ہے۔<sup>۱۵</sup>

ایک جگہ لکھتے ہیں:-

• ایک مرتبہ ایک ایسے معاملہ میں جو شرعاً مکروہ تھا، مجھے کچھ کشمکش و پیش قدمی، نفس کچھ تاویلیں سامنے لاتا تھا، اور کراہت کو نظر سے ہٹاتا تھا، اور درحقیقت اس کی تاویلات ناسد تھیں، اور کراہت کی کھلی ہوئی دلیل موجود تھی، میں نے اس کی طرف رجوع کیا، اور دعا کی کہ اس کیفیت کو دور فرمادے، اور قرآن مجید کا تلاوت شروع کر دی، میرے درس کے سلسلہ میں سورہ یوسف شروع ہو رہی تھی، میں نے

وہیں سے شروع کیا وہ خیال دل پرستولی تھا، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میں نے کیا پڑھا، جب اس آیت پر پہنچا: "قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ" تو میں چونکا، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ہی اس آیت کا مخاطب ہوں، مجھے دفعتاً ہوش آیا، اور آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہا تو نے خیال کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام آزاد تھے، وہ زبردستی اور ظلم سے غلام بنا کر بیچے گئے، انہوں نے اس شخص کا اتنا حق مانا جس نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا اور اس کو اپنا آقا کہا، حالانکہ نہ وہ غلام تھے نہ ان کا کوئی آقا تھا، پھر اپنی اس حق شناسی کی وجہ یہ بیان کی کہ "أَحْسَنَ مَثْوَايَ" مجھے اچھی طرح سے رکھا، اب ذرا اپنے اوپر غور کرو، حقیقتہً غلام ہے ایسے آقا کا جو تیرے وجود کے وقت برابر تیرے ساتھ احسانات کرتا رہا، اور اتنے بار اس نے تیری پردہ پوشی کی جس کا کوئی شمار نہیں، تجھے یاد نہیں کہ اس کس طرح تیری پرورش کی، تجھے دکھایا پڑھایا، تجھے رزی دی تیری حفاظت کی، تیرے اسباب ہیا کئے، بہترین راستہ پر تجھے ڈالا، اور ہر مکر و دشمنی سے تجھے بچایا، اور حسن صورت ظاہر کی ساتھ باطنی ذکاوت و جودت، طبع عنایت فرمائی، علوم کو تیرے لئے سہل بنا دیا، یہاں تک کہ مختصر سے عرصہ میں تجھے وہ علوم حاصل ہوئے، جو دوسروں کو طویل عرصہ میں نصیب نہیں ہوئے، تیری زبان پر علوم کو رواں کیا اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان کی تفسیر کی توتہ، عطا فرمائی، اور مخلوق سے تیرے عیوب کو چھپایا، ان کا معاملہ تیرے ساتھ حسن ظن کا رہا، تیرا رزق بغیر اہتمام و تکلف کے تجھے تک پہنچایا، اور کسی کا احسان مند نہیں بنایا، اور وہ بھی فراغت و اطمینان و کشائش کے ساتھ، بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کس کس احسان کا تذکرہ کیا جائے، حسن صورت کا یا صحت اعضاء کا یا سلامت مزاج، یا اعتدال ترکیب کا یا لطافت طبع اور دنات ابتذال سے بری ہونے کا، یا بچپن ہی سے سیدھے اور معتدل راستے کی توفیق کا، یا بے حیائیوں اور لغزشوں سے حفاظت کا، یا منقولات کی ترجیح اور حدیث و سنت کی اتباع اور تقلید جاہد سے نجات کا

یابتداء کی پیروی اور اس کے سلسلہ میں شمولیت سے محفوظ رہنے کا، "وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ  
 لَا تُحْصَوْهَا" کتنے دشمنوں نے تیرے لئے جال بچایا، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے بچایا، کتنے مخالفوں  
 نے تجھ کو سبک کرنا چاہا، اور اس نے تجھے سر بلندی عطا فرمائی، کتنی نعمتوں سے دوسرے محروم رہے اور  
 تو ان سے سیراب کیا گیا، کتنے آدمی دنیا سے نامراد چلے گئے، اور تو شاد کام اور فائز المرام ہے، اس حالت  
 میں تیرے دن گزر رہے ہیں کہ تیرا جسم صحیح سالم، دین محفوظ، علم روز افزوں، دلی مقاصد پورے اگر کوئی  
 مقصد بر نہیں آتا تو اس کی طرف سے صبر پیدا کر دیا جاتا ہے، اور تجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پورا  
 نہ ہونے ہی میں حکمت الہی تھی، یہاں تک کہ تجھے یقین آجاتا ہے کہ یہی تیرے حق میں بہتر تھا، اگر میں  
 پچھلے احسانات کو گنانا شروع کروں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں، اور وہ ختم نہ ہوں، اور تجھے  
 معلوم ہے کہ جن احسانات کا تذکرہ میں نے نہیں کیا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں، اور جن کا ذکر میں  
 کیا ہے، ان کی طرف بھی میں نے صرف اشارہ کیا ہے، اس سب کے ساتھ تجھ کو ایسا نفل کرنا کیسے  
 زیب دیتا ہے، جو اس کی مرضی کے خلاف ہے، "مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنُ مَنَاقِبِي إِنَّهُ  
 لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ"۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"میں نے ایک مرتبہ ایک ایسے مسئلہ پر عمل کیا، جس کی بعض مذاہب (فقہیہ) میں گنجائش تھی، اور  
 دوسرے مذاہب میں وہ جائز نہ تھا، اس پر عمل کرنے سے مجھے اپنے قلب میں بڑی قساوت محسوس ہوئی،  
 اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں راندہ درگاہ اور معنوب ہو گیا، اور کچھ محرومی اور گہری تاریکی محسوس ہوئی،  
 میرے نفس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے، تم تو دائرہ فقہار سے نکلے نہیں، میں نے کہا کہ اے نفس بد! تیرے  
 سوال کا جواب دو طرح سے ہے، اول تو یہ کہ تو نے اپنے عقیدہ کے خلاف تاویل کی، اگر خود تجھ سے

فتویٰ لیا جاتا تو اس کا فتویٰ نہ دیتا، اس نے کہا کہ اگر میں اس کے جواز کا قائل نہ ہوتا، تو کرتا کیوں؟  
 میں نے کہا کہ تو اپنے اس خیال کو دوسرے کے لئے بھی فتویٰ کے طور پر پسند نہیں کرتا، دوسری بات  
 یہ ہے کہ تجھے ظلمت کے اس احساس پر خوش ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر تیرے دل میں نور نہ ہوتا تو تجھ پر  
 یہ اثر ہی نہ پڑتا، اس نے کہا کہ بہر حال مجھے اس ظلمت سے جو پلٹ پلٹ کر آتی ہے، وحشت ہے میں نے  
 کہا کہ پھر اس فعل کے ترک کا عزم کر لے اور فرض کر لے کہ تو نے جس کو ترک کیا ہے، وہ بالاجماع جائز ہے، تب بھی  
 برائے و ریح و تقویٰ اس کو چھوڑنے کا وعدہ کر چنانچہ اس عمل سے اس کیفیت سے اس کو نجات ملی۔

## سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت

وہ باوجود محدث و فقیہ ہونے کے اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قلب کی اصلاح اور ذوق و  
 شوق پیدا کرنے کے لئے موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ہے، تلبیس  
 ابلیسی اور "صید الخاطر" دونوں میں فقہاء و محدثین اور طلبہ و علماء کو وہ اس کا مشورہ دیتے ہیں،  
 اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں، "صید الخاطر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"میں نے دیکھا کہ فقہ اور سماع حدیث میں انہماک و مشغولیت قلب میں صلاحیت پیدا کرنے کے  
 لئے کافی نہیں، اس کی تدبیر یہی ہے کہ اس کے ساتھ موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کا  
 مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حرام و حلال کا خالی علم قلب میں رقت پیدا کرنے کے لئے کچھ زیادہ سود  
 نہیں، قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، موثر احادیث و حکایات اور سلف صالحین کے حالات سے اس لئے  
 کہ ان نقول و روایات کا جو مقصود ہے، وہ ان کو حاصل تھا، احکام پر ان کا عمل شکلی اور ظاہری نہ تھا،  
 بلکہ ان کو ان کا اصلی ذوق اور لب لباب حاصل تھا، اور یہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ عملی تجربہ اور

خود آزمائش کرنے کے بعد ہے، میں نے دیکھا ہے کہ عموماً محدثین اور طلبہٴ فنِ حدیث کی ساری توجہ اونچی سندِ حدیث اور کثرتِ مرویات کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح عام فقہاء کی تمام تر توجہ تصدیقات اور تریف کو زیر کرنے والے علم کی طرف ہوتی ہے، بھلا ان چیزوں کے ساتھ قلب میں کیا گداز اور رقت پیدا ہو سکتی ہے، سلف کی ایک جماعت کسی نیک اور بزرگ شخص سے محض اس کے طور طریقہ کو دیکھنے کے لئے ملنے جاتی تھی، علم کے استفادہ کے لئے نہیں، اس لئے کہ یہ طور و طریقہ اس کے علم کا اصلی پھل تھا، اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور فقہ و حدیث کی تحصیل میں سلف صاحبین اور زہادِ امت کی بے رت کا مطالعہ ضرور شامل کرو تاکہ اس سے تمہارے دل میں رقت پیدا ہو!

## صلیٰ و امت کی سیرت

ابن جوزی نے اسی غرض کے لئے سلف صاحبین اور صلیٰ اے امت میں سے بہت سے متقدّمین اور مشاہیر کی مستقل سیرتیں لکھی ہیں، مثلاً حضرت حسن بصری، سیدنا عمر بن عبدالعزیز، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت بشر حافی، امام احمد بن حنبل، حضرت معروف کرخی، ان مستقل تذکروں کے علاوہ ایک جامع تذکرہ صفة الصفاۃ لکھا، جو چار جلدوں میں ہے، یہ دراصل ابو نعیم اصبہانی کی مشہور کتاب حلیۃ اولیاء کی تہذیب و تنقیح ہے، جس کو ابن جوزی نے مناسب حذف و اضافہ اور تلخیص کے ساتھ محدثانہ و مورخانہ طرز پر مرتب کیا ہے، اس کتاب میں جو حالات و واقعات آئے ہیں، وہ موثر و دل گداز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حقیقت سے مستند بھی ہیں، اور مبالغہ آمیز روایات اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔

## تاریخ کی اہمیت

ابن جوزی علوم دینیہ میں اشتغال اور فقہ و حدیث میں کمال کے ساتھ ساتھ فنِ تاریخ کی اہمیت و ضرورت

ابو سعید الخاضری ج ۲ ص ۲۲۲، اپنی اس مستقل تاریخ کا تذکرہ انھوں نے خود صید الخاضری میں کیا ہے ج ۱ ص ۱۳۷، ج ۲ ص ۱۵۳، ج ۳ ص ۱۷۹، ص ۱۸۷، ص ۱۹۱، ص ۲۰۳، ص ۲۱۷، ص ۲۳۱، ص ۲۴۵، ص ۲۵۹، ص ۲۷۳، ص ۲۸۷، ص ۳۰۱، ص ۳۱۵، ص ۳۲۹، ص ۳۴۳، ص ۳۵۷، ص ۳۷۱، ص ۳۸۵، ص ۳۹۹، ص ۴۱۳، ص ۴۲۷، ص ۴۴۱، ص ۴۵۵، ص ۴۶۹، ص ۴۸۳، ص ۴۹۷، ص ۵۱۱، ص ۵۲۵، ص ۵۳۹، ص ۵۵۳، ص ۵۶۷، ص ۵۸۱، ص ۵۹۵، ص ۶۰۹، ص ۶۲۳، ص ۶۳۷، ص ۶۵۱، ص ۶۶۵، ص ۶۷۹، ص ۶۹۳، ص ۷۰۷، ص ۷۲۱، ص ۷۳۵، ص ۷۴۹، ص ۷۶۳، ص ۷۷۷، ص ۷۹۱، ص ۸۰۵، ص ۸۱۹، ص ۸۳۳، ص ۸۴۷، ص ۸۶۱، ص ۸۷۵، ص ۸۸۹، ص ۹۰۳، ص ۹۱۷، ص ۹۳۱، ص ۹۴۵، ص ۹۵۹، ص ۹۷۳، ص ۹۸۷، ص ۱۰۰۱، ص ۱۰۱۵، ص ۱۰۲۹، ص ۱۰۴۳، ص ۱۰۵۷، ص ۱۰۷۱، ص ۱۰۸۵، ص ۱۰۹۹، ص ۱۱۱۳، ص ۱۱۲۷، ص ۱۱۴۱، ص ۱۱۵۵، ص ۱۱۶۹، ص ۱۱۸۳، ص ۱۱۹۷، ص ۱۲۱۱، ص ۱۲۲۵، ص ۱۲۳۹، ص ۱۲۵۳، ص ۱۲۶۷، ص ۱۲۸۱، ص ۱۲۹۵، ص ۱۳۰۹، ص ۱۳۲۳، ص ۱۳۳۷، ص ۱۳۵۱، ص ۱۳۶۵، ص ۱۳۷۹، ص ۱۳۹۳، ص ۱۴۰۷، ص ۱۴۲۱، ص ۱۴۳۵، ص ۱۴۴۹، ص ۱۴۶۳، ص ۱۴۷۷، ص ۱۴۹۱، ص ۱۵۰۵، ص ۱۵۱۹، ص ۱۵۳۳، ص ۱۵۴۷، ص ۱۵۶۱، ص ۱۵۷۵، ص ۱۵۸۹، ص ۱۶۰۳، ص ۱۶۱۷، ص ۱۶۳۱، ص ۱۶۴۵، ص ۱۶۵۹، ص ۱۶۷۳، ص ۱۶۸۷، ص ۱۷۰۱، ص ۱۷۱۵، ص ۱۷۲۹، ص ۱۷۴۳، ص ۱۷۵۷، ص ۱۷۷۱، ص ۱۷۸۵، ص ۱۷۹۹، ص ۱۸۱۳، ص ۱۸۲۷، ص ۱۸۴۱، ص ۱۸۵۵، ص ۱۸۶۹، ص ۱۸۸۳، ص ۱۸۹۷، ص ۱۹۱۱، ص ۱۹۲۵، ص ۱۹۳۹، ص ۱۹۵۳، ص ۱۹۶۷، ص ۱۹۸۱، ص ۱۹۹۵، ص ۲۰۰۹، ص ۲۰۲۳، ص ۲۰۳۷، ص ۲۰۵۱، ص ۲۰۶۵، ص ۲۰۷۹، ص ۲۰۹۳، ص ۲۱۰۷، ص ۲۱۲۱، ص ۲۱۳۵، ص ۲۱۴۹، ص ۲۱۶۳، ص ۲۱۷۷، ص ۲۱۹۱، ص ۲۲۰۵، ص ۲۲۱۹، ص ۲۲۳۳، ص ۲۲۴۷، ص ۲۲۶۱، ص ۲۲۷۵، ص ۲۲۸۹، ص ۲۳۰۳، ص ۲۳۱۷، ص ۲۳۳۱، ص ۲۳۴۵، ص ۲۳۵۹، ص ۲۳۷۳، ص ۲۳۸۷، ص ۲۴۰۱، ص ۲۴۱۵، ص ۲۴۲۹، ص ۲۴۴۳، ص ۲۴۵۷، ص ۲۴۷۱، ص ۲۴۸۵، ص ۲۴۹۹، ص ۲۵۱۳، ص ۲۵۲۷، ص ۲۵۴۱، ص ۲۵۵۵، ص ۲۵۶۹، ص ۲۵۸۳، ص ۲۵۹۷، ص ۲۶۱۱، ص ۲۶۲۵، ص ۲۶۳۹، ص ۲۶۵۳، ص ۲۶۶۷، ص ۲۶۸۱، ص ۲۶۹۵، ص ۲۷۰۹، ص ۲۷۲۳، ص ۲۷۳۷، ص ۲۷۵۱، ص ۲۷۶۵، ص ۲۷۷۹، ص ۲۷۹۳، ص ۲۸۰۷، ص ۲۸۲۱، ص ۲۸۳۵، ص ۲۸۴۹، ص ۲۸۶۳، ص ۲۸۷۷، ص ۲۸۹۱، ص ۲۹۰۵، ص ۲۹۱۹، ص ۲۹۳۳، ص ۲۹۴۷، ص ۲۹۶۱، ص ۲۹۷۵، ص ۲۹۸۹، ص ۳۰۰۳، ص ۳۰۱۷، ص ۳۰۳۱، ص ۳۰۴۵، ص ۳۰۵۹، ص ۳۰۷۳، ص ۳۰۸۷، ص ۳۱۰۱، ص ۳۱۱۵، ص ۳۱۲۹، ص ۳۱۴۳، ص ۳۱۵۷، ص ۳۱۷۱، ص ۳۱۸۵، ص ۳۱۹۹، ص ۳۲۱۳، ص ۳۲۲۷، ص ۳۲۴۱، ص ۳۲۵۵، ص ۳۲۶۹، ص ۳۲۸۳، ص ۳۲۹۷، ص ۳۳۱۱، ص ۳۳۲۵، ص ۳۳۳۹، ص ۳۳۵۳، ص ۳۳۶۷، ص ۳۳۸۱، ص ۳۳۹۵، ص ۳۴۰۹، ص ۳۴۲۳، ص ۳۴۳۷، ص ۳۴۵۱، ص ۳۴۶۵، ص ۳۴۷۹، ص ۳۴۹۳، ص ۳۵۰۷، ص ۳۵۲۱، ص ۳۵۳۵، ص ۳۵۴۹، ص ۳۵۶۳، ص ۳۵۷۷، ص ۳۵۹۱، ص ۳۶۰۵، ص ۳۶۱۹، ص ۳۶۳۳، ص ۳۶۴۷، ص ۳۶۶۱، ص ۳۶۷۵، ص ۳۶۸۹، ص ۳۷۰۳، ص ۳۷۱۷، ص ۳۷۳۱، ص ۳۷۴۵، ص ۳۷۵۹، ص ۳۷۷۳، ص ۳۷۸۷، ص ۳۸۰۱، ص ۳۸۱۵، ص ۳۸۲۹، ص ۳۸۴۳، ص ۳۸۵۷، ص ۳۸۷۱، ص ۳۸۸۵، ص ۳۸۹۹، ص ۳۹۱۳، ص ۳۹۲۷، ص ۳۹۴۱، ص ۳۹۵۵، ص ۳۹۶۹، ص ۳۹۸۳، ص ۳۹۹۷، ص ۴۰۱۱، ص ۴۰۲۵، ص ۴۰۳۹، ص ۴۰۵۳، ص ۴۰۶۷، ص ۴۰۸۱، ص ۴۰۹۵، ص ۴۱۰۹، ص ۴۱۲۳، ص ۴۱۳۷، ص ۴۱۵۱، ص ۴۱۶۵، ص ۴۱۷۹، ص ۴۱۹۳، ص ۴۲۰۷، ص ۴۲۲۱، ص ۴۲۳۵، ص ۴۲۴۹، ص ۴۲۶۳، ص ۴۲۷۷، ص ۴۲۹۱، ص ۴۳۰۵، ص ۴۳۱۹، ص ۴۳۳۳، ص ۴۳۴۷، ص ۴۳۶۱، ص ۴۳۷۵، ص ۴۳۸۹، ص ۴۴۰۳، ص ۴۴۱۷، ص ۴۴۳۱، ص ۴۴۴۵، ص ۴۴۵۹، ص ۴۴۷۳، ص ۴۴۸۷، ص ۴۵۰۱، ص ۴۵۱۵، ص ۴۵۲۹، ص ۴۵۴۳، ص ۴۵۵۷، ص ۴۵۷۱، ص ۴۵۸۵، ص ۴۵۹۹، ص ۴۶۱۳، ص ۴۶۲۷، ص ۴۶۴۱، ص ۴۶۵۵، ص ۴۶۶۹، ص ۴۶۸۳، ص ۴۶۹۷، ص ۴۷۱۱، ص ۴۷۲۵، ص ۴۷۳۹، ص ۴۷۵۳، ص ۴۷۶۷، ص ۴۷۸۱، ص ۴۷۹۵، ص ۴۸۰۹، ص ۴۸۲۳، ص ۴۸۳۷، ص ۴۸۵۱، ص ۴۸۶۵، ص ۴۸۷۹، ص ۴۸۹۳، ص ۴۹۰۷، ص ۴۹۲۱، ص ۴۹۳۵، ص ۴۹۴۹، ص ۴۹۶۳، ص ۴۹۷۷، ص ۴۹۹۱، ص ۵۰۰۵، ص ۵۰۱۹، ص ۵۰۳۳، ص ۵۰۴۷، ص ۵۰۶۱، ص ۵۰۷۵، ص ۵۰۸۹، ص ۵۱۰۳، ص ۵۱۱۷، ص ۵۱۳۱، ص ۵۱۴۵، ص ۵۱۵۹، ص ۵۱۷۳، ص ۵۱۸۷، ص ۵۲۰۱، ص ۵۲۱۵، ص ۵۲۲۹، ص ۵۲۴۳، ص ۵۲۵۷، ص ۵۲۷۱، ص ۵۲۸۵، ص ۵۲۹۹، ص ۵۳۱۳، ص ۵۳۲۷، ص ۵۳۴۱، ص ۵۳۵۵، ص ۵۳۶۹، ص ۵۳۸۳، ص ۵۳۹۷، ص ۵۴۱۱، ص ۵۴۲۵، ص ۵۴۳۹، ص ۵۴۵۳، ص ۵۴۶۷، ص ۵۴۸۱، ص ۵۴۹۵، ص ۵۵۰۹، ص ۵۵۲۳، ص ۵۵۳۷، ص ۵۵۵۱، ص ۵۵۶۵، ص ۵۵۷۹، ص ۵۵۹۳، ص ۵۶۰۷، ص ۵۶۲۱، ص ۵۶۳۵، ص ۵۶۴۹، ص ۵۶۶۳، ص ۵۶۷۷، ص ۵۶۹۱، ص ۵۷۰۵، ص ۵۷۱۹، ص ۵۷۳۳، ص ۵۷۴۷، ص ۵۷۶۱، ص ۵۷۷۵، ص ۵۷۸۹، ص ۵۸۰۳، ص ۵۸۱۷، ص ۵۸۳۱، ص ۵۸۴۵، ص ۵۸۵۹، ص ۵۸۷۳، ص ۵۸۸۷، ص ۵۹۰۱، ص ۵۹۱۵، ص ۵۹۲۹، ص ۵۹۴۳، ص ۵۹۵۷، ص ۵۹۷۱، ص ۵۹۸۵، ص ۵۹۹۹، ص ۶۰۱۳، ص ۶۰۲۷، ص ۶۰۴۱، ص ۶۰۵۵، ص ۶۰۶۹، ص ۶۰۸۳، ص ۶۰۹۷، ص ۶۱۱۱، ص ۶۱۲۵، ص ۶۱۳۹، ص ۶۱۵۳، ص ۶۱۶۷، ص ۶۱۸۱، ص ۶۱۹۵، ص ۶۲۰۹، ص ۶۲۲۳، ص ۶۲۳۷، ص ۶۲۵۱، ص ۶۲۶۵، ص ۶۲۷۹، ص ۶۲۹۳، ص ۶۳۰۷، ص ۶۳۲۱، ص ۶۳۳۵، ص ۶۳۴۹، ص ۶۳۶۳، ص ۶۳۷۷، ص ۶۳۹۱، ص ۶۴۰۵، ص ۶۴۱۹، ص ۶۴۳۳، ص ۶۴۴۷، ص ۶۴۶۱، ص ۶۴۷۵، ص ۶۴۸۹، ص ۶۵۰۳، ص ۶۵۱۷، ص ۶۵۳۱، ص ۶۵۴۵، ص ۶۵۵۹، ص ۶۵۷۳، ص ۶۵۸۷، ص ۶۶۰۱، ص ۶۶۱۵، ص ۶۶۲۹، ص ۶۶۴۳، ص ۶۶۵۷، ص ۶۶۷۱، ص ۶۶۸۵، ص ۶۶۹۹، ص ۶۷۱۳، ص ۶۷۲۷، ص ۶۷۴۱، ص ۶۷۵۵، ص ۶۷۶۹، ص ۶۷۸۳، ص ۶۷۹۷، ص ۶۸۱۱، ص ۶۸۲۵، ص ۶۸۳۹، ص ۶۸۵۳، ص ۶۸۶۷، ص ۶۸۸۱، ص ۶۸۹۵، ص ۶۹۰۹، ص ۶۹۲۳، ص ۶۹۳۷، ص ۶۹۵۱، ص ۶۹۶۵، ص ۶۹۷۹، ص ۶۹۹۳، ص ۷۰۰۷، ص ۷۰۲۱، ص ۷۰۳۵، ص ۷۰۴۹، ص ۷۰۶۳، ص ۷۰۷۷، ص ۷۰۹۱، ص ۷۱۰۵، ص ۷۱۱۹، ص ۷۱۳۳، ص ۷۱۴۷، ص ۷۱۶۱، ص ۷۱۷۵، ص ۷۱۸۹، ص ۷۲۰۳، ص ۷۲۱۷، ص ۷۲۳۱، ص ۷۲۴۵، ص ۷۲۵۹، ص ۷۲۷۳، ص ۷۲۸۷، ص ۷۲۹۱، ص ۷۳۰۵، ص ۷۳۱۹، ص ۷۳۳۳، ص ۷۳۴۷، ص ۷۳۶۱، ص ۷۳۷۵، ص ۷۳۸۹، ص ۷۴۰۳، ص ۷۴۱۷، ص ۷۴۳۱، ص ۷۴۴۵، ص ۷۴۵۹، ص ۷۴۷۳، ص ۷۴۸۷، ص ۷۴۹۱، ص ۷۵۰۵، ص ۷۵۱۹، ص ۷۵۳۳، ص ۷۵۴۷، ص ۷۵۶۱، ص ۷۵۷۵، ص ۷۵۸۹، ص ۷۶۰۳، ص ۷۶۱۷، ص ۷۶۳۱، ص ۷۶۴۵، ص ۷۶۵۹، ص ۷۶۷۳، ص ۷۶۸۷، ص ۷۶۹۱، ص ۷۷۰۵، ص ۷۷۱۹، ص ۷۷۳۳، ص ۷۷۴۷، ص ۷۷۶۱، ص ۷۷۷۵، ص ۷۷۸۹، ص ۷۸۰۳، ص ۷۸۱۷، ص ۷۸۳۱، ص ۷۸۴۵، ص ۷۸۵۹، ص ۷۸۷۳، ص ۷۸۸۷، ص ۷۸۹۱، ص ۷۹۰۵، ص ۷۹۱۹، ص ۷۹۳۳، ص ۷۹۴۷، ص ۷۹۶۱، ص ۷۹۷۵، ص ۷۹۸۹، ص ۸۰۰۳، ص ۸۰۱۷، ص ۸۰۳۱، ص ۸۰۴۵، ص ۸۰۵۹، ص ۸۰۷۳، ص ۸۰۸۷، ص ۸۱۰۱، ص ۸۱۱۵، ص ۸۱۲۹، ص ۸۱۴۳، ص ۸۱۵۷، ص ۸۱۷۱، ص ۸۱۸۵، ص ۸۱۹۹، ص ۸۲۱۳، ص ۸۲۲۷، ص ۸۲۴۱، ص ۸۲۵۵، ص ۸۲۶۹، ص ۸۲۸۳، ص ۸۲۹۷، ص ۸۳۱۱، ص ۸۳۲۵، ص ۸۳۳۹، ص ۸۳۵۳، ص ۸۳۶۷، ص ۸۳۸۱، ص ۸۳۹۵، ص ۸۴۰۹، ص ۸۴۲۳، ص ۸۴۳۷، ص ۸۴۵۱، ص ۸۴۶۵، ص ۸۴۷۹، ص ۸۴۹۳، ص ۸۵۰۷، ص ۸۵۲۱، ص ۸۵۳۵، ص ۸۵۴۹، ص ۸۵۶۳، ص ۸۵۷۷، ص ۸۵۹۱، ص ۸۶۰۵، ص ۸۶۱۹، ص ۸۶۳۳، ص ۸۶۴۷، ص ۸۶۶۱، ص ۸۶۷۵، ص ۸۶۸۹، ص ۸۷۰۳، ص ۸۷۱۷، ص ۸۷۳۱، ص ۸۷۴۵، ص ۸۷۵۹، ص ۸۷۷۳، ص ۸۷۸۷، ص ۸۷۹۱، ص ۸۸۰۵، ص ۸۸۱۹، ص ۸۸۳۳، ص ۸۸۴۷، ص ۸۸۶۱، ص ۸۸۷۵، ص ۸۸۸۹، ص ۸۹۰۳، ص ۸۹۱۷، ص ۸۹۳۱، ص ۸۹۴۵، ص ۸۹۵۹، ص ۸۹۷۳، ص ۸۹۸۷، ص ۸۹۹۱، ص ۹۰۰۵، ص ۹۰۱۹، ص ۹۰۳۳، ص ۹۰۴۷، ص ۹۰۶۱، ص ۹۰۷۵، ص ۹۰۸۹، ص ۹۱۰۳، ص ۹۱۱۷، ص ۹۱۳۱، ص ۹۱۴۵، ص ۹۱۵۹، ص ۹۱۷۳، ص ۹۱۸۷، ص ۹۱۹۱، ص ۹۲۰۵، ص ۹۲۱۹، ص ۹۲۳۳، ص ۹۲۴۷، ص ۹۲۶۱، ص ۹۲۷۵، ص ۹۲۸۹، ص ۹۲۹۳، ص ۹۳۰۷، ص ۹۳۲۱، ص ۹۳۳۵، ص ۹۳۴۹، ص ۹۳۶۳، ص ۹۳۷۷، ص ۹۳۹۱، ص ۹۴۰۵، ص ۹۴۱۹، ص ۹۴۳۳، ص ۹۴۴۷، ص ۹۴۶۱، ص ۹۴۷۵، ص ۹۴۸۹، ص ۹۴۹۳، ص ۹۵۰۷، ص ۹۵۲۱، ص ۹۵۳۵، ص ۹۵۴۹، ص ۹۵۶۳، ص ۹۵۷۷، ص ۹۵۹۱، ص ۹۶۰۵، ص ۹۶۱۹، ص ۹۶۳۳، ص ۹۶۴۷، ص ۹۶۶۱، ص ۹۶۷۵، ص ۹۶۸۹، ص ۹۶۹۳، ص ۹۷۰۷، ص ۹۷۲۱، ص ۹۷۳۵، ص ۹۷۴۹، ص ۹۷۶۳، ص ۹۷۷۷، ص ۹۷۹۱، ص ۹۸۰۵، ص ۹۸۱۹، ص ۹۸۳۳، ص ۹۸۴۷، ص ۹۸۶۱، ص ۹۸۷۵، ص ۹۸۸۹، ص ۹۸۹۳، ص ۹۹۰۷، ص ۹۹۲۱، ص ۹۹۳۵، ص ۹۹۴۹، ص ۹۹۶۳، ص ۹۹۷۷، ص ۹۹۹۱، ص ۱۰۰۰۵، ص ۱۰۰۱۹، ص ۱۰۰۳۳، ص ۱۰۰۴۷، ص ۱۰۰۶۱، ص ۱۰۰۷۵، ص ۱۰۰۸۹، ص ۱۰۱۰۳، ص ۱۰۱۱۷، ص ۱۰۱۳۱، ص ۱۰۱۴۵، ص ۱۰۱۵۹، ص ۱۰۱۷۳، ص ۱۰۱۸۷، ص ۱۰۱۹۱، ص ۱۰۲۰۵، ص ۱۰۲۱۹، ص ۱۰۲۳۳، ص ۱۰۲۴۷، ص ۱۰۲۶۱، ص ۱۰۲۷۵، ص ۱۰۲۸۹، ص ۱۰۲۹۳، ص ۱۰۳۰۷، ص ۱۰۳۲۱، ص ۱۰۳۳۵، ص ۱۰۳۴۹، ص ۱۰۳۶۳، ص ۱۰۳۷۷، ص ۱۰۳۹۱، ص ۱۰۴۰۵، ص ۱۰۴۱۹، ص ۱۰۴۳۳، ص ۱۰۴۴۷، ص ۱۰۴۶۱، ص ۱۰۴۷۵، ص ۱۰۴۸۹، ص ۱۰۴۹۳، ص ۱۰۵۰۷، ص ۱۰۵۲۱، ص ۱۰۵۳۵، ص ۱۰۵۴۹، ص ۱۰۵۶۳، ص ۱۰۵۷۷، ص ۱۰۵۹۱، ص ۱۰۶۰۵، ص ۱۰۶۱۹، ص ۱۰۶۳۳، ص ۱۰۶۴۷، ص ۱۰۶۶۱، ص ۱۰۶۷۵، ص ۱۰۶۸۹، ص ۱۰۶۹۳، ص ۱۰۷۰۷، ص ۱۰۷۲۱، ص ۱۰۷۳۵، ص ۱۰۷۴۹، ص ۱۰۷۶۳، ص ۱۰۷۷۷، ص ۱۰۷۹۱، ص ۱۰۸۰۵، ص ۱۰۸۱۹، ص ۱۰۸۳۳، ص ۱۰۸۴۷، ص ۱۰۸۶۱، ص ۱۰۸۷۵، ص ۱۰۸۸۹، ص ۱۰۸۹۳، ص ۱۰۹۰۷، ص ۱۰۹۲۱، ص ۱۰۹۳۵، ص ۱۰۹۴۹، ص ۱۰۹۶۳، ص ۱۰۹۷۷، ص ۱۰۹۹۱، ص ۱۱۰۰۵، ص ۱۱۰۱۹، ص ۱۱۰۳۳، ص ۱۱۰۴۷، ص ۱۱۰۶۱، ص ۱۱۰۷۵، ص ۱۱۰۸۹، ص ۱۱۱۰۳، ص ۱۱۱۱۷، ص ۱۱۱۳۱، ص ۱۱۱۴۵، ص ۱۱۱۵۹، ص ۱۱۱۷۳، ص ۱۱۱۸۷، ص ۱۱۱۹۱، ص ۱۱۲۰۵، ص ۱۱۲۱۹، ص ۱۱۲۳۳، ص ۱۱۲۴۷، ص ۱۱۲۶۱، ص ۱۱۲۷۵، ص ۱۱۲۸۹، ص ۱۱۲۹۳، ص ۱۱۳۰۷، ص ۱۱۳۲۱، ص ۱۱۳۳۵، ص ۱۱۳۴۹، ص ۱۱۳۶۳، ص ۱۱۳۷۷، ص ۱۱۳۹۱، ص ۱۱۴۰۵، ص ۱۱۴۱۹، ص ۱۱۴۳۳، ص ۱۱۴۴۷، ص ۱۱۴۶۱، ص ۱۱۴۷۵، ص ۱۱۴۸۹، ص ۱۱۴۹۳، ص ۱۱۵۰۷، ص ۱۱۵۲۱، ص ۱۱۵۳۵، ص ۱۱۵۴۹، ص ۱۱۵۶۳، ص ۱۱۵۷۷، ص ۱۱۵۹۱، ص ۱۱۶۰۵، ص ۱۱۶۱۹، ص ۱۱۶۳۳، ص ۱۱۶۴۷، ص ۱۱۶۶۱، ص ۱۱۶۷۵، ص ۱۱۶۸۹، ص ۱۱۶۹۳، ص ۱۱۷۰۷، ص ۱۱۷۲۱، ص ۱۱۷۳۵، ص ۱۱۷۴۹، ص ۱۱۷۶۳، ص ۱۱۷۷۷، ص ۱۱۷۹۱، ص ۱۱۸۰۵، ص ۱۱۸۱۹، ص ۱۱۸۳۳، ص ۱۱۸۴۷، ص ۱۱۸۶۱، ص ۱۱۸۷۵، ص ۱۱۸۸۹، ص ۱۱۸۹۳، ص ۱۱۹۰۷، ص ۱۱۹۲۱، ص ۱۱۹۳۵، ص ۱۱۹۴۹، ص ۱۱۹۶۳، ص ۱۱۹۷۷، ص ۱۱۹۹۱، ص ۱۲۰۰۵، ص ۱۲۰۱۹، ص ۱۲۰۳۳، ص ۱۲۰۴۷، ص ۱۲۰۶۱، ص ۱۲۰۷۵، ص ۱۲۰۸۹، ص ۱۲۱۰۳، ص ۱۲۱۱۷، ص ۱۲۱۳۱، ص ۱۲۱۴۵، ص ۱۲۱۵۹، ص ۱۲۱۷۳، ص ۱۲۱۸۷، ص ۱۲۱۹۱، ص ۱۲۲۰۵، ص ۱۲۲۱۹، ص ۱۲۲۳۳، ص ۱۲۲۴۷، ص ۱۲۲۶۱، ص ۱۲۲۷۵، ص ۱۲۲۸۹، ص ۱۲۲۹۳، ص ۱۲۳۰۷، ص ۱۲۳۲۱، ص ۱۲۳۳۵، ص ۱۲۳۴۹، ص ۱۲۳۶۳، ص ۱۲۳۷۷، ص ۱۲۳۹۱، ص ۱۲۴۰۵، ص ۱۲۴۱۹، ص ۱۲۴۳۳، ص ۱۲۴۴۷، ص ۱۲۴۶۱، ص ۱۲۴۷۵، ص ۱۲۴۸۹، ص ۱۲۴۹۳، ص ۱۲۵۰۷، ص ۱۲۵۲۱، ص ۱۲۵۳۵، ص ۱۲۵۴۹، ص ۱۲۵۶۳، ص ۱۲۵۷۷، ص ۱۲۵۹۱، ص ۱۲۶۰۵، ص ۱۲۶۱۹، ص ۱۲۶۳۳، ص ۱۲۶۴۷، ص ۱۲۶۶۱، ص ۱۲۶۷۵، ص ۱۲۶۸۹، ص ۱۲۶۹۳، ص ۱۲۷۰۷، ص ۱۲۷۲۱، ص ۱۲۷۳۵، ص ۱۲۷۴۹، ص ۱۲۷۶۳، ص ۱۲۷۷۷، ص ۱۲۷۹۱، ص ۱۲۸۰۵، ص ۱۲۸۱۹، ص ۱۲۸۳۳، ص ۱۲۸۴۷، ص ۱۲۸۶۱، ص ۱۲۸۷۵، ص ۱۲۸۸۹، ص ۱۲۸۹۳، ص ۱۲۹۰۷، ص ۱۲۹۲۱، ص ۱۲۹۳۵، ص ۱۲۹۴۹، ص ۱۲۹۶۳، ص ۱۲۹۷۷، ص ۱۲۹۹۱، ص ۱۳۰۰۵، ص ۱۳۰۱۹، ص ۱۳۰۳۳، ص ۱۳۰۴۷، ص ۱۳۰۶۱، ص ۱۳۰۷۵، ص ۱۳۰۸۹، ص ۱۳۱۰۳، ص ۱۳۱۱۷، ص ۱۳۱۳۱، ص ۱۳۱۴۵، ص ۱۳۱۵۹، ص ۱۳۱۷۳، ص ۱۳۱۸۷، ص ۱۳۱۹۱، ص ۱۳۲۰۵، ص ۱۳۲۱۹، ص ۱۳۲۳۳، ص ۱۳۲۴۷، ص ۱۳۲۶۱، ص ۱۳۲۷۵، ص ۱۳۲۸۹، ص ۱۳۲۹۳، ص ۱۳۳۰۷، ص ۱۳۳۲۱، ص ۱۳۳۳۵، ص ۱۳۳۴۹، ص ۱۳۳۶۳، ص ۱۳۳۷۷، ص ۱۳۳۹۱، ص ۱۳۴۰۵، ص ۱۳۴۱۹، ص ۱۳۴۳۳، ص ۱۳۴۴۷، ص ۱۳۴۶۱، ص ۱۳۴۷۵، ص ۱۳۴۸۹، ص ۱۳۴۹۳، ص ۱۳۵۰۷، ص ۱۳۵۲۱، ص ۱۳۵۳۵، ص ۱۳۵۴۹، ص ۱۳۵۶۳، ص ۱۳۵۷۷، ص ۱۳۵۹۱، ص ۱۳۶۰۵، ص ۱۳۶۱۹، ص ۱۳۶۳۳، ص ۱۳۶۴۷، ص ۱۳۶۶۱، ص ۱۳۶۷۵، ص ۱۳۶۸۹، ص ۱۳۶۹۳، ص ۱۳۷۰۷، ص ۱۳۷۲۱، ص ۱۳۷۳۵، ص ۱۳۷۴۹، ص ۱۳۷۶۳، ص ۱۳۷۷۷، ص ۱۳۷۹۱، ص ۱۳۸۰۵، ص ۱۳۸۱۹، ص ۱۳۸۳۳، ص ۱۳۸۴۷، ص ۱۳۸۶۱، ص ۱۳۸۷۵، ص ۱۳۸۸۹، ص ۱۳۸۹

کے بھی بڑے قائل اور اس کی تعلیم کے مبلغ ہیں، ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر علماء و فقہار سے اپنی کتابوں میں بعض بڑی افسوسناک فروگزاشتیں ہوئی ہیں، جو ان کے منصب اور علم و فضل کے شایانِ شان نہیں، اس لئے وہ طالب علم کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہر فن سے وہ فی الجملہ واقف ہو، اور تاریخ سے اتنی واقف رکھتا ہو کہ کوئی بڑی تاریخی غلطی نہ کر بیٹھے جو اس کی نخفت کا باعث ہو، "صدیہ الخاطر" میں لکھتے ہیں:-

"فقیر کو چاہئے کہ ہر فن کے ضروری حصہ سے واقف ہو، تاریخ ہو یا حدیث، لغت ہو یا دوسرا فن، اس لئے کہ فقہ تمام علوم کا محتاج ہے، اس لئے ہر فن کے ضروری حصہ سے اس کو واقف ہونا چاہئے، میں نے بعض فقہار کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیخ شبلیؒ اور قاضی شریک ایک مجلس میں جمع ہوئے مجھے سن کر تعجب ہوا کہ اس کو دونوں ہندگوں کے زمانہ کا فاصلہ نہیں معلوم! ایک عالم نے ایک مباحثہ کے دوران میں کہا کہ حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے درمیان زوجیت منقطع نہیں ہوئی تھی، اس لئے حضرت علیؓ نے سیدہ کو غسل دیا، میں نے کہا کہ خدا تمہارا بھلا کرے، پھر حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے بعد ان کی بھانجی امہ بنت زینبؓ سے نکاح کیسے کیا، اسی طرح میں نے امام غزالیؒ کی کتاب حیا العلوم میں اسی تاریخ فریروز گزشتیں دیکھیں جن سے مجھے سخت حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس طرح مختلف واقعات اور تواریخ کو آپس میں ملا دیا، میں نے ان تاریخوں اور غلطیوں کا ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے، اسی طرح انھوں نے اپنی کتاب "مستظہری" میں لکھا ہے، جس کو انھوں نے مستظہر باشہر کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ سلیمان ابن عبدالملک نے ابو حازم سے کہلایا کہ مجھے اپنے ناشتہ میں سے کچھ تبرکات بھیجو، انھوں نے ان کے پاس ابلا ہوا چکر بھیجا، سلیمان نے اس کا ناشتہ کیا، پھر اپنی بیوی سے ہم بستری ہوا، اور اس سے عبدالعزیز پیدا ہوئے، عبدالعزیز کے عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے، یہ سخت معالطہ ہے، اس لئے کہ انھوں نے عمر ابن عبدالعزیز کو سلیمان بن عبدالملک کا پوتا قرار دیا، حالانکہ وہ اس کے ابن عم تھے، شیخ ابوالعالی جوینی نے اپنی کتاب "اشامل" کے آخرین اصول فقہ

میں ہے، لکھا ہے کہ اہل باطن کی ایک جماعت ناقل ہے کہ حلاج، جناب قمر مطیٰ اور ابن المقفع نے سلطنتوں کے نظام کے اٹنے، مملکت کی تخریب اور عوام کی استمالت کی سازش کی، اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کی ذمہ داری لے لی، جنابی نے احسا میں سکونت اختیار کی، ابن المقفع ترکستان کے حدود میں جا بسا، اور حلاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا، اس پر اس کے دونوں ساتھیوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا، اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا، اس لئے کہ اہل بغداد دعو کہ نہیں کھاتے اور بڑے مردم شناس اور فہیم ہیں، اور میں کہتا ہوں کہ اگر ناقل کو یہ معلوم ہوتا کہ حلاج نے ابن المقفع کا زمانہ ہی نہیں پایا، اس لئے کہ ابن المقفع کے قتل کا تصور نے حکم دیا تھا، اور یہ ۱۳۲ھ کا واقعہ ہے، درانجا ایک البوسیدہ جنابی کا ظہور ۲۸۶ھ میں ہوا ہے، اور حلاج ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا، اس بنا پر قمر مطیٰ اور حلاج کا زمانہ قریب قریب ہے، لیکن ابن المقفع بہت مقدم ہے، اس کے ان دونوں سے ملنے اور سازش کرنے کا کوئی امکان نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب علم کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھے، اور اس کا کچھ نہ کچھ مطالعہ ہو، اس لئے کہ ہر علم کا دوسرے علم سے تعلق ہے، ایک محدث کے لئے یہ بات کتنی عجیب ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق اس سے فتویٰ لیا جائے اور وہ جواب نہ دے سکے، اس لئے کہ وہ طرق حدیث کے صحیح کرنے میں مشغول ہے، اس کو مسائل و جزئیات کے علم کی فرصت ہی نہیں ہوتی، اسی طرح ایک فقیہ کے لئے یہ بات کتنی نامناسب ہے کہ اس سے ایک حدیث کا مطلب پوچھا جائے اور وہ حدیث کی صحت اور اس کے مفہوم سے بالکل ناواقف ہو، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایسی بن بہت عطا فرمائے، جو سب سے اوپر

بے ہمتی کی باتوں کو گوارا نہ کرے!

## تاریخی تصنیفات

انہوں نے صرف اس تنقید اور مشورہ پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک مبسوط کتاب **المنظوم فی تاریخ الملوک والامم**



لکھی جو دس جلدوں میں ہے اور جو ابتدائے اسلام سے لے کر ۵۷۴ء تک کے حالات پر مشتمل ہے مصنف پہلے سن لکھتے ہیں پھر اس سن کے اہم واقعات و حالات کا تذکرہ کرتے ہیں پھر اس سن میں جن ممتاز اور قابل ذکر اشخاص کا انتقال ہوا ہے ان کے حالات بیان کرتے ہیں اس طرح یہ کتاب حالات و تذکرہ دونوں کی ایک جامع تاریخ ہے۔

اسی طرح ان کی ایک مختصر کتاب "تلیغ فرہوم اہل الاثر فی عیون التاریخ والسیر" ہے جو ایک تاریخی بیاض کی حیثیت رکھتی ہے جس میں بہت سے تاریخی معلومات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

## ادبیت و خطابت

ابن جوزی کی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت پر مورخین کا اتفاق ہے ان کی مجالس و عظ کی مقبولیت اور لوگوں کے ازدحام کا یہی ایک بڑا سبب تھا، انھوں نے "صید الخاطر" میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے کہ نفس نے ان کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اس کا اہتمام بالکل چھوڑیں اور الفاظ کی طرف بالکل توجہ نہ کریں، یہ سب تکلف اور تصنع ہے لیکن انھوں نے اپنے علم اور تفقہ سے اس خیال کو وقع کیا اور اپنے نفس کو سمجھایا کہ حسن کلام ایک خدا داد قابلیت، ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے نہ کہ نقص اور عیب اس لئے ان کو دعوت و تبلیغ میں اس سے کام لینا چاہئے، اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہئے، اسی طرح ان کے دل میں کئی بار شدت اس کا خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وعظ گوئی اور دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر زہد و انقطاع کی زندگی اختیار کر لیں اور لوگوں سے بالکل کیس و ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں، مگر انھوں نے دلائل و براہین سے اور اپنے نفس سے مفصل مباحثہ و مناظرہ کر کے اس خیال کو

لے اس کتاب کے آخری پانچ حصے دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان میں

مولوی سید محمد یوسف صاحب ٹونکی مرحوم کے اہتمام سے شائع ہو چکی ہے۔

ہٹایا، اور اس کو قائل کیا کہ یہ القار شیطان ہے، شیطان یہ دیکھ نہیں سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے  
 جال سے نکل کر ہدایت کے راستے پر پڑ جائیں، انبیاء علیہم السلام کا راستہ دعوت و تبلیغ کا تھا اور ان کی  
 زندگی اجتماع و اختلاط کی تھی، اس میں نفس کا چور یہ ہے کہ وہ بیکاری اور تعطل کو پسند کرتا ہے، اور جدوجہد  
 سے بھاگتا ہے، دوسرے اس میں جاہ طلبی بھی ہے، اس لئے کہ عزت و گوشہ نشینی اور زہد و انقطاع کی زندگی  
 عوام کے لئے زیادہ باعث کشش اور جاذب توجہ ہے، غرض یہ کہ شیطان ان کو افادہ عوام اور عمومی دعوت  
 کے کام سے ہٹا نہیں سکا، انھوں نے اپنی ساری دماغی صلاحیتیں اور خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں اصلاح  
 پر لگادیں، اور نصف صدی سے زیادہ پوسے انہماک و قوت کے ساتھ اصلاح و افادہ کے کام میں مشغول رہے۔

## وفات

۱۹۵۷ء میں شب جمعہ کو اس داعی الی اللہ نے انتقال کیا، بغداد میں کہرام مچ گیا، بازار بند ہو گئے  
 جامع منصور میں نماز جنازہ ہوئی، یہ وسیع مسجد کثرت ازدحام سے تنگ اور ناکافی ثابت ہوئی، یہ بغداد  
 کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا، ہر طرف غم کے آثار اور گریہ کی آوازیں بلند تھیں، لوگوں کو ان سے  
 ایسا تعلق تھا کہ رمضان بھر لوگوں نے راتیں ان کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن مجید کے ختم کئے۔



# نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی

صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ

ایک طرف مرکز اسلام میں پوری قوت سے تصنیفی و تعلیمی کام ہو رہا تھا، اور دوسری طرف عظیم شخصیتیں صلاح و تربیت میں مشغول تھیں، دوسری طرف پورے عالم اسلام پر خطرہ کے بادل منڈلا رہے تھے، اور مسلمانوں کی ہستی اور نفس اسلام کا وجود زمین تھا، مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے خار کھائے بیٹھا تھا، مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے اور اس کے تمام مقدس مقامات اور خود مولد مسیح ان کے قبضہ اور تولیت میں تھا، یورپ کے اشتعال اور جذبہ انتقام کے لئے یہ صورت حال بالکل کافی تھی، لیکن طاقت ور اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت پر ان کی مسلسل پیش قدمیوں کے سبب اس کو یہ ہوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شام و فلسطین یا کسی اسلامی ملک کی طرف نظر اٹھائے، چوتھی سلطنت کے زوال اور اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدوں کی کمزوری کی وجہ سے یورپ میں قسمت آزمائی کا خیال پیدا ہوا، اسی عرصہ میں اس کو راہب پطرس کی صورت میں ایک ایسا خطیب اور مذہبی واعظ مل گیا جس نے ساری مسیحی دنیا میں اپنی آتش زوایوں سے آگ لگادی اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مذہبی جنون کی ایک لہر پیدا کر دی، اس کے علاوہ وسیع و زرخیز اسلامی مملکت پر حملہ کرنے کے اور بھی متعدد سیاسی و معاشی اسباب و محرکات جمع ہو گئے جنہوں نے صلیبی حملوں میں دینی و دنیاوی کشش اور ترغیب پیدا کر دی۔

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "انسائیکلو پیڈیا ریٹانیکا" ج ۶، صفحہ ۱۶۱ (CRUSADES)

بہر حال ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں کے پہلے لشکر نے شام کی طرف کوچ کیا، دو سال کے عرصہ میں صلیبیوں کے لشکر نے الرہا (ایڈریا) اور ولایت انطاکیہ کے بڑے شہروں بہت سے قلعوں اور صلب پر قبضہ کر لیا، ۱۰۹۲ء مطابق ۱۰۹۹ء میں صلیبی بارزوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا، اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انطرطوس، عکہ طرابلس الشرق اور صیدا صلیبیوں کے تصرف میں آ گیا، مشہور انگریز مورخ سٹنلین پون کے بقول صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پیکر ٹھونکے، تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھٹیاں اڑا دیں گے، صلیبیوں نے داخلہ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مورخ ان الفاظ میں کرتا ہے :-

”بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی مجاہدین نے ایسا قتل عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر سوار ہو کر گئے، گھٹنوں گھٹنوں خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا، یا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا، یہودی کل کے کل اپنے ہیکل (مجد) میں زندہ جلا دیئے گئے“

”دوسرے دن اس سے بڑے پیمانہ پر ان رزہ خیز مظالم کا جان بوجھ کر اعادہ کیا گیا، ٹینکر ڈنہ تین سو قیدیوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت کی تھی، وہ چیتھا چلاتا رہا، اور ان سب کو باہر لاکر قتل کر دیا گیا، پھر ایک زبردست قتل عام شروع ہوا، مردوں عورتوں اور بچوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیئے گئے، ان کی لاشوں کے ٹکڑوں اور کٹے ہوئے اعضا کے ڈھیر لگے تھے، بالآخر یہ سفاک قتل عام اختتام کو پہنچا شہر کی خون آلودہ سڑکوں کو عرب قیدیوں سے دھلوایا گیا“

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور

اس کی نوخیز طاقت کی خبر دیتی تھی، اور عالم اسلام میں خطرہ کی گھنٹی تھی، شام و فلسطین میں مستقل چار عیسائی ریاستیں (قدس، انطاکیہ، طرابلس، اور یافا کی) قائم ہو چکی تھیں، جو مرکز اسلام (حجاز) کی آزادی اور حرمت کے لئے مستقل خطرہ تھیں اور مسیحیوں کے جوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے، کہ رنجی نالڈوالی کرک نے کہ معطر اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اور روضہ اطہر سے متعلق گستاخانہ اور اہانت آمیز کلمات اور ارادوں کا اظہار کیا، حقیقت یہ ہے کہ واقعہ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھڑی نہیں آئی یہ دوسرا موقع تھا کہ اسلام کا وجود خطرہ میں تھا، اور عالم اسلام کو ایک فیصلہ کن جنگ کرنی ضروری تھی۔

چھٹی صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ عالم اسلام میں بڑے انتشار و بد نظمی کا تھا، ملک شاہ سلجوقی کے جانشین باہم دست و گریباں تھے، خلفاء بنی عباس مدتوں پہلے ترکوں کو اپنی طاقت منتقل کر چکے تھے، عالم اسلام میں کوئی طاقتور سلطان اور کوئی ایسا قائد نہ تھا، جو تنظیمی صلاحیتیں رکھتا ہو اور جو عالم اسلام کی کچی کھچی طاقت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے شمال و مغرب سے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کر سکے، سنیٹلین پول نے صحیح لکھا ہے کہ "یہ زمانہ التباس و تذبذب کا تھا، کہ اتنی وسیع اور عظیم الشوکت (سلجوقی) سلطنت کو موت کے کرب میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر ہر شخص پر تحیر کا عالم طاری تھا، یہ بیچ کا زمانہ اس وقت تک بد نظمی کا تھا، جب تک کہ نئی طاقتیں پورے طور پر یکجہت ہو کر ایک ہی سمت میں رجوع نہ ہو جائیں، مختصر یہ کہ یہی وہ ٹھیک وقت تھا، جب کہ یورپ ولے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو ممکن کر لیں۔"

## اتابک عماد الدین زنگی

لیکن عین اس کشمکش اور بڑھتی ہوئی مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع

۱۱۷۱ء (۱۱۷۱ء) سلطنت سلجوقی (اسٹینٹلین پول) ۱۱۷۱ء سے ایضاً ص ۲۱

ہوا، عالم اسلام کو حسب معمول صین ضرورت کے موقع پر ایک نیا قائد اور ایک تازہ دم مجاہد مل گیا، اور جس گوشہ سے امید نہ تھی، وہاں سے ایک نئی طاقت ابھری، جس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔  
لین پول لکھتا ہے:-

”مسلمانوں کے لئے ضروری ہوا کہ وہ جہاد کا اعلان کریں اور ایک ایسا سردار پیدا کریں جس کی دیر اور ہمت اور جنگی قابلیت کا سبب بننے لگیں، ترکمانی سردار اور ان کے ماتحت والیان ملک ایک ایسی جوانمرد اور جنگجو دینداروں کی جماعت پیدا کریں جن کے سامنے صلیبیوں کو اپنے مظالم اور زیادتیوں کا جواب دینا پڑے اور اب یہ سردار عماد الدین زنگی کی ذات میں نمودار ہوا“

عماد الدین سلجوقیوں کا پروردہ نعمت تھا، وہ سلطان محمود سلجوقی کے شہزادوں کا اناستق (انابک) اور سلطان کی طرف سے موصل کا حاکم تھا، زنگی نے عراق و شام میں اپنی طاقت مستحکم و منظم کر کے الرہا (ایڈریا) پر حملہ کیا جو عیسائیوں کی ریاست میں سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم مقام تھا، اور اس کو بڑی فوجی اہمیت حاصل تھی، ۷ جہادی الاخری ۵۳۹ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۱۴۲ء کو اس نے الرہا پر قبضہ کر لیا، عرب مورخین کے الفاظ میں یہ فتح الفتح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا سہارا تھا، اس طرح فرات کی وادی صلیبیوں کے خطرہ سے محفوظ ہو گئی، اس فتح کے کچھ عرصہ بعد ۵۴۱ھ مطابق ۱۱۴۶ء میں وہ ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہو گیا، شہادت سے پہلے اس نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کی شاندار ابتدا کر دی تھی، جس کو اس کے نامور فرزند الملک العادل نور الدین زنگی نے بہت آگے تک پہنچا دیا۔

## الملک العادل نور الدین زنگی

نور الدین محمود اب سلطان شام تھا، اور تمام مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے اخراج اور بیت المقدس

کے بازیافت کے لئے اپنے کو مامور من اللہ سمجھتا تھا، اور اس خدمت عظیم کو اپنی سب سے بڑی عبادت اور

تقرب الی اللہ کا ذریعہ جانتا تھا، اس نے اپنے حملوں سے تمام سچی ریاستوں پر دھاک بٹھادی تھی ۵۵۰ھ میں

وہ قلعہ حارم پر قابض ہوا، جو ایک مضبوط شمالی سرحدی قلعہ تھا، بادشاہ انطاکیہ نواب طرابلس مع دیگر مشہور

و معروف نائٹوں کے گرفتار ہو گئے، اس معرکہ میں دس ہزار عیسائی قتل ہوئے اور بے شمار قید اس قبضہ کے بعد

قلعہ بانیاں فتح کیا، ادھر اس نے مصر فتح کر کے عیسائیوں کو دو طرف سے محصور کر لیا، الین پول لکھتا ہے۔۔

”نور الدین سلطان شام کے سپہ سالار (صلاح الدین) کا روڈیل پر قابض ہو جانا یہی رکھتا تھا کہ

یروشلم کی مسیحی سلطنت ایک چری ہوئی لکڑی کے بیج میں آگئی تھی، دونوں طرف سے وہ دب رہی تھی

اور دونوں طرف جو چیز اسے بھینچ رہی تھی، وہ ایک ہی طاقت کے دو شکر تھے، دیماط اور اسکندریہ

کی بندرگاہوں پر قابض ہو جانے سے مسلمانوں کا قبضہ ایک جہازی بیڑے پر بھی ہو گیا، اور انھوں

نے مصر کے صلیبیوں کا تعلق یورپ سے منقطع کر دیا“

نور الدین نے تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کر دیا، لیکن اس کی سب سے بڑی آرزو

اور سب سے مقدس خدمت بیت المقدس کی بازیابی تھی، لیکن یہ سعادت اس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین

ایوبی کی قسمت میں تھی، جو خود نور الدین کے حسات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، ۵۶۹ھ مطابق ۱۱۷۳ء

کو چھپن برس کی عمر میں بعارضہ خناق اس کا انتقال ہوا، بقول انگریز مورخ سلطان نور الدین بادشاہ شام

کے مرنے کی خبر مسلمانوں میں اس طرح پہنچی جیسے آسمان سے بجلی گرے“

## نور الدین کے محامد و اوصاف

مسلمان مورخ سلطان نور الدین کے عدل، دیانت و تقویٰ حسن انتظام، شرافت، نفس، محامد و اخلاق

۱۱۵۱ء انکال (ابن اثیر) جلد ۱ ص ۱۱۱ ۱۱۵۲ سلطان صلاح الدین ص ۸۹ ۱۱۵۳ ایضاً ص ۱۱۵

اور جذبہ جہاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور وہ اپنے نام کی طرح ان سب کا "مدوح" و "محمود" ہے۔

ابن جوزی جو سلطان کے معاصر ہیں اپنی مشہور تاریخ المنتظم میں لکھتے ہیں :-

جاهد الثغور وانتزع من ایدی	نور الدین نے سرحدوں پر جہاد کیا اور کفار کے قبضہ
الکفار نیفاً وخصیماً مدینة، وکان	سے کچھ اور پچاس شہر آزاد کئے ان کی زندگی اکثر
سیرتہ اصليح من کثیر من الولاة والطر	سلاطین و حکام سے بہتر تھی راستے محفوظ تھے،
فی ایامہ امانة و المحامد له کثیرة وکان	ان کی تعریف کی باتیں بہت ہیں وہ خلانت بغداد
یتدین بطاعة الخلافة و ترک الملک	کی ماتمی و اطاعت کا اپنے کو پابند سمجھتے تھے، ارتقا
قبل موته وکان یعمل الی التواضع	سے پہلے ناجائز محاصل اور ٹیکس معاف کر دیئے
ومحبة العلماء و اهل الدین	طبیعت میں سادگی اور تواضع تھی اور علماء و

اہل دین سے محبت کرتے تھے۔

ابن خلکان جو اپنی مورخانہ احتیاطاً چینی لے لیا اور اپنی تالی تعریف میں مشہور ہیں لکھتے ہیں :-

وکان ملکاً عادلاً زاهداً عابداً وریعاً	وہ ایک منصف، زاہد، عابد، متقی، قبیح شریعت
متمتکاً بالشریعة مائلاً الی الخیر جاهداً	سلطان تھے اہل خیر کی طرف بڑا میلان رکھتے
فی سبیل اللہ تعالیٰ کثیر الصدقات	تھے اور جہاد فی سبیل اللہ کا خاص اہتمام تھا
بنی المدارس مجیع بلاد الشام الکبار	کثرت سے صدقات و خیرات کرتے، شام کے تمام
وله من المناقب والمآثر والمفاخر	بڑے بڑے شہروں میں مدارس تعمیر کئے، ان کے قب
ما یستغرق الوصف	یادگاروں اور کارناموں کا احاطہ مشکل ہے۔

تاریخ الکامل کے نامور مصنف ابن الاثیر جزیری نے ان کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ :-

ابن خلکان محمود نور الدین زنگی ج ۲ ص ۲۷۲

کر لہ المنتظم ج ۱ ص ۲۳۸-۲۳۹



وقد طالعت سير الملوك المتقدّمين

میں نے گذشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا

فلم ارقہا بعد الخلفاء الراشدین وعمر

مطالعہ کیا ہے، خلفاء راشدین اور عمر بن

بن عبد العزیز احسن من سیرة ولا اکثر

کے بعد نور الدین سے بہتر سیرت اور ان سے زیادہ

تحریراً منہ اللعدلی

عادل سلطان میری نظر سے نہیں گذرا۔

سلطان نور الدین کی وفات کے وقت ابن الاثیر کی عمر ۱۴ سال کی تھی، اس لئے ان کی روایت اور شہادت خاص وقعت رکھتی ہے، وہ سلطان مرحوم کی سیرت و اخلاق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”وہ صرف اپنی اس جائداد کی آمدنی سے کھاتے پینتے تھے، جو انھوں نے مال غنیمت میں اپنے حصہ کو

فروخت کر کے خریدی تھی، ان کی اہلیہ نے ایک مرتبہ تنگی کی شکایت کی تو انھوں نے اپنی تین دوکانیں بیچ

کے لئے دے دیں، جو حص میں ان کی ملکیت تھیں، اور جن کی سالانہ آمدنی بیس دینار کے قریب تھی، جب

یسوی نے اس کو کم سمجھا تو انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ تم میرے پاس

دیکھتی ہو وہ سب مسلمانوں کا ہے، میں محض خزانچی ہوں، میں... اس امانت میں خیانت کر کے تمہاری خاطر

جہنم میں جانا گوارا نہیں کر سکتا۔

وہ رات کو بڑی عبادت کرتے، ان کے اوراد و اذکار مقرر تھے، حنفی فقہ کے عالم تھے، لیکن تعصب سے

بری تھے، حدیث کا درس لیا، اور ثواب کی نیت سے اس کی روایت کی، اور اجازت دی۔

عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ اپنی وسیع سلطنت میں انھوں نے کوئی محصول اور چنگی باقی نہیں رکھی،

مصر و شام، جزیرہ موصل سب جگہ اس کو موقوف کر دیا، شریعت کا بڑا ادب کرتے تھے، اور اس کے احکام

کی تعمیل کرتے، ایک شخص نے ان کو عدالت میں طلب کیا، وہ حاضر ہو گئے، اور قاضی صاحب کو کہلا بھیجا

کہ میں عدالت میں حاضر ہو رہا ہوں، میرے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے، مقدر نہیں ان کو کابیلی

ہوئی تو انھوں نے اپنا حق معاف کر دیا، اور کہا کہ میرا پہلے سے یہی ارادہ تھا، لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ شاید عدالت میں حاضر نہ ہونے کا سبب میرا تکبر ہو، اس لئے میں حاضر ہو گیا، اور میں اپنا حق معاف کرتا ہوں، انھوں نے دارالعدل کی تعمیر کی تھی، جہاں وہ قاضی کے ساتھ بیٹھ کر مظلوم کا انصاف کرتے، خواہ وہ یہودی ہوتا، اور ظالم کو سزا دیتے، خواہ وہ ان کا فرزند ہوتا یا بڑے سے بڑا افسر اور حاکم۔

شجاعت ان پر ختم تھی، وہ جنگ میں دوکانیں اور دوزخیں ساتھ رکھتے تھے، ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کو اللہ کا واسطہ آپ اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کو مصیبت میں مبتلا نہ کریں، انھوں نے جواب دیا کہ محمود کیا چیز ہے کہ اس کے متعلق یہ بات کہی جائے مجھ سے پہلے ملک اور اسلام کی کس نے حفاظت کی؟ وہ مجبور برحق ہے لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ۔

علماء و اہل دین کی تعظیم کرتے تھے، ان کے لئے کھڑے ہو جاتے، اپنے پاس بٹھاتے، بے تکلفی سے باتیں کرتے، کسی بات سے انکار نہ کرتے، اپنے قلم سے ان کو خط لکھتے، لیکن اس تو واضح و خاکساری کے باوجود بڑے رعب و اب کے آدمی تھے، لوگوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کے مناقب و محامد کی یہ کتاب متحمل نہیں، اس کے لئے دفتر درکار ہے۔<sup>۱۹</sup>

## شوق جہاد اور ایمان و یقین

نور الدین کی تمام تر توجہ اور دلچسپی جہاد اور عیسائیوں کے مقابلہ سے تھی، اس بارہ میں اس کا عزم و اعتماد و توکل اور ایمان و یقین بہت بڑھا ہوا تھا۔

۵۵۵ھ میں نور الدین کو حصن الاکرا کے معرکہ میں (جو یقیناً کے معرکہ کے نام سے مشہور ہے) عیسائیوں کے اچانک حملہ کر دینے کی وجہ سے شکست ہوئی، نور الدین حصن کے قریب دشمن سے چند میل کے فاصلہ پر مقیم تھے،

بعض خیر خواہوں نے کہا کہ بادشاہ کا، فتحیاب دشمن کے اتنے قریب قیام کرنا، مناسب نہیں نورالدین نے ان کو خاموش کیا اور کہا کہ اگر ہزار سوار بھی میرے پاس ہوں تو مجھے دشمن کی پروا نہیں، خدا کی قسم میں جب تک اپنا اور اسلام کا انتقام نہ لے لوں گا کسی چھت کے نیچے نہ آؤں گا، نورالدین نے بڑی دریا دلی سے اہل لشکر کو عطا یا اور رقوم کی تقسیم کی بعض لوگوں نے ان سے کہا بھی کہ فقہار، فقرا اور صوفیہ و قراء کے لئے جو وظائف اور رقوم خزانہ شاہی سے مقرر ہیں، ان سے اس موقع پر کام لیا جائے، نورالدین نے غضبناک ہو کر جواب دیا کہ مجھے تو نصرتِ الہی کی امید نہیں فقرا، و معفرا کی دعا اور رضا سے ہے، حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ کی طرف سے رزق اور مدد کمزور بندوں کی بدولت ہوتی ہے" میں کس طرح ایسے لوگوں کی مدد بند کردوں جو ایسے وقت میں میری طرف سے جنگ کرتے ہیں، جب میں اپنے بستر پر سوتا ہوتا ہوں، اور ان کے تیر خطا نہیں جاتے، درانجا لیکہ جن کا تم تذکرہ کرتے ہو، وہ صرف اس وقت جنگ کرتے ہیں، جب مجھے دیکھتے ہیں، اور ان کے تیر کبھی خطا کر جاتے ہیں، کبھی نشانہ پر لگتے ہیں، ان غریبوں کا تو بیت المال میں حق بھی ہے، میں ان کا حق لے کر دوسروں کو کیوں کر دے دوں؟

نورالدین نے عیسائیوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی پوری تیاری کی، لشکر کو انعامات و تقسیمات سے نہال کر دیا، سرحدی مقامات اور اسلامی ریاستوں کے امراء و حکام کو پراثر خطوط لکھے، اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ اور شرکت و رفاقت کی ترغیب دی، ان مقامات کے زہاد و عباد اور صلحاء و فقراء کو بھی خطوط لکھے، جن میں فرنگیوں کی زیادتیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا، اور ان سے دعا کی درخواست کی، اور اس کی خواہش کی کہ وہ مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کریں، چنانچہ ان حضرات نے رور و کر لوگوں کو خطوط پڑھ کر سنائے، اور سلطان کے لئے دعا کی، لوگوں میں جوش جہاد کی ایک لہر پیدا ہو گئی، وایان ملک اپنے اپنے لشکر لے کر آئے، ادھر عیسائیوں نے بھی اپنی پوری طاقت اور ہر طرف کی افواج مقابلہ کے لئے جمع کر دیں، لیکن

سلطان نے اپنی نذر پوری کی اور عیسائیوں کی متحدہ طاقت پر فتح حاصل کر کے حارم پر قبضہ کر لیا۔  
 نور الدین کے ایمان و یقین کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قلعہ بانیا س کے محاصرہ میں اس کے بھائی  
 نصرۃ الدین امیر امیران کی ایک آنکھ جاتی رہی نور الدین نے دیکھا تو بھائی سے کہا کہ اگر تم کو وہ اجر و ثواب نظر آجائے  
 جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رکھا ہے تو تم کو تمنا ہو کہ دوسری آنکھ بھی راہ خدا میں کام آجائے۔

### سلطان صلاح الدین ایوبی

صلاح الدین ایوبی کی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معجزہ اور اسلام کی صداقت

ابدیت کی روشن دلیل ہے۔

ایک متوسط درجہ کے کرد شریف زادہ اور خاندانی سپاہی کی حیثیت سے ان کا نشوونما ہوا مصر  
 کی فتح اور صلیبیوں کے مقابلہ میں میدان میں آنے سے پہلے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کرد و نوجوان

۱۱۲۲ء ۱۲۳۱ء ایضاً ۱۲۳۲ء ۱۲۳۳ء سلطان صلاح الدین ایوبی اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کے والد

کا نام ایوب تھا، اسی نسبت سے سارا خاندان ایوبی کہلاتا ہے، یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کا کوئی تعلق ابو ایوب انصاری سے ہے،  
 سلطان اور ان کا پورا خاندان نسلاً کر دے، یہ قوم اب بھی عراق، شام، ترکی اور ایران میں پائی جاتی ہے۔

۱۱۲۲ء ان کے والدین اور اہل خاندان مشرقی آذربائیجان کے گاؤں "دوین" کے رہنے والے تھے، ان کا تعلق قبیلہ "بذانیہ"

کی ایک شاخ "روادیہ" سے تھا جو کردوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا شاوی اپنے

دونوں لڑکوں ایوب نجم الدین اور شیر کوہ اسد الدین کو لے کر بغداد منتقل ہو گئے تھے، اس کے بعد تکریت میں سکونت پذیر ہو گئے

اور وہیں شادی کا انتقال ہوا، کچھ دن کے بعد یہ دونوں لڑکے مجاہد الدین بہروز کو تو ال شہر کے عمل میں داخل ہو گئے، جو سلطان

مسعود بن غیاث الدین محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف سے مامور کیا گیا تھا، نجم الدین ایوب اس کے بعد عماد الدین زنگی

سے متعلق ہو گئے، اور قلعہ "بعلبک" وغیرہ کے محافظ بنا دیئے گئے، (صلاح الدین ایوبی از محمد فرید ابو جریڈ ص ۶۲، ۶۱)

بیت المقدس کا فاتح اور عالم اسلام کا محافظ ثابت ہوگا، اس کی قسمت میں وہ سعادت لکھی ہے جو بڑے بڑے عالی نسب شرفدار اور صلحاء کے لئے قابل رشک ہے اور تاریخ میں وہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے گا جس سے روح مبارک تک کو شادمانی حاصل ہوگی۔

لین پول لکھتا ہے کہ "جائے اس کے کہ صلاح الدین سے کوئی علامت ایسی ظاہر ہوتی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ آئندہ کوئی بڑا آدمی ہونے والا ہے وہ ایک روشن مثال اس خاموش اور پرامن نیکی کی بنا رہا، جو شرافت طبیعتوں کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے دور رکھتی ہے۔"

لیکن جب اللہ تعالیٰ کو ان سے کام لینا منظور ہوا تو اس کا غیبی سامان کیا گیا، ان کو ان کے دلی نعمت نور الدین نے سخت اصرار و حکم سے مصر بھیجا، قاضی بہاء الدین ابن شداد سلطان کے معتمد تھا لکھتے ہیں کہ "سلطان نے مجھ سے خود بیان کیا کہ میں بڑی ناگواری اور مجبوری سے مصر آیا، میرا مصر آنا بالکل میری مرضی سے نہیں ہوا، میرا معاملہ بالکل وہی ہے جس کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے **وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ**"

## زندگی میں تبدیلی

مصر پہنچ کر جب صلاح الدین کے لئے میدان بالکل صاف ہو گیا، اور مصر کی زمام مملکت ان کے ہاتھ میں آگئی تو ان کی زندگی یکسر بدل گئی، یہ خیال دل میں جم گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی بڑا کام لینا ہے اور اس کام کے ساتھ عیش و راحت کا کوئی جوڑ نہیں۔

قاضی بہاء الدین ابن شداد لکھتے ہیں کہ "حکومت (مصر) کی باگ ڈور ہاتھ میں آجانے کے بعد دنیا ان کی نظر میں ہیچ ہو گئی، شکرگزاری کا جذبہ ان کے دل میں موجزن ہوا، شراب کے توبہ کی عیش و تفریح سے منہ موڑ لیا، اور ایک سنجیدہ اور جفاکش زندگی اختیار کی، اور اس میں دن بدن ترقی ہی ہوتی گئی۔"

لین پول بھی یہی لکھتا ہے۔۔

”اب جہاں تک صلاح الدین کا اپنی ذات سے تعلق تھا، اس نے اپنی زندگی کے قواعد سخت کر دیئے  
مستی اور پرہیزگاری تو وہ ہمیشہ کا تھا، مگر اب ان میں اور سختی اختیار کی، دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کا  
خیال بالکل ترک کر دیا، اور اپنے اعمال پر بھی سخت پابندیاں عائد کیں، اور اپنے ساتھیوں کے حق میں خود  
ایک مثال بنا، اس نے اپنی تمام مبلغ کوششیں اس بات میں صرف کیں کہ ایک ایسی اسلامی سلطنت  
قائم کرے جس میں کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت ہو، چنانچہ ایک موقع پر اس نے کہا  
”جب خدا نے مجھے مصر دیا تو میں سمجھا کہ فلسطین بھی مجھے اللہ کو دنیا منظور ہے“

اس وقت سے صلاح الدین کی زندگی کا مقصد آخر عمر تک اسلام کی نصرت اور حمایت رہا، اور  
اس نے عہد کر لیا کہ کفار پر جہاد کرے گا۔

## جہاد کا عشق

سلطان کو جہاد سے عشق تھا، جہاد اس کی سب سے بڑی عبادت، سب سے بڑی لذت عیش اور اس کی روح  
کی غذا تھی۔

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ۔

”جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں سما گیا تھا، اور ان کے قلب و دماغ پر چھا  
گیا تھا، یہی ان کا موضوع گفتگو تھا، اسی کا ساز و سامان تیار کرتے رہتے تھے، اور اس کے اسباب و مسائل  
پر غور کرتے، اسی مطلب کے آدمیوں کی ان کی تلاش رہتی، اسی کا ذکر کرنے والے اور اسی کی ترغیب دینے  
والے کی طرف وہ توجہ کرتے، اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انھوں نے اپنی اولاد اور اہل خاندان اور وطن

ابو سلطان صلاح الدین ص ۷۷



یہی لشکر کے چیدہ اور منتخب جوانمرد قید کر لئے گئے، گالی بادشاہ یروشلم اور اس کا بھائی چاٹیلون (حنین) کاریجی نالڈتینن کا ہمسفری طبقات داویہ اور بیطار کے دونوں مقدم اور بڑے بڑے عیسائی شرفار گرفتار کر لئے گئے..... باقی فلسطین کے تمام عیسائی بہادر اور شہسوار مسلمانوں کے پرے میں تھے، یہی لشکر کے سمولی سپاہی پیدل اور سوار جو زندہ بچے تھے، سب مسلمانوں کے اسیر ہو گئے تھے، ایک ایک مسلمان سپاہی تیس تیس عیسائیوں کو جنھیں خود اس گرفتار کیا تھا، خیمے کی رسی میں باندھ لے جاتا دکھا گیا، ٹوٹی ہوئی صلیبوں اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں میں مردوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے، جیسے پتھر پتھر پڑے ہوں، اور کٹے ہوئے سر زمین پر اس طرح بکھرے پڑے تھے، جیسے خوبڑوں کے کھیت میں خوبڑے پڑے نظر آئیں..... مدتوں تک جنگ کا یہ میدان جس میں یہ خون لڑائی ہوئی تھی، اور جہاں بیان کیا جاتا تھا کہ تیس ہزار آدمی مارے گئے تھے، مشہور رہا ایک سال کے بعد پسید پسید ہڈیوں کے توڑے اور ڈھیر دور سے لوگوں کو نظر آتے تھے، اور جانوروں کے کھانے کے بعد جو ٹکڑے لاشوں کے بچے تھے، وہ بھی میدان میں جا بجا پڑے دکھائی دیتے تھے۔

## سلطان کی دینی حمیت

اس فتح کے ساتھ یہ واقعہ بھی تاریخ میں یادگار رہے گا، جس سے سلطان کی دینی حمیت اور اس کی قوت ایمانی کا اندازہ ہوتا ہے، مناسب ہے کہ یہ واقعہ بھی ہم انگریز مورخ کی زبان سے سنیں۔

”سلطان صلاح الدین نے اپنا خیمہ لڑائی کے میدان میں نصب کرایا جب خیمہ نصب ہو گیا، تو حکم دیا کہ قیدی سامنے حاضر کئے جائیں، بادشاہ گالی اور ریکی نالڈ چاٹیلون (حنین) دونوں اندلائے گئے، سلطان نے بادشاہ یروشلم کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اور اسے پیاسا دیکھ کر برکت میں سر دکئے ہوئے پانی کا



کٹورا دیا، گالی نے پانی پیا، اور پانی کا کٹورا والی کرک ریچی نالڈ کو دیا، سلطان یہ دیکھ کر ناخوش ہوا اور ترجمان سے کہا کہ بادشاہ سے کہو کہ میں نے اس شخص کو پانی نہیں دیا ہے، بادشاہ گالی نے دیا ہے، روٹی اور نمک جسے دیتے ہیں، وہ محفوظ سمجھا جاتا ہے، مگر یہ آدمی اس قسم کی حفاظت میں بھی میرے انتقام سے نہیں بچ سکتا، صلاح الدین اتنا کہہ کر کھڑا ہوا اور ریچی نالڈ کے سامنے آیا، ریچی نالڈ جیسے خیمہ میں داخل ہوا تھا، برابر کھڑا رہا تھا، سلطان نے اس سے کہا سن! میں نے تجھے قتل کرنے کی قسم دو مرتبہ کھائی تھی، ایک مرتبہ تو اس وقت جب کہ تو نے مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا، دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ تو نے دھوکے اور دغا بازی سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا، دیکھ میں اب تیری بے ادبی اور توہین کا انتقام لیتا ہوں، اتنا کہہ کر صلاح الدین نے تلوار نکالی اور جیسا کہ عہد کیا تھا، ریچی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، جو کچھ رہتی باقی تھی، اسے پہرے والوں نے آ کر ختم کیا۔

بادشاہ گالی اس قتل کو دیکھ کر لرز گیا، اور سمجھا کہ اب اس کی باری آئے گی، صلاح الدین نے اس کا اطمینان کیا، اور کہا کہ بادشاہوں کا دستور نہیں کہ وہ بادشاہ کو قتل کریں، اس شخص نے بار بار عہد شکنیاں کی تھیں، اب جو کچھ گذر گیا گذر گیا<sup>۱۲</sup>

ابن شداد نے لکھا ہے کہ سلطان نے ریچی نالڈ کو طلب کیا، اور کہا کہ ھا انا انتصور لمحمد علیہ الصلوٰۃ والسلام، (لو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقام لیتا ہوں) ابن شداد نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے اس کو اسلام کی دعوت دی، مگر اس نے قبول نہیں کی۔<sup>۱۳</sup>

۱۲۔ قاضی ابن شداد کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ جب ان بیکس حجاج نے اس انسانیت و شرافت کی درخواست کی تو اس نے گستاخانہ کہا کہ اپنے محمد سے کہو کہ تمہیں رہائی دیں، یہ فقرہ صلاح الدین کو پہنچا، اور اس نے منت مانی کہ اگر یہ بے ادب اس کے

ہاتھ آئے گا تو اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کروں گا۔ ۱۳۔ سلطان صلاح الدین ۱۸۵ھ ۱۳۱۵ء النوار السلطانیہ ص ۶۴

## فتح بیت المقدس

حطین کی فتح کے بعد وہ مبارک موقع جلد آ گیا جس کی سلطان کو بے حد آرزو تھی، یعنی بیت المقدس کی فتح، قاضی ابن شداد نے لکھا ہے کہ۔

”سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی، اور اس کے دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ اس کے منتقل نہیں تھے۔“

اسی سال ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء رجب کو سلطان بیت المقدس میں داخل ہوئے اور پورے ۹ برس کے بعد یہ پہلا قبلہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کی تھی، اسلام کی تولیت میں آیا، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ سلطان کے داخلہ کی تاریخ بھی وہی تھی جس تاریخ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی۔ قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:-

”یہ عظیم الشان فتح تھی، اس مبارک موقع پر اہل علم کی بہت بڑی جماعت اور اہل حرفہ اور اہل طرق کی کثیر تعداد جمع تھی، اس لئے کہ لوگوں کو جب ساحلی مقامات کی فتح اور سلطان کے ارادہ کی اطلاع ملی تو مصر و شام سے علمائے بیت المقدس کا رخ کیا، اور کوئی روشناس اور معروف آدمی سمجھے نہیں ہا بہر طرف دعا و تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا، بیت المقدس میں (۹ برس کے بعد) جمعہ کی نماز ہوئی، قبة صخرہ پر جو صلیب نصب تھی، وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا، اور اسلام کی فتح مندی اور اشرقت کی مدد کھلی آنکھوں نظر آ رہی تھی۔“

نور الدین زنگی مرحوم نے بیت المقدس کے لئے بڑے اہتمام اور بڑے صرف سے منبر بنوایا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ بیت المقدس واپس دلائے گا، تو یہ منبر نصب کیا جائے گا، صلاح الدین نے حلب سے وہ منبر طلب کیا اور اس کو مسجد اقصیٰ میں نصب کیا۔

## اسلامی اخلاق کا مظاہرہ

صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی اور یاد دلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا وہ عیسائی مورخ کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

• صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت ٹائٹ ثابت نہیں کیا تھا جیسا کہ اس موقع پر کیا، جب یہ وشلیم مسلمانوں کے حوالہ کیا جا رہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز افسران ذمہ دار نے جو اس کے تحت تھے، شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی ظلم و زیادتی کو روکتے تھے، اور اس کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی وقوعہ جس میں کسی عیسائی کو گزند پہنچا ہو، پیش نہ آیا، شہر کے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا، اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پرتغین تھا، کہ ہر شہر والے کو جو زبردیہ ادا کر چکا ہے، باہر جانے دے۔

پھر سلطان کے بھائی العادل اور بطریق اور بالیان کے ہزار ہزار غلام آزاد کرنے کے تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے: "اب صلاح الدین نے اپنے امیروں کو کہہ دیا کہ میرے بھائی اپنی طرف سے اور بالیان اور بطریق نے اپنی طرف سے خیرات کی، اب میں اپنی طرف سے بھی خیرات کرتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں سادا کر دیں کہ تمام بوڑھے آدمی جن کے پاس زبردیہ ادا کرنے کو نہیں ہے، آزاد کئے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں اور یہ سب باب البعز سے نکلنے شروع ہوئے اور سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک ان کی صفیں شہر سے نکلتی رہیں، یہ خیر و خیرات تھی جو صلاح الدین نے بیچارہ مفلسوں اور غریبوں کے ساتھ کی۔

غرض اس طرح سلطان صلاح الدین نے اس منلوہ مفتوح شہر پر اپنا احسان و کرم کیا جب سلطان کے ان احسانات پر غور کرتے ہیں تو وہ وحیاً حرکتیں یاد آتی ہیں جو شروع کے صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم کی فتح پر کی تھیں جب گوڈوے اور تنکیر یروشلم کے کوچے کو بے دبانہ سے گزے تھے تو وہاں مردے پڑے اور جان بلب زخمی لوٹتے تھے، جب کہ

بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا، اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا، جہاں  
 قدس کی چھتوں اور بڑوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے، وہیں ان صلیبیوں نے انہیں اپنے تیروں سے چھید کر  
 گرایا تھا، اور جہاں ان کے اس قتل عام نے سبھی دنیا کی عزت کو بڑھ لگایا تھا، جبکہ اس مقدس شہر کو ظلم و  
 بدنامی کے رنگ میں انہوں نے رنگایا تھا، جہاں رحم و محبت کا وعظ جناب مسیح نے سنایا تھا، اور فرمایا تھا کہ  
 خیر و برکت والے ہیں، وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں، ان پر خدا کی برکتیں نازل رہتی ہیں۔

جس وقت یہ عیسائی اس پاک و مقدس شہر کو مسلمانوں کا خون کر کے اس کو مذبح بنا رہے تھے، اس وقت  
 وہ ان کلام کو بھول گئے تھے، اور ان بے رحم عیسائیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں  
 ان پر رحم و کرم ہو رہا تھا۔

صفاتِ خداوندی میں سب سے بڑھ کر صفتِ رحم ہے، رحم عدل کا تاج اور اس کا جلال ہے، جہاں  
 عدل اپنے اختیار اور استحقاق سے کسی کو جان سے مار سکتا ہے، رحم جان بچا سکتا ہے۔  
 اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یرغلم کو  
 باریاب کیا، تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ  
 تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی جوصلہ انسان اور جلالت اور شہامت میں بیکتا، اور بے مثل شخص تھا،

## صلیبی سیلاب

بیت المقدس کی فتح اور خطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں بغیظ و غضب کی آگ پھر بھڑک  
 اٹھی، اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر ابل پڑا، جس میں یورپ کے تقریباً تمام مشہور جنگ آزما، او  
 مشہور بادشاہ اور سپہ سالار تھے، قیصر فریڈرک، رچرڈ شیردل، شاہانِ انگلستان، فرانس، صقلیہ، آسٹریا

برگنڈی، فلانڈرز کے ڈیوک اور نائٹ اپنی آسن پوش فوجوں کے ساتھ امنڈ آئے، ان کے مقابلے میں تنہا کی سلطان صلاح الدین تھا، اور اس کے اعتراف اور حیدر حلیف جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے

## صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل

آخر پانچ برس کی مسلسل خونریز و خون آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۲ء میں رملہ پر دونوں حریفوں میں جو ٹھک کر چور ہو گئے تھے، صلح ہوئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے، ساحل پر عک کی مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اور سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگیں تھا، صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی، اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا، اس کے ہاتھوں مکمل ہوا، عیسائی مورخ اس کی کامیابی اور جنگ صلیبی کے نامبارک سلسلہ کے اختتام کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

جنگ مقدس خانہ کو پہنچی پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں، جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک پانچ زمین بھی نہ تھی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے، تو صور سے لے کر یافناک ساحل پر بجز زمین کی ایک چٹائی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، اس صلح نامہ پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی، صلیبیوں کو کچھ فتح کیا تھا، اس کا بڑا حصہ افرنجیوں کے پاس رہا، لیکن اگر صرف جان مال کا لحاظ کیا جائے، تو یہ نتیجہ نہایت حیرت انگیز تھا، پاپائے روما کی فریاد سنتے ہی کل عیسوی دنیا نے ہتھیار اٹھائے تھے، قیصر فریڈرک شاہان انگلستان فرانس و صقلیہ، آسٹریا، کالیپولڈ برگنڈی کا ڈیوک، فلانڈرز کا کاؤنٹ صد ہا مشہور و معروف سیرن اور تمام عیسائی قوموں کے نائٹ یروشلیم کا عیسائی بادشاہ اور فلسطین کے دیگر عیسائی و ایرانی ملک طبقہ داویہ اور طبقہ البیطار کے بڑے بڑے شہسوار اس کوشش میں مصروف ہوئے کہ بیت المقدس پر اپنا

قبضہ اور یروشلم کی مسیحی سلطنت جو ٹٹنے کے قریب ہے پھر سرسبز ہو جائے، لیکن انجام کیا ہوا؟ اسی دوران میں قیصر فریڈرک قضا کر گیا، شاہان انگلستان، فرانس اپنے اپنے ملک کو سدھائے اور ان کے بڑے بڑے شریف اور معزز ماٹھی ارض ایلیا میں خاک کا پیوند ہوئے، لیکن یروشلم اس پر بھی سلطان صلاح الدین کا رہا، صرف ساحلِ عکہ کی مختصر سی ریاست پر اس کا برائے نام عیسائی بادشاہ حکومت کرتا رہا۔ تیسری جنگ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی، مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹٹ سے من نہ کر سکی، صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی محنت اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی، مگر کسی زبان پر حوت شکایت نہ تھا، کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا، دریائے دجلہ کی دور دراز وادیوں میں ممکن ہے کہ سلطان کے تابع و ایوانِ ملک کے دل میں اس ہمیشہ کی طلبی تک پر کچھ شکایت پیدا ہوئی ہو، لیکن بہر کیف اپنی اپنی فوجیں سلطان کی خدمت میں بڑی جان نثاری اور نیک خواہی کے ساتھ لائے، آخری جنگ جو ارسوف پر ہوئی، اس میں موصل کی فوجوں نے بڑی مردانگی اور جانبازی سے کام لیا، ان تمام لڑائیوں میں سلطان کو ہمیشہ مصر اور عراق کی فوجوں سے مدد ملنے کا بھروسہ رہا۔ اور یہی تقویتِ ملک شام کی شمالی اور مرکزی فوجوں سے رہی، کہ وہ ترکمان، عرب، مصری سب مسلمان اور سلطان کے خادم تھے اور طلبی پر خادموں کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے، باوجود اس کے کہ ان کی نسل و قوم جدا تھی، اور باوجود قومی چشموں اور قبائلی غرور و تفاخر کے سلطان نے ان کو ایسا اثر و شکر بنا رکھا تھا کہ تمام لشکریں واحد نظر آتا تھا، سب ایک ہی لشکر کے رکن تھے، دو ایک مرتبہ اس میں شک نہیں کہ ان کو متفق اور متحد رکھنے میں مشکلات پیش آئیں، اور بعض نازک مواقع ایسے بھی آئے کہ ان کی طبیعتوں میں فرق پیدا ہوتا معلوم ہوا، باوجود یا فوج کے تہذیب کے یہ تمام مختلف النسل قومیں ۱۱۹۲ء کے موسمِ خریف تک سلطان کے حکم کے تابع رہیں، اور جس طرح ۱۱۸۷ء میں پہلی مرتبہ خدا کی

راہ میں کام کرنے کو انھیں طلب کیا تھا، اسی طرح اخیر تک راہ خدا میں وہ کام کرتی رہیں، اس تمام زمانہ  
 میں نہ تو سلطان کا کوئی صوبہ اس سے منحرف ہوا اور نہ کسی ماتحت سردار یا باج گزار ریاست نے اس کے  
 بغاوت کی، اگرچہ تو قعات ان کی خیر خواہی اور جفاکشی سے رکھی گئی تھیں وہ کافی طور پر ایسی تھیں کہ مضبوط سے  
 مضبوط اعتقاد اور قیادت کی طاقت کو بھی آزمائش میں لا کر ہر ادیتیں، صرف عراق میں سلطان کے ایک عزیز  
 کی سرکشی کی مثال جس کی اصلاح فوراً معافی لے کر کر دی گئی، ایسی ہے جس کا استثناء اس اثر کو اور قوت کے ساتھ  
 ثابت کرتا ہے، جو سلطان اپنی رعایا پر رکھتا تھا، جب جنگ پنج سالہ کی یہ آزمائشیں اور تکلیفیں ختم ہوئیں تب بھی  
 سلطان کردستان کے پہاڑوں سے لے کر صحرائے نوبہ تک بذاتِ واحد حکمران رہا، اور ان حدود سے بھی دور کردستان  
 کا بادشاہ ارمینہ کا کاتلین (حاکم وقت) قونیہ کا سلطان اور قسطنطنیہ کا قیصر اس بات کا شوق رکھتا ہے کہ  
 صلاح الدین کو اپنا دوست اور مدد و معاون سمجھیں، لیکن صلاح الدین ان دوستوں اور اتحادیوں میں سے  
 کسی کا زیر بار احسان نہ ہوا، اس کی مدد کو نہ آئے، یاد رکھنا دینے البتہ حاضر ہوئے، یہ کل کشمکش صرف صلاح الدین  
 نے کی تھی، بجز سلطان کے بھائی العادل کے جو آخری زمانہ میں عین طور پر سب کے سامنے آیا، ممکن نہیں کہ کوئی شخص  
 کسی ایک پہ سال لایا مشیر کو تباہی کے جس کی نسبت کہہ سکیں کہ وہ سلطان کا مشیر یا صلاح کار ہو کر اس پر حاوی  
 ہو گیا تھا، ایک مجلس حرب البتہ اس کے یہاں تھی، جو معاملات جنگ میں مشورہ دیتی تھی، اور کبھی کبھی ایسا بھی  
 ہوا تھا کہ سلطان کی صحیح رائے پر اس کی غلط رائے غالب آگئی، جیسا کہ صورت اور عکس کے سامنے ہوا تھا، لیکن اس  
 مجلس میں بھی اس کے کسی ایک رکن کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے کہ اس کی رائے نے سلطان پر کسی دوسرے کی  
 رائے سے زیادہ اثر کیا ہو، بھائی بیٹے، بھتیجے، پرانے رفیق نے ماتحت عامل، اور ہوشیار قاضی، محتاط اور  
 وفاتوار معتد وزیر، متعصب و اعظا، اور ملا بھی اس میں تعلق الکلام تھے، کہ جہاد کیا جائے اور سب میں  
 شریک بھی ہوئے اور سب نے آقا کی بڑی تندہی اور خیر خواہی سے اپنی اپنی لیاقت اور قوت کے مطابق مدد کی،  
 لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا، جو اس بات کو بھولا ہو کہ آقا کون ہے؟ اس تشویش فکر اور محنت و

جانفشانی کے نازک وقت میں صرف ایک دل اور ارادہ تھا، جو سب پر حاوی تھا، اور یہ دل اور ارادہ  
سلطان صلاح الدین کا تھا۔

## وفات

بالآخر اپنا مقدس فریضہ ادا کر کے اور عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے محفوظ کرنے  
کے بعد ۲ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا، اس وقت ان کی عمر ستاون سال  
کی تھی، قاضی بہاء الدین بن شہار سلطان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”۲ صفر کی شب کو جو سلطان کی علالت کا بار ہوا دن تھا، مرض میں شدت ہو گئی اور قوت گھٹ گئی  
شیخ ابو جعفر امام الکلاہ کو جو ایک نہایت صالح اور بزرگ شخص تھے، زحمت دی گئی کہ رات کو قلعہ میں  
رہیں کہ اگر رات کو وہ ساعت مقررہ آگئی، جو سب کو پیش آنے والی ہے تو وہ اس وقت سلطان کے پاس  
ہوں اور ان کو تلقین کر سکوں اور اثر کا نام لیں، رات کو سلطان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفر کے لئے پار کا  
ہیں، شیخ ابو جعفر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تلاوت و ذکر میں مشغول تھے، تین دن پہلے سے ان پر ایک ذہول  
اور غفلت طاری تھی، کسی کسی وقت ان کو ہوش آتا تھا، جب شیخ ابو جعفر نے تلاوت کرتے ہوئے *هُوَ اللَّهُ*  
*الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ* پڑھی تو سلطان کو ہوش آ گیا، ہونٹوں پر مسکراہٹ  
آئی، اور چہرہ کھل گیا، اور کہا صحیح ہے، اور یہ کہہ کر جان جانِ آفریں کے سپرد کی، یہ چہار خنجر کا دن صفر کی، ہرگز  
اور فجر کا وقت تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خلفائے راشدین کی وفات کے بعد سے ایسا سخت دن مسلمانوں  
کی تاریخ میں نہیں آیا، قلعہ شہر اور تمام دنیا پر ایک وحشت سی برتی تھی، اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیسا  
سناٹا اور کسی اداسی تھی، میں پہلے جب سنتا تھا کہ لوگ دوسروں پر قربان ہو جانے اور ان کا دین بچانے

۱۔ سلطان صلاح الدین ۳۱۲، ۳۱۳ ۲۔ سلطان کی ولادت ۵۳۲ھ کی ہے، (ابوالفداء ج ۳ صفحہ ۹)



کی تمنا کرتے ہیں تو سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک مجاز اور تکلف کی باتیں ہیں، لیکن اس دن معلوم ہوا کہ یہ حقیقت ہے، خود میں اور بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ سلطان پر اپنی جان قربان کر سکیں، اور اس کی طرف سے فدیہ ہو جائیں تو وہ اس کے لئے تیار تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے ترکہ میں صرف ایک نینار اور ۲۴ درہم چھوٹے تھے، کوئی ملک، مکان، جائداد، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تدفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھانس کے پونے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی قاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔

## درویش سیرت سلطان

قاضی ابن شداد سلطان کی سیرت، اخلاق و عادات اور خصوصیات میں لکھتے ہیں:-  
 "سلطان نہایت صحیح العقیدہ، راسخ الاعتقاد مسلمان تھے، عقائد میں اہل السنۃ و الجماعۃ کے ہم مسلک و ہم اعتقاد، نماز و واجب کے بڑے پابند، ایک موقع پر فرمایا کہ ساہا سال ہو گئے، میں نے ایک نماز بھی بے عتہ نہیں پڑھی، احوال مرض میں بھی امام کو بلا لیتے، اور تکلف کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، سنن رواتب پر مداومت تھی، رات کو حتی الامکان نوافل پڑھتے، اگر رات کے نوافل رہ جاتے تو رات نوافل کے مسلک کے مطابق نماز فجر سے پہلے ادا کرتے، ان کو آخری بیماری میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا، صرف تین دن جن میں ان پر بیوشی طاری رہی، نماز فوت ہوئی، زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت ہی نہیں آئی، اس لئے کہ انہوں نے کبھی انشاپس انداز ہی نہیں کیا، جس پر زکوٰۃ فرض ہو، ان کی ساری دولت صدقاً و خیرات میں خرچ ہوئی، صرف ۲۷ درہم نامری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائداد، ملکیت نہیں چھوڑی۔

۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱ سلطان شافعی المذہب تھے۔

رمضان میں روزے کے سخت پابند تھے، کچھ روزے ان کے ذمہ باقی تھے، قاضی فاضل کی یادداشت میں تحریر تھے، وفات سے پہلے پہلے بڑے اہتمام سے وہ سب روزے قضا کئے، سماج نے ہر چند منع کیا، لیکن فرمایا کہ کل کا حال مجھے معلوم نہیں، چنانچہ ان کی قضا کے بعد ہی خود قضا کر گئے۔

سچ کی بڑی آرزو تھی، لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا، وفات کے سال اس کا شوق بہت غالب تھا، لیکن نوبت نہیں آنے پائی۔

قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا، کبھی کبھی اپنے برج میں پہرہ داروں سے دو دو تین تین چار چار پائے سن لیتے، بڑے فاضح، فاضح، رقیق القلب تھے قرآن مجید سن کر اکثر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے، حدیث سننے کے بڑے شائق تھے، اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے، حدیث کی قرأت کے وقت لوگوں کو احتراماً بیٹھ جانے کا حکم دیتے، اگر کوئی عالی سلسلہ حدیث کا شیخ ہوتا، تو خود اس کی مجلس میں جا کر حدیث سننے، خود بھی حدیث کے قرأت کا شوق تھا، اگر کسی حدیث میں کوئی عبرت کی بات ہوتی تو آنکھیں پریم ہو جاتیں، عین میدان جنگ میں بعض مرتبہ دو صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث کی سماعت کی کہ یہ وقت خاص فضیلت کا ہے، ذہنی شعائر کی بڑی تعظیم کرتے، سہروردی ملحد کو انہی کے ایام سے ان کے صاحبزادہ الملک الظاہر نے قتل کر دیا، ان کو خدا پر بڑا بھروسہ اور اس کی ذات عالی کے ساتھ بڑا احسن ظن تھا، کٹھن گھڑوے اور نازک اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعا و مناجات کی عادت تھی، ایک مرتبہ بیت المقدس کو صلیبی افواج کی طرف سے جو اس کے قریب مجتمع تھیں، سخت خطرہ لاحق تھا، سلطان کو بیت المقدس کی بڑی فکر تھی، اور وہ کسی طرح بھی وہاں سے چلے جانے پر راضی نہ تھے، شب جمعہ تھی، جاڑوں کی راتیں تھیں، میں تنہا خدمت میں حاضر تھا، ہم دونوں رات بھر ذکر و دعا میں مشغول رہے، سلطان کے مزاج پر اکثر خشکی اور یوسمت غالب آجایا کرتی تھی، رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ ان کا مزاج ناساز ہو جائے گا، میں نے عرض کیا کہ کچھ دیر آرام فرمائیں، فرمایا شاید تمہیں نیند نے

ستایا ہے اس لئے مجھے مشورہ دیتے ہو؟ یہ کہہ کر وہ اٹھے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں موزن نے صبح کی اذان دیا  
 میں عموماً فجر ساتھ ہی پڑھا کرتا تھا، حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال رہے ہیں، مجھے دیکھ کر  
 فرمایا کہ میں نے جھنکی بھی نہیں لی، ہم نماز میں مشغول ہو گئے، مجھے ایک خیال آیا، اور میں نے عرض کیا کہ میرے  
 ذہن میں ایک بات آئی ہے، اور انشاء اللہ وہ مفید ہوگی، وہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس سے  
 گزارشہ کرنا کہ دعا مانگیں، اور یقین رکھیں کہ وہی یہ مشکل آسان کر سکتا ہے، فرمایا کہ اس کی کیا ترکیب ہے؟ میں نے  
 عرض کیا کہ آج جمعہ کا دن ہے، مسجد جاتے ہوئے آپ غسل فرمائیں، اور مسجد اقصیٰ میں اس مقام پر نماز پڑھیں  
 جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے، اور پہلے کسی محتر آدمی کے ذریعہ بالکل پوشیدہ طور پر  
 کچھ صدقہ کریں، پھر اذان و اقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھیں، ایک حدیث میں اس کی فضیلت  
 اور اس وقت دعا کی قبولیت کی خبر دی گئی ہے، اور سجدہ میں سر رکھ کر عرض کریں کہ خدایا مادی اسباب اور  
 دنیاوی سہارے سب ٹوٹ چکے، اب تیرے دین کی مدد اور فتح کے لئے صرف یہی سہارا رہ گیا ہے کہ تیرے  
 آستانہ پر سر رکھ دیا جائے، اور تیرے سہارے کو مضبوط کر لیا جائے، اب صرف تیرا بھروسہ ہے اور تیری  
 میرا حامی و ناصر ہے، مجھے امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائے گا، سلطان نے ایسا ہی کیا،  
 میں نے اپنے معمول کے مطابق ان کے پہلو میں نماز پڑھی، میں نے دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہیں، آنسوؤں  
 سے ان کی داڑھی تر ہو گئی ہے، اور جاننا نماز پر آنسو ٹپ ٹپ کر رہے ہیں، میں نے نہیں سنا کہ انہوں نے  
 کیا دعا کی، اسی دن سے ان کی دعا کے قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگے، صلیبی فوجوں میں انتشار و  
 اضطراب پیدا ہوا، پے در پے اطمینان بخش اطلاعیں آتی رہیں، یہاں تک کہ دو شنبہ کی صبح تک  
 میدان بالکل صاف ہو گیا، اور حملہ آور فوجیں بیت المقدس کا خیال چھوڑ کر رطہ کی جانب  
 چلی گئیں!

## محاسن اخلاق

عبادات و فضائل اعمال کے علاوہ حاکمانہ فضائل، عدل، عفو و حلم، جود و سخاوت، مروت و شرافت، صبر و استقامت، شجاعت و قنوت اور شہامت و علو ہمت کے اوصافِ عالیہ سے آراستہ تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ ہفتہ میں دو بار، دو شنبہ و پنجشنبہ کو اذنِ عام ہوتا تھا، فقہاء قضاة و علماء اور اہلِ مقدمہ حاضر ہوتے، بڑے چھوٹے امیر غریب، پوڑھے اور عام بڑھیوں تک کو آنے کی اجازت تھی، سفر و حضر میں کبھی اس معمول میں فرق نہ آتا، رات دن میں ایک بار خود معاملات کو دیکھتے، اور رقعات و فرامین پر خود دستخط کرتے، کبھی کسی صاحبِ غرض اور حاجت مند کو ناکام واپس نہ کرتے، اس کے ساتھ ساتھ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے۔

اگر کوئی فریاد یا شکایت کرتا تو خود کھڑے ہو کر اس کا مقدمہ سنتے اس کی داد دے دیتے اور اس کے معاملہ سے پوری دلچسپی لیتے، ایک مرتبہ ایک معمولی شخص نے ان کے بھتیجے تقی الدین کے خلاف (جو سلطان کو بہت عزیز تھے) دعویٰ کیا، سلطان نے فوراً ان کو طلب کیا، اور مقدمہ کی سماعت کی، خود ان کے خلاف ایک شخص نے دعویٰ کیا، سلطان نے معاملہ کی پوری تحقیق کی، اگرچہ مدعی کا حق ثابت نہیں ہوا، لیکن سلطان نے اس کو ناکام واپس نہیں کیا، اور خلعت و مال سے سرفراز کیا۔

بڑے بردبار اور متحمل مزاج تھے، مورخ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اپنے رفقاء و خدام کی غلطیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی کرتے، بعض مرتبہ کوئی ایسی بات سنتے جس سے ان کو تکلیف یا ناگواری ہوتی، لیکن وہ اس کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے اور نہ اپنے طرز عمل سے کوئی فرق آنے دیتے، ایک مرتبہ پانی مانگا، پانی نہیں آیا، پھر مانگا، پھر نہیں ملا، یہاں تک کہ ایک ہی مجلس میں پانچ مرتبہ

نوبت آئی، آخر میں کہا کہ دوستو! میں تو پیاس سے مر جا رہا ہوں، اتنے میں پانی آیا، سلطان نے پیاس

اور اس تاخیر پر کچھ نہ کہا، ایک مرتبہ سخت بیماری سے اٹھے اور غسلِ صحت کے لئے حمام میں گئے پانی بہت گرم تھا، ٹھنڈا پانی مانگا، خادم نے پانی حاضر کیا، پانی کچھ چھلک کر ان پر گرا، ضعف کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوئی، پھر ٹھنڈا پانی مانگا، اس مرتبہ ٹھنڈے پانی کا پورا طشت گر گیا، اور سارا پانی ان پر آ گیا اور وہ مرتے مرتے بچے، لیکن صرف اتنا کہا کہ مجھے مارنے کا ارادہ ہو تو کہ دو، خادم نے معذرت کی اور وہ خاموش ہو گئے، اور کوئی باز پرس نہیں کی، قاضی ابن شداد نے سردار ابن فوج کی غلطیوں اور اہل دربار کی بے عنوانیوں سے درگزر اور سلطان کے عفو و حلم کے متعدد موثر واقعات لکھے ہیں:۔

”جو دستخاوت کا یہ حال تھا کہ بقول ابن شداد بعض اوقات فتح کئے ہوئے صوبے دوسروں کو بخش دیئے آمد فتح کیا، ایک سردار ابن قرہ ارسلان نے ان سے خواہش کی اور انھوں نے بخش دیا، بعض مرتبہ سامان بیچ کر و فود کو عطا یا و انعامات سے نوازتے، محافظین خزانہ بعض اوقات کسی نازک وقت کے لئے کچھ چھپا کر رکھ لینے کہ سلطان کو اگر خبر ہوگی، تو وہ رہنے نہیں دیں گے، ایک مرتبہ انھوں نے دوسروں پر رکھ کر یہ بات کہی کہ بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جو دوسرے اور مٹی کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے اپنا ہی حال بیان کیا ہے:۔“

”مردت و شرافت کا یہ حال تھا کہ آنے والے اور ملاقات کرنے والے کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے، خواہ کافر ہو، صیدا کا والی ملاقات کے لئے آیا، سلطان نے اس کی بڑی خاطر کی، اپنے ساتھ بکھانا کھلایا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت بھی دی، اور اس کے فضائل و محاسن بیان کر کے اس کو اسلام کا ترغیب دی، اس مردت و شرافت کا نتیجہ تھا کہ اپنے سب سے بڑے حریف رچرڈ کو اس کی بیماری میں مبتلا اور پھل بھینچتے رہے:۔“

۱۰ تاریخ ابن خلکان ترجمہ سلطان صلاح الدین ۱۰۰۰ ایضاً ۱۰۰۰ النوادیر السلطانیہ ۱۰۰۰ ایضاً ۱۰۰۰ ایضاً ۱۰۰۰

۱۰ الفتح القسی فی الفتح القسی عماد الدین الکاتب۔

سلطان بڑے شریف النفس، رقیق القلب اور دردمندان تھے، ظلم کو برداشت نہ کر سکتے تھے کسی آفت رسیدہ کمزور مخلوق کی تکلیف کی تاب نہ لاسکتے، ابن شداد لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عیال بڑھیا ان کے پاس آئی، وہ سینہ پیٹی تھی اور برابر روئے جا رہی تھی، سلطان نے سبب پوچھا، کہا کہ میری چھوٹی سی بچی کو ڈاکو میرے خمیر سے اٹھالے گئے، مجھے روتے پوری رات ہو گئی، سلطان کے ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ سلطان شفیق و مہربان ہیں، ہم تمہیں ان کے پاس پہنچا دیتے ہیں، تم ان سے فریاد کرنا، انہوں نے مجھے آپ کی خدمت میں پہنچا دیا، اب میں اپنی بچی آپ ہی سے لوں گی، سلطان کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا، ان کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں، اسی وقت ایک شخص کو لشکر کے بازار میں بھیجا کہ تحقیق کرے کہ کس نے اس کی بچی کو خریدا ہے، جس نے خریدا ہوا اس کو قیمت دے کر اور بچی کو لے کر آئے، تھوڑی دیر میں وہ سوار بچی کو کاندھے پر لئے ہوئے نظر آیا، بڑھیا زمین پر گر گئی اور اپنی پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک اپنی (مغربی) زبان میں کچھ کہتی رہی پھر خوش خوش اپنی بچی کو لے کر چلی گئی۔

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ جب سلطان کسی تمیم کو دیکھتے تو محبت و شفقت کی باتیں کرتے، اور اس کی دجوئی فرماتے، اس کو کچھ عنایت فرماتے، اگر کوئی پرورش کرنے والا نہ ہوتا تو اپنی طرف سے اس کا کچھ انتظام فرماتے، اسی طرح جب کسی عمر شخص یا بوڑھے کو دیکھتے تو بڑے متاثر ہوتے، اس کے ساتھ کچھ سلوک کرتے۔

## مردانہ اوصاف

صبر و استقامت اس درجہ کی تھی کہ قاضی ابن شداد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مکر سے گھٹنوں تک اس قدر دل نے اور پھوڑے تھے کہ بیٹھنے سے معذور تھے، یہاں تک کہ دسترخوان بچھا اور کھانا تناول نہ کر سکے، اس لئے کہ بیٹھنے کی قدرت ہی نہ تھی، اس کے باوجود دشمن کے مقابل صفت آرا تھے، میں نے دیکھا ہے کہ صبح سے

مغرب تک گھوڑے پر سوار ایک طرف سے دوسری طرف برابر چکر لگاتے اور افواج اور انتظامات کا معائنہ فرماتے اور پھوڑوں کی تکلیف کو تحمل سے برداشت کرتے، میں تعجب کا اظہار کرتا تو فرماتے کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔

ایک معرکہ میں حالت بیماری میں برابر دشمن کا تعاقب کیا، ایک رات میں اور طبیب سلطان کے پاس تھے، ہم تیمارداری بھی کرتے تھے اور ان کی طبیعت بھی پہلاتے تھے، سلطان کبھی سوتے، کبھی جاگتے، یہاں تک صبح ہو گئی، سلطان سوار ہو کر تیار ہو گئے، اپنے لڑکوں کو لشکر کے راستے میں سب آگے کیا، اور سب کو خدا کے نذر کر دیا، ایک ایک کر کے سلطان نے سب کو روانہ کر دیا، صرون میں اور طبیب رہ گئے، شام تک سلطان اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور جنگ کی نگرانی کی، یہاں تک کہ رات کو لشکر کو مستح اور ہوشیار رات گزارنے کی اجازت ملی، اور ہم اور سلطان اپنے خیمہ میں واپس آئے۔

شجاعت میں سلطان ضرب المثل تھے، قاضی ابن شداد راوی ہیں کہ سلطان دن میں ایک ایک دو بار دشمن کے گرد گشت کرتے، گھسان کی لڑائی میں سلطان تین تہا گھوڑے پر صفوں کے درمیان چکر لگاتے، ایک کو تل گھوڑا سائیس کے ساتھ ہوتا، اور وہ خیمہ سے میسرہ تک فوجوں میں گھستے، صفیں چیرنے نکل جاتے فوجی دستوں کو بلاتے، ان کو مناسب مقامات پر پھرنے یا پڑھنے کا حکم دیتے، ان کے اطمینان اور بے خوفی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ سلطان نے مختلف مواقع پر حدیث سنی ہے، لیکن کبھی عین معرکہ اور دو صفوں کے درمیان حدیث سننے کی نوبت نہیں آئی، اگر یہ شرف بھی حاصل ہو جائے تو بہت اچھا ہے، چنانچہ سلطان نے صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث شریف کی سماعت کی، انھوں نے کبھی دشمن کی تعداد کی پرواہ نہیں کی، اور نہ کبھی اس کا اثر قبول کیا، بعض بعض مرتبہ پانچ پانچ چھ لاکھ کی تعداد ان کے مقابلہ میں تھی، اللہ نے ان کو فتح دی، اور کثیر خلقت قتل اور گرفتار ہوئی، ایک مرتبہ دشمن کے کچھ اور پر

جہاز عکہ میں آئے، میں عصر سے مغرب تک گفتار ہا، لیکن سلطان کے چہرہ پر شکن نہ تھی، عکہ کے سب سے بڑے معرکہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، قلب لشکر تک نے اپنی جگہ چھوڑ دی، نشان و پرچم اور طلشے زمین پر گر گئے، لیکن سلطان چند ساتھیوں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمے رہے، یہاں تک کہ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر کھڑے ہو گئے، مسلمانوں کو لگاکاراً اور شرم دلائی، اور وہ میدان میں واپس آئے، اور دوبارہ حملہ کیا جس میں دشمن کے سات ہزار آدمی قتل ہوئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی، سلطان کی بلند سمتی اور عالی جوصلگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ سلطان نے ایک روز فرمایا کہ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں، میرا ارادہ ہے کہ ساحل کو صلیبیوں سے پاک کرنے کے بعد ملک کو تقسیم کر دوں، وصیت کر کے اور ہدایات دے کر خود یہاں سے رخصت ہو کر چلا جاؤں اور سمندر میں سفر کر کے یورپ کے جزائر تک پہنچوں، اور ان مغربیوں (یورپین قوموں) کا وہاں تک تعاقب کروں کہ روئے زمین پر کوئی کافر رہ جائے، یا میں اس ارادہ میں کام آجاؤں؟

## علم و فضیلت

سلطان عالم فاضل شخص تھے، عرب کے انساب و قبائل یہاں تک کہ ان کے مشہور گھوڑوں کے سلسلہ انساب پر ان کو عبور تھا، عربوں کے واقعات و حالات ان کو مستحضر تھے، دنیا کے عجائبات و نوادیر کا ان کو علم تھا، ہر طرح کے معلومات رکھتے تھے، ان کے منشیوں کو ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی تھیں، بعض مورخین کا بیان ہے کہ ان کو ہمارے حفظ تھا، لیکن پول ان کی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”اس کا اصلی رجحان طبیعت دینیات کی طرف تھا، علمائے وقت سے احادیث سنتے، ان کے ہر ابن اور

راویوں کے سلسلہ کی تحقیق، مسائل فقہ پر بحث، آیات قرآنیہ کی تفسیر میں اسے بڑا انہماک رہتا تھا، اور سب سے بڑھ کر

اس بات کا ذوق تھا کہ مذہب اہل سنت و اجماعت کی تائید اور ثبوت قوی دلائل سے دیا جائے؟

۱۰ النوار السلطانی ص ۱۵۱ ۱۱ ایضاً ص ۱۵۲ ۱۲ ایضاً ص ۱۵۳ ۱۳ ایضاً ص ۱۵۴ ۱۴ ایضاً ص ۱۵۵ ۱۵ ایضاً ص ۱۵۶ ۱۶ ایضاً ص ۱۵۷ ۱۷ ایضاً ص ۱۵۸ ۱۸ ایضاً ص ۱۵۹ ۱۹ ایضاً ص ۱۶۰ ۲۰ ایضاً ص ۱۶۱



## فاطمی حکومت کا زوال و اصلاح الدین کا دوسرا کارنامہ

سلطان صلاح الدین کا مصر میں اقتدار عبیدی سلطنت (جو عام طور پر فاطمی مشہور ہے) کا خاتمہ تھا جو ۵۹۹ھ سے ۶۱۷ھ تک پورے دو سو اڑسٹھ سال بڑی شان و شوکت سے قائم رہی اور اس نے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ کے عقائد اعمال و اخلاق اور تمدن پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا یہ دور حکومت اعتقادی عجائبات عجیب و غریب حکم اور مضحکہ خیز قوانین سے پُر تھا جس کے بعض نمونے مشہور مورخ مقریزی کی کتاب تخطط و الآثار سے پیش کئے جاتے ہیں:-

۳۶۰ھ میں قانون میراث میں ترمیم کی گئی اور قانون بنا گیا کہ اگر متوفی نے بیٹی چھوڑی ہو تو بیٹے بھتیجے چچا وغیرہ کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، اس قانون کی خلاف ورزی کو حضرت فاطمہؑ کے ساتھ عداوت کا مراد سمجھا جاتا ہے ہلال کا دیکھنا پوری مملکت مصر میں موقوف ہو گیا روزہ اور عید حساب سے ہونے لگے۔

۳۷۲ھ میں پورے ملک مصر میں تراویح کی سرکاری مانعت کر دی گئی، موطا امام مالک کے ایک نسخہ کے پائے جانے پر ایک شخص کی تشہیر کی گئی۔

۳۹۳ھ میں ۱۳ آدمیوں کو اس جرم میں زرد و کوب کیا گیا، اور ان کی تشہیر کی گئی کہ انھوں نے صلوة الفصحیٰ (نماز چاشت) پڑھی تھی، ۳۹۵ھ میں بلوخیہ (ایک زرکاری) کو جو اہل مصر کو بہت مرغوب ہے، اس لئے ممنوع قرار دیا گیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت پسند تھی، جو حیر کی اس لئے مانعت ہوئی کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو مرغوب تھی، اسی سستہ میں تمام مساجد دیواروں، مقابر اور صحرا میں سلف کو ست و شتم اور لعنت لکھی گئی، اور اس کو نقش کیا گیا، ۳۱۱ھ میں الظاہر کا عزا زین اللہ نے شراب کی عام اجازت

لے، محققین ان سب کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ بنی عبید کو خاندان نبوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، ان کا مورث اعلیٰ عبید بن جوسی یا یہودی تھا، قاضی ابوبکر محمد بن الطیب نے اپنی کتاب کشف عن اسرار الباطنیہ اور قاضی عبد الجبار نے کتاب تثبیت النبوة اور

مقدسی نے اپنی کتاب کشف ما کان علیہ بنو عبید" میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

دی عیش و عشرت اور لہو و لعب کی گرم بازاری ہوئی، اسی زمانہ میں ملک میں سخت گرانی اور بیماریوں کا زور تھا، لوگ محل نشاہی کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور ابوعبوع (بھوک بھوک) کے نعرے لگاتے تھے، لوٹ مار کی کثرت ہوئی۔ ۳۴۳ھ میں علی عہد کی جس کی عمر ۳۷ سال کی تھی، سواری نکلی تمام بازار آراستہ تھے، لوگ زمین بوس ہوتے تھے۔ ان خلفاء میں متعدد اشخاص ایسے تھے، جو نہایت کم سنی میں خلیفہ بنائے گئے، اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت فرض قرار دی گئی، مستنصر بالشرب خلیفہ ہوا تو سات برس کی عمر تھی، امر باحکام اللہ کی عمر خلافت کے وقت پانچ سال ایک ہفتہ کچھ دن تھی، الفار بنصر اللہ خلافت کے وقت صرف پانچ سال کا تھا، عاصد لدین اللہ کی عمر جب وہ خلیفہ ہوا گیارہ سال تھی۔

سلطان صلاح الدین کی حکومت سے اس دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہوا مصر سے شیعیت و رض کے آثار مٹنے لگے، سنت کا فروغ ہوا، جا بجا مدارس قائم ہوئے جن میں علمائے سنت علوم دینیہ کی تعلیم دیتے، رفتہ رفتہ عبیدی حکومت کے اثرات بالکل زائل ہو گئے، اس کے ساتھ اسماعیلیت جو تقریباً تین صدیوں تک مصر کا سرکاری مذہب رہا تھا، مصر میں غریب الوطن ہو گیا، مورخ مصر قرظی لکھتا ہے:-

واختفی مذہب الشیعة والاماعلیة شیعہ، اسماعیلیہ اور امامیہ کا مذہب پوش ہو گیا،  
والامامیة حتی فقد من ارض مصر کلھا۔ یہاں تک کہ پورے ملک مصر میں اس کا کہیں وجود نہیں تھا

عبیدی حکومت کا یہ صد سالہ عہد اسلام کے لئے ایک دور ابتلا تھا، جس میں مسلسل شریعت و سنت اور عقائد و اخلاق کے ساتھ تمسخر و تلاعب جاری رہا، اہل سنت اور اہل علم مقہور و مغلوب رہے، سفاک طبیعت، اوباش مزاج، اور بدین غالب حاوی رہے، علامہ مقدسی اپنی کتاب کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین میں اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وبقی هذا البلاء علی الاسلام من اول عبیدیوں کی حکومت آغاز سے اختتام تک یہ بلا

۱۰ کتاب الخطط والآثار للقرظی ص ۲۵۵، ۲۴۴

دولتم الى اخرها وذلك من ذى الحجية  
 سنة تسع وتسعين ومائتين الى سنة سبع  
 وستين وخمسة وفي ايامهم كثرت الوا  
 واغتمكم امرهم ووضعوا الملكوس على الناس  
 واقتدى بهم غيرهم واخذت عقائد  
 طوائف من اهل الجبال الساكنين بتغور الشام  
 كالصيرية والدروزية والحشيشة نوع منهم  
 وتمكن دعواتهم منهم لضعف عقولهم  
 وجهلهم ما يتمكنوا من غيرهم واخذت  
 الفرج اكثر البلاد بالشام والجزيرة الى  
 ان من الله على المسلمين بظهور البيت  
 الاتاكي وتقدمه مثل صلاح الدين  
 فاستردوا البلاد اذوا الواهد بالدولة  
 عن ارقاب العباد

اسلام پر سلطان ہی اس کی ابتدائی اچھ ۵۲۹ سے  
 ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ ۵۶۶ء پر ہوا ہے ان دور  
 حکومت میں وافض کی کثرت اور ان کا غلبہ ہوا لوگوں  
 پر حاصل اور مکین مقرر کیے گئے اور دوسروں کی ان کی  
 اقتدا کی شامی حد پر بسنے والے کو سنائوں نصیریوں  
 دروزیوں کے عقائد انہی کے اثر سے خراب ہوئے حشیشی  
 (بھنگ استعمال کرنے والے) انہی کی ایک قسم ہیں، ان  
 اسماعیلیوں کے مبلغین کا جو اثر و نفوذ ان کو ستانیوں کے  
 اندر ان کی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے ہوا وہ  
 دوسروں میں نہیں ہو سکا، انہی کے دور حکومت میں  
 فرنگیوں نے شام اور جزیرہ کے اکثر اسلامی شہروں پر  
 قبضہ کر لیا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ  
 خاندان اتاکی برسراقتدار ہوا، اور صلاح الدین  
 جیسے مجاہد سامنے آئے جنھوں نے اسلامی ملک زمر نو بازی  
 کیا، اور اس حکومت سے بندگان خدا کو نجات دیا۔

اس انقلاب سلطنت پر جو ایک بڑے دینی و اخلاقی انقلاب کا پیش خیمہ تھا، صحیح العقیدہ مسلمان  
 اور مجتہدین سنت کی مسرت بالکل قدرتی بات تھی، علامہ مقدسی نے جن کی ولادت سے صرف ۲۹ سال پہلے  
 انقلاب ہوا تھا، اور ان تغیرات و اثرات کا انھوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، جو اس کے نتیجہ میں پیش آئے تھے

۱۰ کتاب التوضیح فی اخبار الدولین ۱۰۱

اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:-

انقرضت تلك الدولة وزالت عن  
الاسلام بمصر بانقراضها الذلة  
یہ حکومت ختم ہوئی، اور اس کے ساتھ ساتھ مصر میں  
اسلام کی ذلت کا دور بھی اختتام کو پہنچا۔

حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب "الصواعق المرسله" میں باطنیوں کے عروج اور اس کے اثرات پھر  
نور الدین اور صلاح الدین کے ہاتھوں اس سلطنت کے زوال کا تذکرہ ان پرجوش الفاظ میں کیا ہے:-

"ان باطنیوں کی دعوت مشرق میں تو مضمحل ہو گئی اور مغرب میں رفتہ رفتہ اس کا ظہور شروع ہوا، یہاں تک کہ  
وہ بڑی طاقتور دعوت بن گئی اور اس کے نیچے جم گئے اور اس کے علمبردار مغرب اقصیٰ کے اکثر شہروں پر قابض ہو گئے  
پھر انھوں نے آگے قدم بڑھایا، اور مصر تک پہنچ گئے، انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا، اور قاہرہ کی بنیاد رکھی، انھوں نے  
اور ان کے حکام و قضاة نے کھلے طریقہ پر اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، انہی کے زمانہ میں رسائل انخوان الصفا  
تصنیف ہوئے اور ابن سینا نے "اشارات" اور "شفاء" اور دوسری تصنیفات لکیں، خود ابن سینا کا بیان ہے کہ  
میرے والد حاکم بالشر (فاطمی خلیفہ اور داعی) کے مبلغین میں سے تھے، ان فاطمیوں کے دور میں سنت و آثار کا چلن ہو تو  
ہوا، اور کتب سنت بالابے طاق رکھ دی گئیں کہیں کوئی چھپ چھپا کر ان کو دیکھتا ہوگا، اور عمل کرتا ہوگا، اس دعوت  
کا تمیز، امتیاز اور بنیادی اصول یہ تھا کہ عقل کو انبیاء علیہم السلام کی وحی و تعلیمات پر ترجیح حاصل ہے۔

رفتہ رفتہ سائے ملک مغرب، مصر و شام و حجاز پر ان باطنیوں کا تسلط ہو گیا، عراق پر بھی سال بھر ان کا  
قبضہ رہا، اہل سنت ان کے دور حکومت اور ان کی ملکیت میں ذمیوں (مسلمان حکومت کی غیر مسلم رعیت)  
کی طرح رہتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ذمیوں کو وہ امن و امان اور عزت و اعتبار حاصل تھا جو اہل سنت کو  
نصیب نہ تھا، کتنے علماء اس دور میں قابل گردن زدنی قرار پائے، کتنے وارثین انبیاء ان کے قیدی خانوں میں  
پڑے پڑے دنیا سے چلے گئے۔

آخر غیرت الہی کو جوش آیا، اور نور الدین اور صلاح الدین کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان باطنیوں کے  
 پنجہ غضب سے چھڑایا، ان ملکوں میں اسلام کا دم واپس معلوم ہوتا تھا، لیکن اس انقلاب سلطنت اسلام  
 کو نئی زندگی عطا ہوئی، اور اس کا آفتاب اقبال گہن سے نکلا، اور زمین کے مسلمانوں کو اس سے سترتا  
 ہوئی، جب کہ ہر طرف یہ پوچھا جا رہا تھا کہ اس دور ابتلا میں اسلام کا کوئی حامی و مددگار ہے؟ اللہ تعالیٰ نے  
 اپنے بندے اور شکر مجاہدین کے ذریعہ بیت المقدس کو پرستار ان صلیب سے آزاد کرایا، اور اللہ اور اس کے  
 رسول کے انصار نے اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق دین حق کی نصرت کا حق ادا کیا۔<sup>۱</sup>

اس عصر کی تاریخی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عالم اسلام نے بالعموم اور شام و عراق نے بالخصوص  
 اس اطلاع کا گرم ہوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا، اور عام و خاص مسلمانوں نے اس پر بڑی مسرت کا  
 اظہار کیا۔<sup>۲</sup>

اس طرح صلاح الدین نے ایک طرف مجاہدین صلیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر  
 عالم اسلام کو سیاسی غلامی اور اخلاقی و تہذیبی بد نظمی اور مغربی تزک تازوں کی ہوس کا شکار بننے سے  
 صدیوں تک کے لئے محفوظ کر دیا، دوسری طرف عبیدی (مشہور بفاطمی) حکومت کا خاتمہ کر کے اس نے  
 ایک چشمہ فساد کو بند کر دیا، جو مصر سے نکل کر عالم اسلام میں باطنیت و اسماعیلیت کے اثرات کو پھیلا  
 رہا تھا، اور دو تین صدیوں سے امت میں ذہنی انتشار اور اعتقادی و اخلاقی فساد کا ذمہ دار تھا،  
 تاریخ اسلام صلاح الدین کے ان دونوں کارناموں کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی، اور کسی ملک کا  
 مسلمان اس کردی مجاہد کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

جزاء اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء

# شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام

سلطان صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں، ان کی علمی و دینی سرپرستی، جابجا دینی مدارس کے قیام، نیز شیعہ اثرات کے اضمحلال اور سنی العقیدہ سلاطین کے اثر سے علمی و عملی زندگی میں تازگی پیدا ہوئی، اور علوم شرعیہ کے تعلیم و تعلم اور ان میں کمال پیدا کرنے کی طرف عالم اسلام میں از سر نو توجہ ہوئی، اس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں متعدد باوقار دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوت و اصلاح کا فریضہ انجام دیا، اور حکومت اور زمانہ کے غلط رجحانات کا مقابلہ کیا، ان میں سب سے زیادہ باعظمت شخصیت شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام (م ۶۶۰ھ) کی ہے، جو اپنے علم و تقویٰ اور حق گوئی و بیباکی میں نادرہ روزگار اور قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔

## علمی عظمت

عزالدین بن عبدالسلام دمشق میں ۵۴۰ھ میں پیدا ہوئے، اساتذہ دمشق اور مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی، جن میں فخر الدین بن عساکر، سیف الدین آمدی، حافظ ابو محمد القاسم بن عساکر جیسے اجلہ علماء و اساتذہ وقت تھے، بعض روایتوں کے مطابق انہوں نے جوانی میں پڑھنا شروع کیا، لیکن جلد تمام علوم میں تبحر حاصل کر لیا، اور ان کے معاصرین ان کی علمی جلالتِ شان اور عظمت کا اعتراف کیا، علامہ ابن دین العبد نے

اپنی بعض تصانیف میں ان کو سلطان العلماء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ جب ۶۳۹ھ میں مصر تشریف لے گئے تو حافظ عبدالعظیم المنذری صاحب کتاب "الترغیب والترہیب" نے فتویٰ دینے سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ جس شہر میں عزالدین بن عبدالسلام ہوں وہاں دوسرے کے لئے فتویٰ دینا درست نہیں، شیخ جمال الدین بن الحاجب کا قول ہے کہ فقہ میں شیخ عزالدین کا پایہ امام عزالی سے بلند ہے۔ ذہبی اپنی کتاب "العبر" میں لکھتے ہیں:۔

انتهت الیہ معرفة المذہب مع الزہد  
والورع وبلغ رتبة الاجتهاد<sup>۲</sup>  
فقہ کے علم اور زہد و ورع میں ان کو کمال حاصل  
تھا، اور درجہ اجتهاد کو پہنچے ہوئے تھے۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے عرصہ تک دمشق میں زاویہ عزالیہ میں درس دیا، جامع اموی میں خطابت و امامت کے منصب پر عرصہ تک فائز رہے، شیخ شہاب الدین ابوشامہ کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے بدعات کا ازالہ ہوا، جو ان کے زمانہ میں رواج پذیر ہو گئی تھیں، صلاة الرغائب اور نصف شعبان کی کھل کر مخالفت کی، اور ان کو بدعت ثابت کیا، بعض اکابر علماء ان کے بارہ میں ساکت اور متردد تھے، الملک الکامل نے دمشق کے عہدہ قضا کے لئے بڑا اصرار کیا، شیخ نے بڑی شرطوں کے ساتھ اس کو منظور کیا، اسی عرصہ میں ایک بار وہ الملک الکامل کی طرف سے دربار خلافت (بغداد) میں سفر میں کر گئے۔

۱۰ طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۱ حسن الممازۃ للسیوطی ص ۱۳۱ ص ۳۳ صلاة الرغائب ایک نماز تھی، جو تائیس رجب کو بارہ رکعتوں اور خاص ترکیب کے ساتھ شب کو پڑھی جاتی تھی، اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی جاتی تھی، یہ نماز ۳۳۲ھ میں ایجاد ہوئی، اور عام بدعات کی طرح تیزی سے پھیل گئی، شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اس کے ظہور کا پوری تاریخ لکھی ہے، ملاحظہ ہو اتحاف السعادی شرح احوال ص ۱۳۳، نصف شعبان پندرہویں شب کو سور کعتیں خاص ترکیب کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں بدعت ہیں، ابن سبکی نے اس کو بدعت مذمومہ لکھا ہے، امام نووی نے اس کے لئے موضوع، منکر اور

قیح کے الفاظ استعمال کیے ہیں (اتحاف السعادی ج ۳ ص ۲۴۰-۲۲۵)

## سلاطین کو صلاح نیک و اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی

شیخ عزالدین کی شخصیت شام میں سب سے بڑی دینی شخصیت تھی جس کا سلاطین وقت تک احترام کرتے تھے، وہ بڑے باوقار، باعرب اور خوددار تھے، انھوں نے کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا یا دربارداری کرنا گوارا نہیں کیا جب کبھی بادشاہ وقت نے خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گئے، اور اس کو صحیح مشورہ دیا، اور اس کی اور اسلام، مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

سلطان الملک الاشرف نے مرض الموت میں اپنے سب سے بڑے عہدہ دار کو شیخ کی خدمت میں بھیجا، اور کہلایا کہ آپ کا محب موسیٰ بن الملک العادل ابو بکر سلام عرض کرتا ہے، اور عیادت اور دعا کی درخواست کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ آپ اس کو کوئی ایسی نصیحت فرمائیں جو کل خدا کے سامنے اس کے کچھ کام آئے، شیخ نے سن کر کہا کہ یہ عیادت افضل عبادت ہے، اس لئے کہ انشاء اللہ اس کا نفع متعدی ہے، چنانچہ تشریف لے گئے، سلطان ان کی تشریف آوری سے بچد مسرور ہوا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اس سے پہلے سلطان کو کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی، اور سلطان عرصہ تک ان سے ناراض رہا تھا، سلطان نے اس کی معافی چاہی اور کہا کہ آپ

۱۷ھ چھٹی ساتویں صدی میں اشعریت و حنبلیت کے اختلاف نے باوجود بنیادی اتحاد کے تقریباً وہ شکل اختیار کر لی تھی، جو چوتھی صدی میں اعتزال و سنیت کے اختلاف کی تھی، اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے، اور حنابلہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے، ہر گروہ خوش غیثی کے ساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت و شریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا، لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دے دیا گیا، اور رانی کا پہاڑ بن گیا، تحزب و تعصب نے اس کو بھی کفر و ایمان کا معیار قرار دے دیا، شیخ عزالدین کے زمانہ میں یہ مباحث بڑی شدت اختیار کر چکے تھے، وہ عقیدہ و علم اشعری تھے، الملک الاشرف خلیل کا معتقد اور حنبلیت کی طرف مائل تھا، ابتدا میں اس کو شیخ سے بدگمانی اور شکایت پیدا ہوئی، لیکن شیخ کی ملاقات اور تفصیلی

مسلوآت کے بعد اس کی بدگمانی دور ہو گئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۸۵، ۹۵)



مجھے معاف فرمائیں، میرے لئے دعا بھی فرمائیں اور مجھے کچھ نصیحت بھی فرمائیں، شیخ نے فرمایا کہ جہاں تک معاف کرنے اور باز پرس کرنے کا تعلق ہے، میں روزانہ سونے سے پہلے اللہ کے بندوں کو اپنی طرف سے معاف کر دیتا ہوں، اور اس وقت سوتا ہوں، جب کہ کسی کے ذمہ میرا کوئی حق یا مطالبہ یا شکایت باقی نہیں رہتی، اور میرا اجر مخلوق کے بجائے اللہ کے ذمہ ہوتا ہے۔ "فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ"

باقی رہی دعا تو میں سلطان کے لئے اکثر دعا کیا کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی صلاح میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر و فلاح ہے، اللہ تعالیٰ سلطان کو ان امور کی بصیرت عطا فرمائے، جن سے وہ خدا کے سامنے سرخرو ہو، یہی نصیحت تو اب وہ سلطان کی آمادگی اور تقاضے کی وجہ سے فرض واجب ہو گئی ہے، مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کی فتوح اور دشمنوں پر غلبہ کی دھوم ہے، اس وقت حالت یہ ہو رہی ہے کہ تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے جا رہے ہیں، ان کو اس بات سے شہ ملی ہے کہ آپ کو اس وقت اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے حریفوں سے جنگ کرنے کی فرصت نہیں، اس وقت آپ کا رخ الملک الکامل سے جنگ کرنے کی طرف ہے، اور آپ ان کے مقابلہ کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں، الملک الکامل آپ کے بڑے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ آپ اپنا رخ اپنے بھائی کی طرف سے ہٹا کر دشمنان اسلام کی طرف پھیر لیں، اور اس اخیر وقت میں اپنا رشتہ نہ توڑیں، آپ اللہ کے دین کی مدد اور اس کی سر بلندی کی نیت کریں، اگر اللہ تعالیٰ سلطان کو صحت عطا فرماتا ہے، تو ہم اللہ سے کفار پر آپ کے غلبہ کی امید رکھتے ہیں، اور آپ کے نامہ اعمال میں یہ سعادت لکھی جاتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کا کچھ او فیصلہ ہے تو سلطان اپنی نیت کی برکت کے ساتھ دنیا سے جلتے ہیں۔

سلطان نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو اس بروقت تشبیہ اور مخلصانہ مشورہ پر جزائے خیر عطا فرمائے، اسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رخ بجائے مصر کے (جو الملک الکامل کی جانب تھا) تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے، اور فوج اس مقام سے کوچ کر کے مقام قصیرہ میں پڑاؤ ڈالے، چنانچہ دن کے دن اس کی تعمیل ہوئی، اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کا ارادہ اب تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ہے۔

الملك الاشرف نے مزید نصیحت کی فرمائش کی، شیخ نے فرمایا کہ بادشاہ تو اس حال میں ہے اور نابینا  
 سلطنت اور اہل کاران حکومت رنگ ریاں کر رہے ہیں، شراب کے دور چل رہے ہیں، گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے  
 نئے نئے محاصل اور ٹیکس مسلمانوں پر لگائے جا رہے ہیں آپ کے لئے خدا کے حضور میں سب سے افضل عمل پیش کرنے کا  
 یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سب گندگیوں کو دور کریں، یہ نئے نئے ٹیکس بند کریں، اور تمام ظالمانہ کارروائیاں روک  
 دیں، اور اہل معاملہ کی داد رسی کریں، الملك الاشرف نے اسی وقت ان سب چیزوں کی ممانعت کے احکام  
 جاری کئے، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دینی خدمت اور خیر خواہی پر تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر  
 دے اور اپنے لطف و کرم سے مجھے جنت میں آپ کی سعادت نصیب فرمائے، اسی کے ساتھ ایک ہزار دینار مہری نذر  
 کئے، شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کی اور فرمایا کہ میری یہ ملاقات خالصتہً لوجہ اللہ تھی، میں اس میں دنیا کی  
 کوئی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔

## بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت

الملك الاشرف کے جانشین صالح اسمعیل (ابوالخیش) نے الملك الصالح نجم الدین ایوب بادشاہ  
 کے مقابلہ میں (جس کے شام پر حملہ کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی اور حق الخدمت کے طور پر شہر صیدا اور ثقیف  
 اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا، اس دوستانہ تعلق کی بنا پر فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ دمشق میں آکر ہتھیار خریدتے  
 شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آکر ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر  
 چلائیں، تاجران اسلم نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام  
 ہے، اس لئے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے، شیخ کی طبیعت پر بادشاہ  
 کی اس بے حسیتی اور اسلام کی اس ذلت و بے بسی کا بڑا اثر تھا، انہوں نے بادشاہ کے لئے خطبہ میں دعا ترک  
 کر دی، اس کے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے قانع ہو کر بڑے ہوش کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ الہی!

اسلام اور حامیان اسلام کی مدد اور نصرت فرما، اور طحیدین و دشمنان دین کو ذلت و نکبت نصیب فرما، اور تمام مسلمان بڑی رقت و اثر کے ساتھ آمین کہتے تھے، حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دی شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصہ تک مجبوس رہے، کچھ عرصہ کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کئے گئے۔

اسی اثنا میں سلطان صالح اسمعیل، الملک المنصور والی حمص، اور سلاطین فرنگ اپنی افواج و عساکر کے ساتھ مصر کے ارادہ سے بیت المقدس آئے، صالح اسمعیل کے دل میں شیخ عزالدین کی ناراضگی برابر کھٹکتی رہتی تھی، اور اس کو اس کی فکر تھی، اس نے اپنے عمائد و خواص میں سے ایک شخص کو اپنا رومال دیا، اور کہا کہ یہ رومال شیخ کی خدمت میں پیش کرنا، اور انتہائی خوشامد و استمالت کے ساتھ ان سے کہنا کہ سابقہ خدمات و مناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آسکتے ہیں، اگر وہ منظور فرمائیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں ان کو مجبوس کر دینا، امیر نے شیخ سے بڑی خوشامد نہ باتیں کیں، اور ان کی تعظیم و تکریم اور ان کی دجولی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور آخر میں کہا کہ آپ ذرا کے ذرا بادشاہ سے نیاز مند نہ مل لیں، اور اس کی دست بوسی کر لیں، تو قصہ رفع دفع ہو جائے گا، اور آپ ضابطہ و ترقی کے ساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آجائیں گے، شیخ نے اس کا جو جواب یا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، انھوں نے فرمایا:-

واللہ یا مسکین ما ارضاه ان یقبل یدی

فضلہن اقبل یدہ یا قوم انتم فی واد

وانانی واد والحمد للہ الذی عافانی

مما ابتلاکم بہ۔ (طبقات الشافعیہ - ص ۵۰)

یہ جواب سن کر امیر نے کہا کہ پھر مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کروں، شیخ نے کہا شوق سے جو کچھ تم سے ہو سکے اس سے دریغ نہ کرو، امیر نے ان کو بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں رکھا، شیخ اپنے خیمہ میں قرآن مجید

پڑھتے رہتے تھے اور بادشاہ اپنے خیمہ کے اندر سنتا تھا، ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ تم شیخ کو قرآن مجید پڑھتا ہوا سنتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! کہا جانتے ہو یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے (ہذا الکریم قوسی المسلمین) میں نے اس کو اس لئے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعہ سپرد کرنے کے خلاف تھا، اور اس پر معترض تھا میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دوسرے منصبوں سے معزول کیا، اور اس کو دمشق سے شہر بدر کر دیا، اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے، عیسائی بادشاہوں نے کہا کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھوکے پیتے۔

اسی عرصہ میں مصری افواج آئیں، صالح اسمعیل کو شکست ہوئی، فرنگی افواج قتل و غارت ہوئیں اور شیخ صحیح و سلامت مصر روانہ ہو گئے۔

راستہ میں جب کرک کی ریاست سے گزرنا ہوا تو والی کرک نے قیام کی درخواست کی، فرمایا کہ:-  
”تمہارا یہ مختصر شہر میرے علم کا متحمل نہیں ہو سکتا“

## شیخ عزالدین مصر میں

مصر میں سلطان مصر الملک لصالح نجم الدین نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جامع عمرو ابن العاص کا خطیب مقرر کیا، اور الوجہ القبلی مصر کا عہدہ قضا اور ویران مسجد کی آبادی کا کام سپرد کیا، سلطان نے جب مدرسہ صابجیہ کی تعمیر کی، تو مذہب شافعی کی تعلیم شیخ عزالدین کے سپرد کی، اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم و اشاعت علم کا فرض انجام دیا، اور لوگوں کو بہت نفع ہوا۔

## شیخ کی حق گوئی و بیباکی

اسی دوران میں ایک مرتبہ فخر الدین عثمان نے جو قصر شاہی کا مہتمم اور عملاً سلطنت مصر کا منتظم اعلیٰ تھا

کہ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ص ۵۱۱ بروایت شیخ شرف الدین عبد اللطیف فرزند شیخ عزالدین ابن عبد السلام

مصر کی ایک مسجد کی چھت پر طبل خانہ کی عمارت بنوائی اور وہاں طبل و نقارہ بجنے لگا، شیخ عزالدین کو جب اس واقعہ کی تحقیق ہوئی تو انھوں نے (بحیثیت قاضی اور مہتمم مسجد کے) اس عمارت کے انہدام کا حکم دے دیا اور اس جرم میں فخرالدین کو ساقط الشہادۃ قرار دیا اور ساتھ ہی ساتھ عہدہ قضا سے استعفا دے دیا اس کا روالی سے سلطان کی نگاہ میں شیخ کی منزلت کم نہیں ہوئی، مگر اس نے عہدہ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر نہیں کیا، ادھر شیخ کے فیصلوں کا اتنا احترام اور ان کا دینی نفوذ و اثر اس قدر تھا کہ اسی زمانہ میں الملک الصالح سلطان مصر نے خلیفہ بغداد کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی، جب سفیر کی باریابی ہوئی، اور اس نے سلطان مصر کا پیغام پہنچایا تو اس سے دریافت کیا گیا کہ یہ پیغام تم نے خود سلطان مصر کی زبان سے سنا ہے یا کسی کے واسطے سے؟ اس نے کہا کہ میں یہ پیغام مہتمم قصر شاہی فخرالدین کی زبان سے سنا ہے، خلیفہ نے کہا کہ فخرالدین کی شہادت معتبر نہیں، اس کو شیخ عزالدین نے ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے، اس لئے ہم اس کی روایت قبول نہیں کر سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفارت پھر مصر واپس آئی، اور براہ راست سلطان سے پیغام سن کر بغداد واپس ہو کر خلیفہ کو پیغام پہنچایا۔

ان کی جرات کا اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربار شاہی تھا، بادشاہ اپنے تزک و احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دورو یہ افواج شاہی دست بستہ کھڑی تھیں، امراء حاضر ہو کر آداب تسلیمات بجا لاتے تھے، اور زمین بوس ہوتے تھے، اس بھرے دربار میں دفعۃً شیخ نے بادشاہ کو نام لے کر خطاب کیا اور کہا کہ ایوب! خدا کو تم کیا جواب دو گے، جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لئے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے، بادشاہ نے کہا کہ کیا یہ واقعہ ہے؟ شیخ نے بلند آواز سے فرمایا، ہاں فلاں میخانہ میں شراب آزادی سے بک رہی ہے، اور دوسرے ناگفتنی کام ہو رہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے دادِ عیش دے رہے ہو، بادشاہ نے کہا کہ جناب والا مجھے اس میں کچھ دخل نہیں، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہو رہا ہے، شیخ نے فرمایا کہ پھر تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو، جن کا جواب یہ ہوتا ہے، "إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ، كَرِهَ اللَّهُ لَهَا مَا كَرِهُوا، وَإِنَّهُمْ لَخَالِفَةٌ بِمَا كَرِهُوا، وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ، لَمَّا كَذَبُوا، فَوَسَّوْا بَيْنَ يَدَيْهِمْ، لَعْنَةَ اللَّهِ، وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ"۔

(یہ ہے چلا آیا ہے) سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔

شیخ کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دربار سے واپسی پر میں نے عرض کیا کہ حضرت! کیا واقعہ ہے؟ فرمایا کہ میں نے بادشاہ کو جب اس شان و شوکت کے ساتھ اجلاس کرتا ہوا دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ منظر دیکھ کر اس پر تکبر کا حملہ ہو اور وہ اپنے نفس کا شکار ہو جائے، میں نے اس کی اصلاح کے لئے یہ بات کہی، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ خون نہیں معلوم ہوا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی ہمت و جلال اس وقت ایسا مستحضر اور پیش نظر تھا کہ وہ مجھے اس کے مقابلہ میں ایک بے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

## فرنگیوں سے جہاد

وہ زمانہ فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے خالی نہ تھا، ایک مرتبہ فرنگی فوجیں منصورہ تک پہنچ گئیں اور مسلمانوں پر انہوں نے غلبہ حاصل کر لیا، شیخ مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو استجابت دعا کی نعمت عطا فرمائی تھی، ابن السبکی طبقات میں لکھتے ہیں کہ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ہوا کا رخ بدل گیا، فرنگیوں کے جہاز ٹوٹ گئے، اور اکثر فرنگی غرق ہوئے۔

## مصر اور جہاد کے لئے شیخ کا انتظام

اس زمانہ میں تاتاری عالم اسلام پر جابجا سے یورش کر رہے تھے، اسی اثناء میں انہوں نے مصر کا رخ کیا، تاتاریوں کی مسلمانوں پر جو ہمت بٹھی ہوئی تھی، وہ ضرب المثل ہے، مصر میں سراسیمگی پھیل گئی، سلطان مصر اور اہل مصر کی ہمت مقابلہ کی نہیں ہوتی تھی، شیخ الاسلام نے ہمت دلائی، اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو، میں فتح کی ضمانت کرتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ میرے خزانہ میں روپیہ کم ہے، میں تجار سے قرض لینا چاہتا ہوں، شیخ نے فرمایا کہ پہلے اپنے محل کے جواہرات، اور اپنی بیگمات کے زیورات نکالو، ارکان سلطنت،

۱۰ طبقات الشافیہ ۲۰۰ ایضاً ص ۸۴

اور امراء دربار اپنی اپنی بیگمات کے وہ زیورات حاضر کریں جو حرام ہیں، اور اس کے سکے ڈھلوائے جائیں، اور وہ لشکر میں تقسیم ہوں، اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے پہلے قرض کی کوئی ضرورت نہیں، شیخ کا اتنا عجب تھا کہ بادشاہ اور امراء سلطنت نے بے یون و چرا جو اہرات و زیورات شیخ کے سامنے حاضر کر دیئے، اور ان سے جنگ کے مصارف پورے ہو گئے، اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

## امراء سلطنت کا نیلام

شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ان امراء سلطنت کو نیلام کیا، جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے اور شرعی طریقہ پر آزاد نہیں کئے گئے تھے، یہ امراء سلطنت نسلا ترک تھے اور سلطنت مصر پر بڑے حاوی تھے، ان میں سے ایک نائب السلطنت تھا، شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ امراء شرعی طریقہ پر آزاد نہ ہوں، ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں، اور وہ عالم غلاموں کے حکم میں ہیں، ان کے فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کر دی اور وہ بڑی دقت میں پڑ گئے، یہ دیکھ کر ان امراء کے حلقہ میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی، انھوں نے ایک دن جمع ہو کر شیخ کو طلب کیا، اور کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، شیخ نے فرمایا کہ ہم ایک مجلس طلب کریں گے، اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے، اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا، انھوں نے سلطان سے عرض کیا کہ شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں، اور سر بازار نیلام کرنے کو کہتے ہیں، بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا، مگر انھوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، اس گفت و شنید میں بادشاہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا، جو شیخ کے خلاف شان تھا، بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا کہ شیخ کو اس معاملہ سے کیا تعلق، اور وہ امراء کے قضیہ میں کیوں پڑتے ہیں، شیخ یہ سن کر ناراض ہوئے، اور انھوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کر لیا، اپنا سامان جانور پر بار کیا، اور گھروالوں کو سوار کیا، اور روانہ ہو گئے، ان کی روانگی

کی خبر سن کر قاہرہ میں کھلبلی مچ گئی، شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ ان کے پیچھے ہو گیا، علماء، صلحاء، تجار، سب ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے، سلطان کو اطلاع ہوئی اور کسی نے اس سے کہا کہ شیخ عزالدین چلے گئے تو تمہاری سلطنت جاتی رہے گی، سلطان خود سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا، اور ان کو مناکر شہر واپس لایا اور طے ہوا کہ امرا سلطنت کا وہ خود نیلام کریں، میں کر نائب السلطنت نے بڑے خوشامدانہ لہجہ میں ان کو اس راہ سے باز رکھنا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے، نائب کو غصہ آ گیا، اس نے کہا کہ یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کرے گا، ہم ملک کے حاکم ہیں؟ خدا کی قسم! میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا، چنانچہ وہ اپنے عمل کے ساتھ سوار ہو کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا، ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، دروازہ کھٹکھٹایا، شیخ کے صاحبزادہ باہر نکلے تو یہ حال دیکھا کہ نائب السلطنت شمشیر برہنہ لئے دروازہ پر کھڑا ہے، انھوں نے اندر جا کر شیخ سے یہ حال کہا، شیخ نے بے پرواہی سے جواب دیا کہ "بیٹا! تمہارے والد کا یہ رتبہ کہاں کہ اللہ کے راستے میں شہید ہو، یہ کہہ کر وہ باہر نکلے، ان کا نکلنا تھا کہ تلوار نائب السلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کے جسم پر عرشہ طاری ہو گیا، اس نے رو کر شیخ سے دعا کی درخواست کی، اور کہا کہ میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں، فرمایا "میں تمہارا نیلام کروں گا" اور تمہیں فروخت کروں گا" اس نے کہا کہ ہماری قیمت آپ کس حد میں صرف کریں گے؟ فرمایا! مسلمانوں کے کاموں میں اس شخص کی اگر قیمت وصول کون کرے گا، فرمایا، میں خود اس لئے کہا "بہت اچھا، چنانچہ شیخ نے ایک ایک کر کے سب امرا کو نیلام کیا، ہر ایک پر بولی بولی گئی، شیخ نے ان کے اعزاز کے طور پر ان کے دام بہت لگائے اور بہت بڑی بولی پر ان کو فروخت کیا، اور قیمت وصول کر کے خیر کے کاموں میں صرف کی، اور وہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر گئے، ابن السبکی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ کسی اور کے متعلق سنتے میں نہیں آیا، ایک عالم کی عظمت اور اس کے رعب و داب کی یہ انتہائی مثال ہے۔

شیخ عزالدین اور سلاطین مصر

مصر میں شیخ کی زندگی میں بڑے انقلابات آئے، وہ مصر آئے تھے تو ایوبی سلطنت کا زمانہ تھا، اور



صلاح الدین کا خاندان حکومت کر رہا تھا، ان کی زندگی ہی میں یہ خاندان ختم ہوا، الملک الصالح نجم الدین ایوب کے جانشین الملک المعظم توران شاہ کے بعد ترکی النسل امرا کا دور حکومت آیا، وہ شیخ کے قدردان اور نیاز مند رہے اور ان کی تعظیم و تکریم اور بزرگداشت میں کوئی کمی نہیں آئی، خصوصیت کے ساتھ مصر کا نامور ترک سلطان الملک الظاہر بیبرس شیخ کا بڑا ادب شناس اور ان کی شخصیت سے متاثر تھا، شیخ ہی کے مشورے سے سقوط بغداد اور سلطنت عباسیہ کے اختتام پر سلطان نے بغداد کے آخری خلیفہ مستحکم کے چچا ابو القاسم احمد کو جن کا لقب المستنصر ہے، ۶۵۹ھ میں مصر میں اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا، پہلے شیخ عزالدین نے بیعت کی، پھر الملک الظاہر بیبرس نے پھر قاضی القضاة تاج الدین وغیرہ نے۔

## مکارم اخلاق

شیخ اپنے علم و فضل و قار و ہدایت کے ساتھ بڑے کریم النفس، فیاض اور مخیر تھے، قاضی القضاة بدرالدین بن جماعہ ناقل ہیں کہ دمشق کے زمانہ اقامت میں ایک سال بڑی گرانی کا آیا، باغات کے دام بہت گر گئے، اور بہت سستے بکنے لگے، شیخ کی اہلیہ محترمہ نے ان کو ایک زیور دیا کہ گرمی گزارنے کے لئے ایک باغ خرید لیں، انہوں نے وہ زیور فروخت کر کے ساری قیمت خیرات کر دی، اہلیہ نے پوچھا کہ آپ نے باغ خرید لیا؟ فرمایا کہ ہاں! مگر جنت میں میں نے دیکھا کہ لوگ بڑی عسرت اور تکلیف میں ہیں، میں نے اس کی قیمت ان پریشان حال لوگوں پر صرف کر دی، انہوں نے فرمایا، **بِحَمْدِ اللّٰهِ**۔

قاضی القضاة موصوف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ شیخ تنگ حالی کے باوجود بڑے فراخ دست اور مخیر تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے پاس کچھ دینے کو نہ ہوتا تو اپنا عامہ چیر کر اس کا ایک ٹکڑا دے دیتے۔ شیخ عزالدین صرف سلاطین ہی کے مقابلہ میں جری اور حق گو نہ تھے، بلکہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی

اسی طرح بیباک اور حق شناس تھے، ابن السبکی اور سیوطی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مصر کے زمانہ قیام میں ان سے ایک فتویٰ میں غلطی ہو گئی تو انھوں نے اعلان کروادیا کہ جس کو ابن عبد السلام نے فلاں فتویٰ دیا ہو، وہ اس پر عمل نہ کرے اس لئے کہ وہ غلط ہے۔

ابن السبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم ظاہری کے کمالات کے ساتھ دولت باطنی سے بھی مالا مال تھے، اگرچہ ان کے ایمان و یقین، اعتماد علی اللہ، بے خوفی و شجاعت، ارباب دنیا کی بے وقعتی کے واقعات خود اس پر دلیل ہیں، لیکن ابن السبکی نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے امام طریقت شیخ شہاب الدین سہروردی سے استفادہ کیا تھا، اور ان کی طرف سے ارشاد و تربیت کے لئے مجاز تھے، سیوطی نے شیخ ابوالحسن شاذلی سے بھی ملاقات و استفادہ کا ذکر کیا ہے۔

## امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارہ میں شیخ کا مسلک

شیخ علمی و نظری طور پر بھی اس کے قائل تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بدعات اور گمراہیوں کی علانیہ مخالفت و انکار علماء کا فریضہ ہے، اور اس سلسلہ میں ان کو خطرات شدید بھی برداشت کرنے چاہئیں، اور ہر طرح کے مصائب کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

الملک الاشرق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

و بعد ذلك فانا نزعنا من جملة	ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے
حزب الله وانصار دينه و جنده	ہیں اور اس کے دین کے مددگار اور اس کا لشکر
وكل جندي لا يماطر بنفسه فليس	ہیں وہ لشکر ہی جو اپنے کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے
بجندي۔	تیار نہ ہو، وہ لشکر ہی نہیں ہے۔

ان کا خیال تھا کہ علم و زبان علماء کا ہتھیار ہیں اس لئے ان کا جہاد یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو حق کی تائید اور باطل کی مخالفت میں کام میں لائیں ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:-

قد امرنا الله بالجها في نصرته دينه، الا  
ان سلاح العالم علمه ولسانه مكلمات  
سلاح الملك سيفه وسانه، فكلما لا يجوز  
للعولاء اعتمادا لمتهم عن المحدثين  
والمشركين لا يجوز للعلماء اعتماد  
المتهم عن الزائغين والمبتدعين له.

اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے دین کی مدد کے لئے جہاد و  
جدوجہد کا حکم دیا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ عالم  
کا ہتھیار اس کا علم اور اس کی زبان ہے جیسا کہ بادشاہ  
کا ہتھیار اس کی تلوار اور تیر و سنان ہے تو جس طرح بادشاہوں  
کے لئے اپنے ہتھیاروں کو نیام میں رکھنا جائز نہیں،  
اسی طرح علماء کے لئے اہل زلیخ و ضلال اور مرتدین

سے اپنی زبان کو بند کرنا جائز نہیں۔

ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں عالم ربانی کو ہر طرح کے خطرات برداشت کرنا چاہئیں گویا ان کو ان علماء سے اتفاق نہیں ہے جو ہر طرح کے خطرہ میں پڑنے کو مطلقاً ناجائز سمجھتے ہیں اور آیت "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" سے غلط اور بے محل استدلال کرتے ہیں اسی خط میں بڑے موثر انداز میں فرماتے ہیں:-

والمخاطرة بالنفوس مشروعة في اعزاز  
الدين، ولذلك يجوز للبطل من المسلمين  
ان يغمر في صفوف المشركين، وكذلك  
المخاطرة بالامر بالمعروف والنهي عن المنكر  
ونصرة قواعد الدين بالحج والبراهين

دین کے اعزاز و علیہ کے لئے جانوں کو خطرہ میں ڈالنا  
دین میں مشروع ہے اسی لئے مسلمان شہرہ کے لئے جائز  
ہے کہ مشرکین کی صفوں میں گھس جائے، اسی طرح سے امر بالمعروف  
اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اپنے کو خطرہ میں ڈالنا اور  
اصول دین کی دلائل و براہین کے ذریعہ تقویت مشروع ہے

مشروعة فمن خشي على نفسه سقط عنه  
 الوجوب وتبقي الاستحباب ومن قال بان  
 التعزير بالقوم لا يجوز فقد بعد عن الحق  
 ونأى عن الصواب وعلى الجملة فمن أثر  
 الله على نفسه أثره الله ومن طلب رضا  
 الله بما يبعث الناس رضى الله عنه وارضى  
 عنه الناس ومن طلب رضا الناس بما  
 يبعث الله سبحانه الله عليه وأمنه عليه  
 الناس وفي رضا الله كفاية عن رضا  
 كل احد - (طبقات ج ۵ ص ۹۱)

عرب شاعر نے خوب کہا ہے:-

فليتك تحلو والحياة مريرة  
 وليتك ترضى ولا نام فضاب

(کاش کہ آپ کی محبت کی عداوت مجھے حاصل ہو جاتی پھر چاہے زندگی کتنی ہی تلخ ہوتی اور کاش کہ آپ مجھے  
 راضی ہو جاتے چاہے ساری دنیا ناراض ہوتی۔)

ان کی زندگی تبتلائی ہے کہ انھوں نے ساری عمر اپنے اس عقیدہ اور مسلک پر چل کیا اور امر بالمعروف اور  
 نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اور اپنے نزدیک کسی غلط اور خلاف شرع چیز کی تردید میں اپنی جان مال آبرو وطن و عہدہ  
 کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

شیخ کی تصنیفات

شیخ جس طرح کامیاب مدرس اور شیخ النظر نقیہ اور تبحر مفتی تھے اسی طرح کہنے مشق مصنف بھی تھے۔

ان کی تصنیفات میں القواعد الکبریٰ اور کتاب مجاز القرآن خاص وقعت رکھتی ہے ابن اسکی لکھتے ہیں۔

وهذان الكتابان شاهدان بامامته . یہ دونوں کتابیں ان کی امامت اور علوم شریعت

وعظیم منزلتہ فی علوم الشریعۃ۔ میں ان کے علوم منزلت پر شاہد ہیں۔

ان دونوں کتابوں کا انھوں نے دو الگ کتابوں میں اختصار کیا ہے ابن اسکی نے ان کی دو اور کتابوں

”شجرۃ المعارف“ اور الدلائل المتعلقة بالملائکۃ والانس علیہم السلام کی بھی خصوصی تعریف کی ہے ان کی ایک

کتاب ”مقاصد الصلوة“ خود ان کے زمانہ میں بڑی مقبول ہوئی اور لوگوں نے اس کی ہزاروں نقلیں کیں، چھوٹی

بڑی تصنیفات کے علاوہ ان کے فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ ہے جو فقہ شافعی کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

امام غزالی کے بعد شیخ عزالدین غالباً دوسرے عالم اور مصنف ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ احکام شرعیہ کے

مقاصد و لطائف پر گفتگو کی اور شریعت کے اسرار و نکات بیان کئے اس موضوع کے سب سے بڑے مصنف شیخ الاسلام

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے تہجۃ الشراب بالغۃ کے مقدمہ میں اس موضوع کے پیش رو مصنفین میں تین بزرگوں

حجۃ الاسلام غزالی ابوسلیمان خطابی اور شیخ الاسلام عزالدین کا نام لیا ہے۔

## شیخ کی وفات

۹ جمادی الاولیٰ ۶۶۶ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں شیخ کی وفات ہوئی یہ الملک لظاہر سیرس کا عہد حکومت تھا،

اس کو شیخ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا کہتا تھا کہ خدا کی شان ہے شیخ کی وفات میرے عہد حکومت ہی میں مقدر تھی،

جنازہ میں امر اور باربار ارکان سلطنت اور افواج شاہی شریک تھیں سلطان نے خود کا زہاد دیا، اور دفن میں شریک ہوا۔

شیخ کا جنازہ جب قلعہ کے نیچے سے گزرا اور سلطان نے خلقت کا ازوہام دیکھا تو اپنے خواص میں کسی سے

کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہے اس لئے کہ یہ شخص جو مرجع خلافت ہے اگر اشارہ کرتا

تو میری سلطنت چلی جاتی اس کے انتقال کے بعد مجھے اپنی سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا ہے۔

۱۰ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ص ۱۰۱ ۱۱ ایضاً ص ۹۰ ۱۲ حاشیہ الشراہ النذہ مطبع صدیقی ۱۳ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ص ۱۰۵ ۱۴

# فتنہ نانا اور اسلام کی ایک نئی آزمائش

ناناوری حملے اور اس کے اسباب

ساتویں صدی میں عالم اسلام کو وہ حادثہ پیش آیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی اور جو قریب تھا کہ اس کی ہستی کو فنا کر دے، یہ ناناوری غارتگروں کا حملہ تھا جو مور و ملخ کی طرح مشرق سے بڑھے اور سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔

اس منحوس واقعہ کا سبب سلطان وقت علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی بظاہر ایک غلطی اور بے تدبیری تھی کہ اس نے پہلے ان ناناوری تاجروں کو قتل کر دیا جو اس کے ملک میں تجارت کے لئے آئے تھے، پھر جب جنگیز خاں نے اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے ایک سفارت بھیجی تو خوارزم شاہ نے سفیر کو بھی قتل کر دیا، اس پر ناناوری خاقان جنگیز خاں نے برا فروختہ ہو کر خوارزم شاہی سلطنت اور پھر پورے عالم اسلام پر حملہ کر دیا۔

لیکن قرآن مجید میں اعمال و اخلاق کے نتائج اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کا جو ابدی اور عالمگیر قانون بتایا گیا ہے اور خاص طور پر سورہ اسرا کی ابتدا میں نبی اسرائیل کی تباہی، قتل عام و نکبت و ذلت اور بیت المقدس کی تخریب بے حرمتی کی جو داستان عبرت نالی گئی ہے، اس کی روشنی میں اس فتنہ عالم آشوب

لہ اس موقع پر سورہ اسرا کی آیات وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا

سے لے کر وَلَيَنْزِلُنَّ عَلَيْكُمْ فَتَقْتُلُوهُمْ فَتَوَكَّلُوا عَلَيْكُمْ تَتَوَكَّلُونَ تک آیات پر غور کیا جائے۔

اور اس وقت کی دنیائے اسلام کی اس قیامتِ صغریٰ کا حقیقی سبب صرف اتنا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک بادشاہ نے کوتاہ نظری و بے تدبیری سے کام لیا، اور اچانک یہ سیلابِ عالم اسلام پر امنڈ پڑا، اور ایک فرد کی غلطی سے ساری ملت اسلامیہ کو بے پروا و بیکھننا پڑا، جس کے لئے نہ وہ تیار تھی، نہ اس کی مستحق، قرآن مجید کا چراغ اگر ہاتھ میں لے کر اس وقت کے مسلمانوں کی اخلاقی، دینی، تمدنی اور سیاسی حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ یہ منحوس واقعہ اچانک پیش نہیں آیا، اور اس کے اسباب اس سے کہیں زیادہ وسیع، گہرے اور ٹھوس ہیں، جتنے سمجھے اور بیان کئے گئے ہیں، اس کے لئے ہم کو کئی سال پچھے ہٹ کر اپنا کام شروع کرنا پڑے گا، اور اس وقت کی اسلامی سلطنتوں، اہم ترین تمدنی مراکز اور اسلامی معاشرہ پر ایک جمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات (۱۲۵۸ء) پر اس کی وسیع و زرخیز سلطنت اس کی اولاد و خاندان کے افراد میں تقسیم ہو گئی، دنیا کے بہت سے باتیان سلطنت اور الوالعزم فرمانرواؤں کی طرح اس کی اولاد اس کی صلاحیتوں کی وارث اور اس کی صحیح جانشین ثابت نہ ہو سکی، عرصہ تک وہ ایک دوسرے سے دست و گریبان اور برسرِ پیکار رہے، بعض اوقات ان میں سے بعض افراد نے اپنے ہی بھائیوں اور افراد خاندان کے خلاف صلیبی فرمانرواؤں اور فرنگی حریفوں سے بھی مدد لینے اور ان سے ساز باز کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا، جس کا ایک نمونہ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کے تذکرہ میں گذر چکا ہے، اس طوائف الملوکی خاندانی رقابتوں اور خانہ جنگیوں سے سلطنت کے زیرِ فرماں ممالک میں سیاسی انتشار، انتظامی ابتری اور اخلاقی زوال رونما تھا، لوگ ایک بے یقینی کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے، صلیبیوں اور فرنگیوں کی بار بار ان اسلامی شہروں پر تاخت ہوتی رہتی تھی، جن کو سلطان صلاح الدین نے بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد واپس لیا تھا، انتظامی و اخلاقی دونوں طرح کی کوتاہیوں اور بے راہ روی کا نتیجہ وباؤں، امراض اور شدید قحط کی شکل

لے ہندوستان میں عالمگیر اعظم اور اس کے جانشینوں کی مثال ہمارے لئے کافی ہے۔

میں رونما ہوا اور مصر علیہ زرخیز ملک میں جو دوسرے ملکوں کا بھی پیٹ بھر سکتا تھا، ۵۹۴ء میں جبکہ چاہتھیے  
 الملک لعادل اور الملک لافضل کی خانہ جنگی نے مصر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور پائے نیل میں طغیانی نہیں آئی  
 اور مصر میں ایسی گرانی رونما ہوئی اور ایسا شدید قحط پڑا کہ آدمی نے آدمی کو بھون کر کھایا، موت کی ایسی گرم بازو  
 تھی کہ مردوں کو کفن دینا ممکن نہ تھا، مورخ ابو شامہ کے بیان کے مطابق تنہا الملک لعادل (سلطان مصر) نے  
 صرف ایک ہینہ میں دو لاکھ بیس ہزار مردوں کو اپنے ذاتی مال سے کفن دیا، کتوں اور مردوں کے کھانے کی نوبت  
 آگئی، بہت بڑی تعداد میں بچے بھون بھون کر کھائے گئے، اور اس کی ایسی عمومیت ہوئی کہ اس میں لوگوں کو  
 کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، مورخ ابن کثیر کے بیان کے مطابق جب کھانے کے لئے بچے اور چھوٹی عمر کے  
 لڑکے نہیں رہے تو جس آدمی کا جس آدمی پر زور چلا، اس نے اس کو بھون کر کھالیا، سنت الشکر کے مطابق آسمانی  
 تنبیہات کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور ایسے غیر معمولی واقعات پیش آ رہے تھے، جو توبہ، انابت اور اصلاح حال  
 کا خیال و جذبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، چنانچہ اسی ۵۹۴ء میں ایک عظیم زلزلہ آیا جس کی زد میں خاص  
 طور پر ملک شام، بلادِ روم اور عراق تھے، اس کی ہلاکت آفرینی اور دہشت انگیزی کا اندازہ اس سے  
 ہو سکتا ہے کہ تنہا شہر نابلس اور اس کے اطراف میں بیس ہزار انسان زلزلہ میں دب کر مر گئے، "مرآة الزمان"  
 کے مصنف کا بیان ہے (جو شدید مبالغہ سے خالی نہیں ہے) کہ اس زلزلہ کا شکار گیارہ لاکھ انسان ہوئے۔  
 ادھر غیر معمولی حوادث پیش آ رہے تھے، جو مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے  
 بالکل کافی تھے، ادھر عالم اسلام کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی اور برادر کشی کا سلسلہ جاری تھا،  
 ۶۰۱ء میں ایک ہی خاندان کے دو افراد قتادہ حسینی امیر مکہ اور سالم حسینی امیر مدینہ میں سخت جنگ  
 ہوئی، ۶۰۲ء میں غزالیوں اور خوارزم شاہیوں کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور مسلمانوں نے سلمان کا  
 خون بہایا، ادھر یہ ہو رہا تھا، ادھر (۶۰۳ء) میں فرنگیوں نے شام کے مختلف علاقوں پر حملے شروع کئے،

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "البدایہ والنہایہ" ج ۱۳ ص ۲۶۱ حوادث ۵۹۴ء



۶۰۶ھ میں جزیرہ کے مسلمان حکام نے فرنگیوں سے سازش کی، اور ۶۱۶ھ میں فرنگیوں نے مصر کے شہر  
دمیاط پر قبضہ کر لیا جو فوجی و دفاعی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

ادھر مرکز خلافت دارالسلام بغداد میں سلطنت کی ظاہری شان و شوکت بھی تکلفات اور دولت و  
تمدن کے کھوکھلے مظاہر اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئے تھے، خلفاء کے منظور نظر مصاحبین اور معتدین کی دولت  
(جو غلام کی حیثیت سے حرم خلافت میں داخل ہوتے تھے، اور فرانس، ساقی، ہہتم، تو شک خانہ وغیرہ کے منصبوں پر فائز  
تھے) کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خلیفہ الظاہر کے زر خرید علار الدین الطبری الظاہر  
کی سالانہ آمدنی جو اس کو اپنی نئی جائداد سے حاصل ہوئی تھی، تین لاکھ دینار تھی، بغداد میں اس کے محل کی کوئی  
نظیر نہ تھی، یہی حال مجاہد الدین ایک الدویدار المستنصری کی دولت کا تھا، ان لوگوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں  
کی شادی میں جو بہیز دیا، اور جو تحائف تقسیم کئے، ان کو پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے، آخر الذکر کی جاگیر کی آمدنی پانچ  
لاکھ دینار سالانہ تھی، یہی حال الصلاح عبدالغنی بن فاخر فرانس کا تھا، جو یورپ علم سے عاری، لیکن شاہانہ معیار کی  
زندگی گزارتا تھا، اس کے مقابلہ میں سلطنت عباسیہ کے سب سے بڑے مدرسہ المستنصریہ کے لائق اساتذہ کی  
تنخواہیں اتنی حقیر تھیں کہ اس کا یقین کرنا مشکل ہے، ان میں سے بڑے بڑے اساتذہ کو ۱۲ دینار ماہوار سے  
زیادہ نہیں ملتے تھے، جب کہ اس کے مقابلہ میں عہد عباسی کے ایک امیر الشراہی کے ایک خادم نے چار ہزار دینار ایک  
امیر کی شادی میں ٹائے، اور تین ہزار دینار شراہی کی طرف سے ایک پرندہ کی قیمت میں جو اس کے لئے تحفہ میں  
موصول سے لایا گیا تھا، ادا کئے گئے۔

شان و شوکت کے اظہار کے لئے عید اور جانشینی کے موقع پر جو شاہانہ جلوس بغداد میں نکلتے تھے، ان شہر

۱۔ جزیرہ سے مراد وہ علاقہ ہے، جو طبرستان اور فرات کے درمیان واقع ہے، اس کو ملایا بن النہرین بھی کہتے ہیں، اس کا مغربی شمالی حصہ جزیرہ

کے نام سے مشہور ہے، اور جنوبی مشرقی حصہ عراق کے نام سے مشہور ہے، ۲۔ الصلاح عبدالغنی بن فاخر فرانس کا تعلق

۳۔ یہ سب معلومات اس عہد کی معاصر تاریخوں سے لیں گے، اور ان کے نام "اور العسیر المستور" سے ماخوذ ہیں

ان میں شرکت کرنے ان کا تماشہ دیکھنے میں محاور خود فراموش ہو جاتا تھا، نمود و نمائش کے اسواج طرح بے تکلف دینی فرائض ان میں نظر انداز ہوتے تھے اور نمازیں قضا ہوتی تھیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ ۶۳۰ھ کے عید کے موقع پر پوٹا ہی جلوس نکلا، وہ رات کو جا کر ختم ہوا، اس کی ایسی مشغولیت اور محویت رہی کہ لوگوں نے اس دن عید کی نماز نصف شب پہلے قضا کر کے پڑھی، اسی طرح ۶۳۳ھ کی عید الاضحیٰ کو اہل بغداد شہر کے باہر خلیفہ کا شاہی جلوس دیکھنے نکلے اور نماز عید انہوں نے غروب آفتاب کے وقت پڑھی۔

خلیفہ کے لئے زمین بوسی کا عام رواج تھا، اسی طرح سے آستانہ بوسی اور زمین پر ناک رکھنے کا بھی دستور تھا، اور اس میں کسی کو کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، جانداروں کی ضبطی کے واقعات بکثرت پیش آتے تھے، رشوت کی گرم بازاری تھی، باطنیوں، عیاروں اور ٹھگلوں کی سرگرمی تیز ہو گئی تھی، اخلاقی بے راہ روی بہت بڑھی تھی، دل بہلانے والے مشاغل کا زور تھا، مغنیات کی کثرت تھی اور دولت جمع کرنے کا شوق حد سے فروں تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاری، ایران و ترکستان کو تہ و بالا کر رہے تھے اور اسلام کے سب سے بڑے قلعہ بغداد پر ان کی نگاہیں تھیں، مورخ ابن کثیر ۶۲۶ھ کے آغاز کی ان الفاظ کے ساتھ خبر دیتا ہے کہ اس سن ہجری کی ابتدا اس شان سے ہوئی کہ سلاطین بنی ایوب (سلطان صلاح الدین کے خاندان کے بادشاہ) ایک دوسرے سے نبرد آزما اور برس بیکار رہیں، دارا خلافت بغداد میں کچھ ایسا انتشار برپا رہا کہ ۶۳۰ھ سے ۶۳۳ھ تک خلفاء اسلام کے قدیم و مسلسل معمول کے خلاف خلیفہ کی طرف سے نہج کا انتظام ہوا، اور نہ غلاف کعبہ بدلا گیا، ۲۱ دن تک بیت الشرف کی دیواریں بالکل کھلی رہیں، لوگوں نے اس سے بدشگونی لی۔

۵۴۵ھ میں الناصر لدین الشرف تحت خلافت پر بیٹھا، اس کو چھالیس سال سے زیادہ مسلسل خلافت و حکومت کا موقع ملا، یہ اتنی طویل مدت ہے جو کسی عباسی خلیفہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی، لیکن اس کا دور خلافت عباسیہ کا تاریک ترین دور تھا، مورخین نے بڑے سخت الفاظ میں اس پر تنقید اور اس کے اعمال و اخلاق کی

۱۔ احوادث اجماع و اوقات ۶۳۰ھ ۲۔ ملاحظہ فرمائیں عصر الشرفی بغدادی ۳۔ الامامی معارف و معانی ۴۔ الامامی معارف و معانی ۵۔ الامامی معارف و معانی ۶۔ الامامی معارف و معانی

خدمت کی ہے، مورخ ابن اثیر نے ان لفظوں میں اس کو یاد کیا ہے۔

رعیت کے ساتھ اس کا سلوک نہایت خراب اور ظالمانہ تھا، اس کے زمانہ میں عراق کا ملک ایران ہو گیا ملک کے باشندے مختلف شہروں اور ملکوں میں متفرق و آوارہ ہو گئے، اس نے ان کی جائیدادیں اور دولتیں ضبط کر لیں، اس کے کاموں میں بڑا تضاد تھا، آج ایک بات کرتا تھا، کل اس کے خلاف اس کو تمام تر دہشت گردی تفریحی مشاغل سے بھی اس نے جو انگریزی و سپہ گری کے لئے ایک خاص وردی ایجاد کی، صرف اس وردی والوں کے لئے مردانہ کھیلوں اور فنون سپہ گری کے مظاہرہ کی اجازت تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردانہ کمالات اور فنون سپہ گری کا عراق سے خاتمہ ہو گیا، خلیفہ کی شہنشاہی ان تفریحات سے حد کو پہنچ گئی، اہل ایران کا بیان ہے کہ اسی نے سب پہلے تاناریوں کو اسلامی قلم و پر حملہ کرنے کی طرف متوجہ کیا، اور ان کے پاس پیام بھیجا:

۶۲۲ء میں الناصر لدین اللہ کی وفات ہوئی، اور مستنصر باللہ (۶۲۳-۶۲۴ء) اس کا جانشین ہوا، یہ خلیفہ دیندار پاکباز، نیک سیرت، پاکیزہ خصائل اور بہت سے اوصاف و خصوصیات میں خلفاء صالحین کی یادگار تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کو انتظام و اصلاح کے لئے زیادہ مدت نہ مل سکی، ۶۲۴ء میں اس کی وفات پر اس کا فرزند مستعصم باللہ خلیفہ ہوا، مستعصم ایک صحیح العقیدہ، دیندار محتاط خلیفہ تھا، جو کبھی مسکرات و محرمات کے قریب نہیں گیا، ہر مہینہ دو شنبہ اور جمعرات اور ماہِ رجب کے روزے رکھتا تھا، قرآن کا حافظ تھا، وقت پر نماز پڑھنے کا شدت سے پابند تھا، لیکن مورخ ابن اثیر کے قول کے مطابق طبیعت میں ضرورت سے زیادہ نرمی اور بیدار مغزی کی کمی تھی، دولت کے معاملہ میں کسی قدر حریص اور بخیل واقع ہوا تھا۔

۶۲۲ء میں ابن العلقمی کے نام خلافت عباسیہ کی وزارت عظمیٰ کا قرعہ غالب نکلا، خلافت کے نظم و نسق میں اس وقت سے بڑی برہمی پیدا ہوئی، جب ۶۵۵ء میں بغداد میں شیعہ سنی کا زبردست جھگڑا ہوا

۱۔ خوارزمی سلطنت کا زور توڑنے کے لئے جس سے خلیفہ بغداد کے تعلقات خراب تھے، ۱۲ تاریخ الکامل ج ۱۲ ص ۱۸۱۔

۲۔ ملاحظہ ہوا ابتدائے و انہائے ج ۱۳ ص ۱۵۹۔ ۳۔ پورا نام ہوید الدین ابو طالب محمد بن احمد بن علی محمد العلقمی ہے۔

شیعوں کے مکانات یہاں تک کہ ابن العلقمی کے عزیزوں کے مکانات تک لوٹ لئے گئے، ان واقعات کے دل میں بڑی کا پیدا ہونا اور جذبہ انتقام کا ابھرنا بعید از قیاس نہیں اس وقت اگرچہ تاتاری خطرہ بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا، اور تاتاری فوجیں بغداد کی طرف بڑھ رہی تھیں، وزیر ابن العلقمی کی ہدایت اور حکم سے بغداد کی افواج میں زبردست تخفیف کی گئی، سواروں کی تعداد گھٹا کر دس ہزار کر دی گئی، بقیہ سپاہیوں کو رخصت کر دیا گیا، اور ان کے منصب روک لئے گئے یہاں تک کہ ان کو بازاروں اور مسجدوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا گیا، شعرا نے اسلام کی کسمپرسی پر مرثیے کہے۔

مستعصم اگرچہ ذاتی طور پر نیک سیرت اور نیک خیال خلیفہ تھا، اور اصلاح و ترقی کا خواہشمند بھی تھا، لیکن زمانہ کافساد معاشرہ کا انتشار اور اہل حکومت کا بگاڑ اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ اس کو روکنے اور حکومت و معاشرہ میں اصلاح کی نئی روح پھونکنے اور اس کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے ایسے اولوالعزم اور طاقتور شخصیت رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی، جو عام طور پر تاریخ میں نئی سلطنتوں کے بانی اور نئے عہد کے فاتح ثابت ہوئے ہیں، یہ واقعہ تاریخ میں بار بار پیش آیا ہے کہ اکثر حکمران خاندانوں کے آخری افراد اور کسی زوال پذیر سلطنت کا آخری فرمانروا اپنی ذات سے صلاحیت شعرا و اصلاح پسند اور نیک سیرت تھا، لیکن اس خاندان یا اس سلسلہ سلطنت کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور فساد بڑھتے بڑھتے اس آخری نقطہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب اس کو آخری منزل پر پہنچنے اور اس کے قدرتی نتائج کے ظاہر ہونے سے بظاہر کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی، چنانچہ اس خاندان اور حکومت کا زوال تاریخ میں اسی شخص کے نام لکھا گیا، جو اپنے بہت سے پیشروں سے بہتر تھا، اور بہت حد تک اصلاح حال کا خواہشمند تھا۔

اگرچہ بغداد میں اہل اصلاح کی ایک تعداد علم و درس اور عبادت میں مشغول تھی، اور کچھ الشر کے بندے خانقاہوں اور مساجد میں خلوت نشین اور کیسوتھے، لیکن حکام اور آسودہ حال طبقے میں بگاڑ پھیل گیا تھا،

اس عہد کا ایک مورخ ابوالحسن خزر جی اپنے زمانہ کے اہل عراق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

جاگیروں اور جائیدادوں کے حصول کا شوق بہت بڑھ گیا ہے، رفاہ عام کے کام اور اجتماعی مصالح

سے لوگوں کی نظر ہٹ گئی ہے، ان دنیاوی امور میں مشغولیت بہت بڑھ گئی ہے، جو جائز نہیں ہے، اعمال سلطنت نے

ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے، اور سب کو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی فکر ہے؛

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:-

”یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے، سلطنت کفر کے ساتھ تو رہ جاتی ہے، ظلم کے ساتھ نہیں رہتی“

اُدھر عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں خوارزم شاہی بلا شرکت غیرے حکومت کر رہے تھے، یہ بڑے

جاہ و جلال کی سلطنت تھی، جو پانچویں صدی کے آخر میں سلطنت سلجوقیہ کے کھنڈروں پر قائم ہوئی، مصر و شام

عراق و حجاز اور شمال مغرب میں ایشیا کوچک کے مختصر سلجوقی علاقہ اور جنوب مشرق میں غوریوں کی نوخیز سلطنت

کو مستثنیٰ کر کے تقریباً سارا عالم اسلام خوارزم شاہیوں کے زیر نگیں تھا، اس خاندان کا سب سے بڑا حوصلہ مند

عالی ہمت اور کشور کشا سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶-۶۱۷ھ) تھا، جو اپنے عہد کا سب سے

بڑا نہ صرف مسلمان بادشاہ بلکہ شاید اپنے عہد کا سب سے طاقتور سلطان تھا، ہیرلڈ لیمب (H. LAMB) اپنی

کتاب ”چنگیز خاں“ میں صحیح لکھتا ہے:-

”اسلامی ملکوں کے قلب میں سلطان محمد خوارزم شاہ اورنگ شاہی پر خدا سے جنگ بنا بیٹھا تھا، اس کی قلمرو

ہندوستان کی سرحد سے بغداد تک اور بحر خوارزم (آرال) سے خلیج عجم تک چلی گئی تھی، سلجوقی ترکوں کے سوا

جنہوں نے صلیبیوں پر فتوحات حاصل کی تھیں، اور مصر کے سلاطین ملوک سے قطع نظر کر کے جو روز افزوں

ترقی پر تھے، باقی جس قدر اسلامی سلطنتیں تھیں، ان پر سلطان محمد خوارزم شاہ بالکل چھایا ہوا تھا، سلطان محمد

رتبہ میں شہنشاہ تھا، عباسی خلیفہ ناصر الدین الشراسی سے ناراض تھے، مگر اس کی قوت کو اتنے تھے، خلیفہ

۱۱۳۸ھ لاطنہ ہونٹون ”عصر الشراہی بغداد“ از ناجی معروف رسالہ ”الاقلام“ بغداد شمارہ محرم ۱۳۸۶ھ

بغداد دنیاوی اقتدار سے محروم ہو کر پاپائے روم کی طرح صرف دین کا ادی و رہنما رہ گیا تھا۔

عرب مورخین علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت و اخلاق کی کسی بڑی کمزوری اور کسی قابل ذکر شخصی عیب کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ اس کی دینداری، خوش اعتقادی اور شجاعت و صلاحیت کا عام طور پر اعتراف کرتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ساری صلاحیتیں اور طاقتیں ان چھوٹی بڑی اسلامی سلطنتوں کے ختم کرنے میں صرف ہوئیں جو اس وسیع مشرقی حصہ میں کہیں واقع تھیں، ایک طرف شمال و مغرب میں اس نے سلجوقیوں کو ان کے آخری حدود تک پسپا ہونے پر مجبور کیا، دوسری طرف مشرق اور جنوب میں وہ ہمیشہ غوریوں سے نبرد آزما رہا، اور ان کو بھی ایک محدود حصہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا، ایران و ترکستان کی سپہ گری کا بہترین عنصر اس غیر مختتم سلسلہ جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گیا تھا، ان زر خیز و مردم خیز ممالک کے شہروں و قصبات کی فضا اور ذہن پر جنگ ہر وقت چھالی ہوئی رہتی تھی، مفتوحہ ممالک کی دولت شاداب و حاصل خیز ملکوں کی پیداوار، دستکاروں اور اہل صنعت کی ترانس و تراش کی وجہ سے جو سلطنت و طاقت کے اس مرکز میں جمع ہو گئے تھے، تمدن اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا اور قراغت و امارت اور فتوحات کے سارے لوازم جمع ہو گئے تھے، اس وقت کی تمدنی خرابیوں و کمزوریوں کا ذکر تو ان تاریخوں میں ملنا مشکل ہے، جن کو صرف سرکار دربار سے سروکار تھا، اگر اس کا سراغ کچھ مل سکتا ہے تو اہل دل صوفیاء و مشائخ اور مصلحین کی بیاضوں، ملفوظات اور مواعظ میں، جن کا بڑا حصہ تاریخی سیلاب کے نذر ہو گیا، چنگیز خاں کا مسیحی مورخ ہیرلڈ لیمب کا یہ بیان محض دینی تعصب اور مبالغہ آرائی پر محمول نہیں کیا جاسکتا کہ۔

• مسلمانوں کی دنیا جنگ و پیکار کی دنیا تھی اور ایسی دنیا تھی جو نغمہ و سرود سے بھی شغف رکھتی تھی اور

کان بھی اچھے پائے تھے، لیکن اس ظاہر کے ساتھ باطن میں ایک مہمان کی حالت ہمہ وقت ضرور رہتی تھی،

بادشاہوں کی جگہ غلام اور ملک حکومت کرتے تھے، دولت جمع کرنے کا شوق بہت تھا، اخلاقی برائیاں

۱۲۴۰ء چنگیز خاں سے ماخوذ از ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب روم۔

اورنگی نازشیں بھی کچھ کم نہ تھیں، انتظام امور ایسے لوگوں کے سپرد تھا، جو رعایا کو لوٹتے اور کھاتے تھے، عورتوں کی نگہداشت خواجہ سراؤں کے ذمہ تھی اور ایمان کا مالک خدا تھا!

خوارزم شاہی سلاطین سے اس موقع پر بھی وہی مہلک غلطی ہوئی، جو اسپین کے عرب فرمانرواؤں نے کی تھی، اور جس کو الہی قانون مکافات نے معاف نہیں کیا، یعنی یہ کہ انھوں نے اپنی ساری طاقت سلطنت کی توسیع و استحکام اور حریفوں کی سرکوبی میں صرف کی اور اس انسانی آبادی میں جو ان کی سرحد سے متصل تھی اور بجائے خود ایک دنیا تھی، تبلیغ اسلام، اور ان تک خدا کا آخری پیغام پہنچانے کی کوئی فکر نہیں کی، جذبہ دینی سے قطع نظر کر کے سیاسی فراست اور دور بینی کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اس وسیع انسانی آبادی کو اپنا ہم آہنگ اور ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتے اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس خطرہ سے محفوظ ہو جاتے، جو نہ صرف ان کو بلکہ پورے مسلمانوں کو پیش آیا۔

یہ زمانہ اور حالات تھے، جب تاتاری ابتدا اپنے سردار اور قائد چنگیز خاں کی قیادت میں عذاب الہی کی طرح عالم اسلام کے مشرقی حصہ ایران و ترکستان کی طرف بڑھے، پھر اس بغداد کی بھی نوبت آگئی، جہاں کا نقشہ اوپر کی سطروں میں گذرا ہے اور بالآخر انھوں نے ۶۵۶ھ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی "وَأَنْقَضُوا فِتْنَةً لِّأَتْمِیْنَتِیْنَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ"

عالم اسباب میں اس کا قریبی محرک یہ واقعہ ہوا کہ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو پیام بھیجا کہ میں بھی ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ہوں اور آپ بھی ایک وسیع سلطنت کے تاجدار ہیں، بہتر ہے کہ ہم دونوں تجارتی تعلقات قائم کریں، ہمارے تاجر بے خوف و خطر آپ کے قلمرو میں جائیں اور یہاں کی مخصوص پیداوار اور مال

لے چنگیز خاں ۱۲۳۱ھ میں لایمب ماغوزاز زجہ مولوی عنایت الشرح صاحب مروج ۲۷۱ھ چنگیز خاں کی سلطنت کی ابتدا ۵۹۹ھ سے ہوئی، خوارزم شاہ کی حکومت پر پہلا حملہ ۶۱۶ھ میں ہوا، اس کا انتقال ۶۲۳ھ میں ہوا، اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اس کے مقاصد کی

تکمیل کی ۶۵۶ھ میں جب بغداد پر حملہ ہوا تو تاتاری افواج کا قائد اور امیر چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔

وہاں فروخت کریں، اور آپ کے تاجر اطمینان کے ساتھ ہمارے ملک میں آئیں، اور وہاں کا مال فروخت کریں،  
خوارزم شاہ نے اس کو منظور کر لیا، اور تجارتی تعلقات قائم ہو گئے، اور تجارتی قافلے بے تکلف دونوں ملکوں  
میں آنے جانے لگے، اس کے بعد کیا پیش آیا، جس سے عالم اسلام اچانک خون کے سمندر میں ڈوب گیا، اس کی تفصیل  
مغربی موبخ کی زبان سے سنئے، جس کی اسلامی مورخین کے بیان سے حرف بگرفت تصدیق ہوتی ہے۔

ہیرلڈ لیمب اپنی کتاب "چنگیز خاں" میں لکھتا ہے:-

"لیکن تجارت کے تعلقات جو چنگیز خاں نے قائم کئے تھے، وہ اتفاق سے یک نخت ختم ہو گئے، اور یہ

اس طرح پیش آیا کہ قراقرم سے تاجروں کا ایک قافلہ مغرب کو آ رہا تھا کہ راستہ میں اترار کے حاکم نے جس کا

نام ایل جن تھا قافلہ کے سب آدمیوں کو گرفتار کر لیا، اور اس کی اطلاع اپنے آقا یعنی خوارزم شاہ کو اس طرح

کی گویا اس قافلہ میں جاسوس بھی موجود ہیں، ایل جن کا یہ خیال بالکل قرین عقل تھا۔

حاکم اترار کے پاس سے اطلاع کے آتے ہی سلطان محمد خوارزم شاہ نے بے سوچے سمجھے حکم دے دیا کہ قافلہ

کے کل تاجروں کو ہلاک کر دیا جائے، چنانچہ اس حکم کے مطابق قراقرم سے آئے ہوئے کل تاجر قتل کر دیئے گئے، اس کی

اطلاع جس وقت چنگیز خاں کو ہوئی تو اس نے فوراً اپنے سفیر بھیج کر خوارزم شاہ سے اس کی شکایت کی، سلطان محمد

نے سفیروں کے سردار کو بھی قتل کر دیا، اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے، ان کی داڑھیاں جلوا دیں، اس سفارت میں سے

جن لوگوں کی جان بچ گئی تھی، وہ چنگیز خاں کے پاس آئے اور کل حال عرض کیا، دشت گوئی کا خان حال سنتے ہی

ایک پہاڑی پر چڑھ گیا کہ تنہائی میں اس واقعہ پر غور کرے، مغلوں کے ایلچی کو مار ڈالنا ایسا فعل تھا، جسے بغیر سزا کے

چھوڑنا ممکن نہ تھا، یہ حرکت ایسی تھی جس کا بدلہ لینا مغلوں کی گذشتہ روایات کے لحاظ سے ضروری تھا۔

چنگیز خاں نے کہا جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے، اسی طرح زمین پر دو خاقان

نہیں رہ سکتے۔

۱۲۹۹ء چنگیز خاں ص ۱۲۳ ہیرلڈ لیمب۔



## اسلام کے مشرقی ممالک تاتاریوں کی زد میں

تاتاریوں نے پہلے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بچادی اور اس کو ایک تودہ خاک بنا دیا، شہر کی آبادی میں کوئی زندہ نہیں بچا، پھر سمرقند کو خاک سیاہ کر دیا، اور ساری آبادی کو فنا کے گھاٹ اٹا دیا یہی حشر عالم اسلام کے نامی گرامی شہروں سے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم کا ہوا، خوارزم شاہ جو عالم اسلامی کا واحد فرمانروا اور سب سے طاقتور سلطان تھا، تاتاریوں کے خوف سے بھاگا پھرتا تھا، اور تاتاری اس کے تعاقب میں نھے یہاں تک کہ ایک نامعلوم جزیرہ میں اس نے قضا کی۔

خوارزم شاہ نے ایران و ترکستان کی اسلامی ریاستوں اور خود مختار حکومتوں کو اپنی شاہی میں ضم کر لیا تھا، اس لئے جب انھوں نے تاتاریوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو پھر ان کا مقابلہ کرنے والا مشرق میں کوئی نہ تھا، تاتاریوں کی ہمت اور مسلمانوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ایک تاتاری ایک گلی میں گھسا ہے، جہاں سو مسلمان موجود تھے کسی کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی، اور اس نے ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا، اور کسی نے ہاتھ تک نہ اٹھایا، ایک گھر میں ایک تاتاری عورت مرد کے بھیس میں گھس گئی اور تنہا سارے گھر والوں کو قتل کر دیا، پھر ایک قیدی کو جو اس کے ساتھ تھا، احساس ہوا کہ یہ عورت ہے تو اس نے اس کو قتل کیا، بعض اوقات تاتاری نے کسی مسلمان کو گرفتار کیا، اور اس سے کہا کہ اس پتھر پر سر رکھ دے، میں شہر لاکر تجھے ذبح کروں گا، مسلمان سہا پڑا رہا، اور بھاگنے کی ہمت نہ ہوئی، یہاں تک کہ وہ شہر سے شہر لایا اور اس کو ذبح کیا۔

تاتاری یورش عالم اسلام کے لئے ایک بلائے عظیم تھی، جس سے دنیا، اسلام کی چولیس ہل گئیں، مسلمان مہوت و ششدر تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہر اس اور یاس کا عالم طاری تھا،

تاتاریوں کو ایک بلائے بے دریاں سمجھا جاتا تھا، ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابل تیسر بھی جاتی تھی

یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا کہ "إِذَا قِيلَ لَكَ إِنَّ التَّتْرَانِيَّةَ مَوَافَلَا تَصِدَّقْ" یعنی اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو کہیں شکست ہوئی ہے تو یقین نہ کرنا "جن ملکوں یا شہروں کی طرف ان کا رخ ہو جاتا، سمجھ لیا جاتا تھا کہ ان کی شامت آگئی، جان و مال، عزت و آبرو، مساجد و مدارس کسی کی خیر نہیں تھی، تاتاریوں کا رخ کرنا بربادی، قتل عام، ذلت و بے آبروی کا مرادف تھا، ایک مرتبہ تقریباً سارا عالم اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنہ جہاں سوز کی لپٹ میں آ گیا، مورخ ہر طرح کے واقعات پڑھتا اور لکھتا ہے، اس کے سامنے قوموں کی بربادی اور ملکوں کی تباہی کے اتنے مناظر گذرتے ہیں کہ اس کی طبیعت بے حس اور اس کا قلم بیدرد ہو جاتا ہے، لیکن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر جیسا مورخ (جس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ دنیا کی تاریخ لکھی ہے) اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکا وہ لکھتا ہے

"یہ حادثہ اتنا ہلکا اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں

ابھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہوں، واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر سوتا

سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے، کاش میں نہ پیدا

ہوا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا، اور بھولا بسر ہو جاتا، لیکن مجھے بعض دوستوں نے

اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد تھا، لیکن میں دیکھا کہ نہ لکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، یہ وہ حادثہ

عظمیٰ اور مصیبت کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں

سے ہے، لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا اس دم ایسا واقعہ

دنیا میں پیش نہیں آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پانگ بھی کوئی

واقعہ نہیں ملتا، اور شاید دنیا قیامت تک (یا ہجرت ہجرت کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے، ان وحشتوں

نے کسی پرچم نہیں کھایا، انھوں نے عورتوں، مردوں، اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے اور

پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

یہ حادثہ عالمگیر و عالم آشوب تھا یہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم میں پھیل گیا:

”مرصاد العباد کا مصنف جو اس تاتاری حملہ کا شاہد یعنی ہے اور جس کا مولد ہے اور مسکن بہمان اس

تاتاری غارتگری کے نذر ہو چکے تھے، لکھتا ہے:-

”تاریخ شہور سنہ سبع و عشر و ستائے لشکر مخدول کفار تاتار خذلہم اللہ و دمرہم استیلا یا

براں دیار و آن فتنہ و فساد و قتل و ہدم و حرق کہ ازاں ملا عین ظاہر گشت در سیح عصر در زمان کفر و اسلام

کس نشان نہ دادہ است و در سیح تاریخ نیامدہ و قبل ازیں پیشتر چگونہ بود کہ از یک شہرے کہ مولد و منشأ

اسں ضعیف است قیاس کردہ اند کہ بیش ہفت صد ہزار آدمی بقتل آمدہ است و اسیر گشتہ از شہر و

ولایت و فتنہ و فساد آن ملا عین مخازلی بر حملگی اسلام و اسلامیان ازاں زیارت است کہ در حیر عباد

گنجد و اسں واقعہ ازاں شائع تراست در جہاں کہ بشرح حاجت فتد و اگر عیاذ ابالشرفیرت و حمیت

اسلام در نہاد ملوک و سلاطین بچند کہ عہدہ رعایت مسلمانی و مسلمانان در ذمہ ایشان است کہ

”الامیر سراج علی رعیتہ و ہو مسئول عنہم و اریحیت و رجولیت دین و امن ایشان

نگیرد تا با اتفاق جمعیتہ کنند و کمر انقیاد فرمان انفر و اخفا فاق و ثقالا و جاہد و ایامو الیکم

و انفسکم فی سبیل اللہ“ بر میان جان بندند و نفس و مال و ملک در دفع اسں فتنہ نہا کنند بے آنی آید

کہ بیک باہرگی مسلمانی بر انداختہ شود و اکثر بلاد اسلام بر افتاد اسں بقیت رانیز بر اندازند و جہاں کفر گیر و نغوذ

یا اللہ خوف و خطر آن است کہ مسلمانی آن قدر اسے کہ ماندہ بود شوی موائد مادعیان بے معنی چنان بر خیزد

کہ نہ اسم ماند نہ رسم!

تنہا عالم اسلام نہیں اس وقت کی پوری متمدن دنیا تاتاریوں کے حملہ سے لرزہ بر اندام تھی جہاں

ان کے پہنچنے کے بہت کم امکانات تھے، وہاں بھی دہشت پھیلی ہوئی تھی، گین اپنی مشہور کتاب "تاریخ انحطاط و سقوط روم" میں لکھتا ہے:-

"سوڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ

وہ ان کے قوت سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لئے نہیں نکلے"

کیمبرج کی تاریخ عہد وسطیٰ کے مصنفوں نے مغلوں کے اس شدید تصادم کو جس کا محرک چنگیز خاں ہوا

بڑی خوبی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"انسان کی طاقت سے باہر تھا کہ منلوں کو روک سکیں، دشت و صحرا کے تمام خطروں پر وہ غالب آئے

پہاڑ، سمندر، موسمی سختیاں، قحط، وبائیں کوئی بھی ان کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکا، کسی قسم کے خطروں کا انہیں خون

نہ تھا، کوئی قلعہ ان کے حملہ کی تاب نہ لاسکتا تھا، اور رحم کے لئے کسی مظلوم کی فریاد ان پر اثر نہ کرتی تھی، یہاں

میدان تاریخ میں ایک نئی طاقت سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے، یہ طاقت اور زور ایسا تھا جس نے بہت سی ملکی اور

سیاسی قضیوں کا چشم زدن میں فیصلہ کر دیا، اور انہیں اس طرح مٹا دیا، جیسے آسمان زمین پر گر کر سب چیزوں

کو مٹائے، یہ ملکی اور سیاسی قضیے بھی ایسے تھے کہ اگر آفت نازل نہ ہوتی تو آگے چل کر یا تو کسی کے حل کئے وہ حل

نہ ہوتے اور اگر جاری رہتے تو کبھی ختم ہونا نہ جانتے، تاریخ عالم میں اس نئی قوت کا ظہور یعنی ایک شخص واحد کی

یہ قابلیت کہ بنی نوع انسان کے تمدن کو بدل دے، چنگیز خاں سے شروع ہوا، اور اس کے پوتے قبیلای خاں

پر ختم ہو گیا، جس کے زمانہ میں مغلوں کی سالم اور بیدار سلطنت نے تقسیم و تفریق کے آثار ظاہر کرنے شروع

کر دیئے، ایسی طاقت پھر کبھی دنیا کے پردہ پر ظاہر نہیں ہوئی"

بغداد کی تباہی

بالآخر یہ وحشی عالم اسلام کو زیر و زبر کرتے، خون کے دریا بہاتے اور آگ لگاتے ۱۲۵۸ء میں چنگیز خاں

۱۲۵۸ء

کے پوتے ہلاکو خاں کی سرکردگی میں دنیا سے اسلام کے دارالخلافہ اور اس عصر کے سب سے بڑے علمی مرکز اور

متمدن شہر بغداد میں داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، بغداد کی تباہی اور مسلمانوں کے

قتل عام کی تفصیل طویل اور بہت دردناک ہے، کچھ اندازہ ان مورخین کے بیانات سے ہوگا، جنہوں نے

اس حادثہ کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کی تفصیلات دیکھنے والوں سے سنیں، مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں:

”بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا، چالیس دن کے بعد یہ گلزار شہر جو دنیا کا پر رونق

ترین شہر تھا، ایسا ویران و تاراج ہو گیا کہ تھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے، بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے

ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ میلے نظر آنے تھے، ان لاشوں پر بارش ہونی تو صورتیں بگاڑ گئیں اور سارے شہر میں

بدبو پھیلی جس سے شہر کی ہوا خراب ہو گئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر شام تک پہنچا، اس ہوا اور وبا سے

بکثرت مخلوق مری، گرانی، وبا اور مٹا، تینوں کا دور دورہ تھا۔“

شیخ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں:—

”ہلاکو خاں نے خلیفہ بغداد (مستعظم) کو ایک تحیہ میں آمار اور وزیر ابن اسحاق نے علماء و اعیان شہر کو

دعوت دی کہ خلیفہ اور ہلاکو کے صلہ میں گروہ نہیں وہ آئے تو ان سب کی گردن اڑا دی گئی، اسی طرح ایک

ایک گروہ کے بعد دگرے بلایا جاتا اور ان کی گردن اڑا دی جاتی، پھر خلیفہ کے معتزین و مقربین کو بلایا گیا

اور ان کو بھی قتل کر دیا گیا، خلیفہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ اگر اس کا خون زمین پر گرا تو کوئی بڑی

آفت آئے گی، ہلاکو کو توڑ دیا، نصیر الدین طوسی نے کہا کہ یہ سب کچھ اس شکل میں خلیفہ کا خون نہ بہایا جائے، بلکہ

لے البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ایک ایرانی ناضل کی تاریخ، اجاز و آمار خواجہ نصیر الدین طوسی شائع کردہ طہران

یونیورسٹی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اس کتاب کے ایرانی مصنف نے بھی نصیر الدین طوسی کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

طوسی کی سب سے بڑی سیاسی چال ہونا، آخر کار یہ ہوئی، یہ بھی کہ ہلاکو کو اس نے خلافت العباسیہ کی بیخ کنی پر ابھارا اور

خلافہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، ہلاکو خود بھی اپنے بھائی منکوتان کی طرف سے اس پر توجہ دیا، ہلاکو کو باطنیوں کے استعمال

دوسری طرح اس کی جان لی جائے چنانچہ اس کو فرش میں لپیٹ دیا گیا اور ٹھوکروں اور لاتوں سے اس کو ختم کر دیا گیا۔  
بغداد میں ایک ہینڈ سے زیادہ قتل عام جاری رہا، اور صرف وہی بچ سکا جو پھپھارہا، کہا جاتا ہے کہ  
ہلاکونے مقتولین کو شمار کرایا، تو ۱۸ لاکھ مقتول شمار ہوئے۔

عیسائیوں کو حکم دیا گیا کہ علانیہ شراب پیئیں اور سوکھا گوشت کھائیں، اگرچہ رمضان کا زمانہ تھا مگر  
مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ شرکت کریں، مسجدوں کے اندر شراب انڈی لگائی، اور اذان کی ممانعت کر دی گئی،  
یہ وہ بغداد ہے جو (جب سے آباد ہوا) کبھی دارالکفر نہیں ہوا تھا، وہاں وہ واقعہ پیش آیا جو کبھی تاریخ میں پیش نہیں آیا۔  
بغداد ہزار خرابیوں کے باوجود عالم اسلامی کا سب سے بڑا شہر، علوم و فنون کا مرکز، ہزار ہا علماء و صلیحان کا مسکن  
اور دارالخلافت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی آبرو تھا، اس کی بربادی نے تمام حساس مسلمانوں کو ترپا دیا، اور  
ہر طرف اس کا ماتم کیا گیا، شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو بغداد میں طالب علمی کر چکے تھے، اور اس کی رونقیں دیکھے ہوئے

(باقی صفحہ ۳۱۸ کا) کے بعد خلافت عباسیہ کا خاتمہ کرنے، خلیفہ بغداد مستعصم باشر کے پاس ہلاکونے اطاعت کا حکم بھیج دیا، اسلئے ہوتی رہی، مگر کوئی  
قبول نہیں نکلا، اب ہلاکونے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا، بغل نجوم سعد و نحس کے بہت معتقد تھے، حسام الدین نامی ایک سیخوی اس کے دربار میں  
تھا، اس نے کہا کہ حلا بغداد کی یہ گھڑی نحس ہے، اور جب کسی بادشاہ نے خلافت پر ہاتھ ڈالا ہے، تو اسے منہ کی کھانی پڑی ہے، اور  
کسی نہ کسی بلا میں گرفتار ہوا ہے، اگر آپ حاکم کرتے ہیں، تو بادشاہ بند ہو جائے گی، طوفان اور زلزلے آئیں گے، اور ایک عالم ویران ہو جائے گا  
اور سب بڑھ کر یہ کہ بادشاہ (منکو تا آن) ہلاک ہو جائے گا، میں کہ ہلاک ہو کر متروک ہو گیا، ہلاکونے طوسی کی رائے معلوم کی کہ اگر بغداد و حاکم  
حاکمیت پر ہلاک ہونے سے طوسی نے جواب میں کہا، چنانچہ خود شہزادہ ایک بجائے خلیفہ حاکم بن گیا، اور حاکم طوسی اور حسام الدین دونوں کو ہلاک کرنا  
کرنا طوسی نے کہا کہ ہزاروں عساکر لے کر آئے، مگر کوئی فساد ظاہر نہیں ہوا، اگر ہلاکونے کی خبر پتہ چلتی ہے، تو اسے ہلاک کر دو، کیوں کہ اس نے ہلاک کرنا  
وقت امن سے جنگ کی، اور اس نے قتل کو زیادہ متوکل کو اس کو لڑا اور غلاموں کے اتفاق کو کھلا دیا، ہلاکونے کو ہلاک کرنا اور غلاموں کو ختم کرنا  
مگر کوئی زلزلہ اور طوفان نہیں آیا، حاکم نے ۱۸ لاکھ آبادی میں سے کچھ نہیں رہے، ہلاکونے نے مقتولین کی تعداد اس کم بیان کی ہے

تھے، ایک دل دوزم تھیہ کہا جس میں اس وقت کے تمام مسلمانوں کے زخمی دلوں کی ترجمانی ہے، اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

برزوال ملک مستعصم امیر المومنین	آسماں راتق بود گر خون ببارد بر زمین
سر بر آوردین قیامت در میان خلق میں	اے مجذگ قیامت می بر آری سر ز خاک
ز استان بگذشت و مارا خون دل آراستیں	نا زمینان حرم را خون خلق نا زمین
در خیال کس نگشتی کا پنچاں گرد و چنسیں	زیہار از دو گیتی و انقلاب روزگار
قیصراں روم سر پر خاک خاقاں بر زمین	دیدہ پروار لے کہ ویدی شوکت بیت الحرام
ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جسیں	خون فرزند ان عم مصطفیٰ شدر نختہ
خاک نخلستان بطجارت کتد با خون عجیبیں	دجلہ خوننا بست زیں پس گر بند سر پر شست
می تو اں دانست بر رویش ز برج افتادہ چیں	رفے در یاد ہم آمد زیں حدیث ہولناک
کتریں دولت مرایشاں را بہشت برترین	نوح لائق نیست بر خاک شہیداں از انکہ بہت
مہربان را دل بسوزد در فراق نا زمین	لیکن از روی مسلمانان و راہ مرحمت

بغداد کے بعد تاتاریوں نے حلب کا رخ کیا، اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ بھی بغداد کا سا سلوک کیا، وہاں سے دمشق کی طرف بڑھے اور جہادی الاولیٰ ۶۵۸ھ میں اس پر قبضہ کر لیا، شہر کے عیسائیوں نے تاتاری فاتحوں کا شہر سے نکل کر استقبال کیا اور ان کو تحائف پیش کئے، اور ان کے حاکم کے پاس سے فرمان لے کر آئے اور شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے، ابن کثیر جو خود دمشق کے رہنے والے ہیں اس واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں جس سے مسلمانوں کی بے بسی، ذلت و کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے:-

عیسائی باپ تو لے داخل ہوئے، وہ صلیب کو لوگوں کے سروں پر بند کئے ہوئے تھے اور اپنا مخصوص نعرہ

لگا رہے تھے، وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ دین برحق یسوع مسیح کا دین غالب آیا، اور اسلام اور اہل اسلام کی صاف صاف مذمت کرتے تھے، ان کے ہاتھوں میں شراب کے برتن تھے، جس مسجد کے پاس سے گزرتے، اس کے پاس شراب چھڑکتے، کچھ شراب کی بوتلیں تھیں، جن کو لوگوں کے چہروں اور کپڑوں پر چھڑکتے تھے، گلیوں اور بازاروں میں جو شخص بھی گزرتا، اس کو حکم دیتے تھے کہ صلیب کی کھڑے ہو کر تعظیم کرے، مسلمان یہ نقشہ دیکھ کر جمع ہو گئے، اور ان کو دھکا دے کر کنوئیر مریم تک پہنچا دیا، وہاں عیسائی مقرر نے کھڑے ہو کر مسیحیت کی تعریف میں تقریر کی، اور دین اسلام، اور اہل اسلام کی مذمت کی:

ابن کثیر ذیل المرأة کے حوالہ سے آگے لکھتے ہیں:-

”عیسائی جامع مسجد میں شراب لئے ہوئے داخل ہوئے، ان کی نیت تھی کہ اگر تاتاریوں کا زیادہ رہنا ہوا، تو وہ بہت سی مسجدوں کو گرا دیں گے، جب شہر میں یہ واقعات پیش آئے تو مسلمان قاضی، شاہ اور علماء جمع ہو کر قلعہ میں گئے، اور تاتاری حاکم قلعہ ایل بیان سے شکایت کی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بڑی ذلت سے نکال دیئے گئے، اور عیسائیوں کے سر پر آوردہ لوگوں کی بات سنی گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“

شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا، اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا، جو ان کی غارتگری سے بچا ہوا تھا، سلطان مصر الملک المنظر سیف الدین قطر کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے، اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے، اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے، چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۵ھ کو عین جاہلوت کے مقابلے پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا، اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی، وہ بڑی طرح سے بھاگے مصریوں نے ان کا تعاقب کیا، اور کثرت سے ان کو قتل کیا، اور بڑی تعداد میں گرفتار۔

سیوطی تاریخ ائخلاف میں لکھتے ہیں:-



تاتاریوں کو شرمناک ہزیمت ہوئی، اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں نے ان پر فتح پائی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا، اور وہ اس طرح سرا سیمہ ہو کر بھاگے کہ لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئیں، وہ آسانی سے ان کو پکڑ لیتے تھے اور لوٹتے تھے۔

عین جاہوت کے معرکہ کے بعد سلطان الملک الظاہر سبیرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سائے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا، اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں!

## تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام

قریب تھا کہ سارا عالم اسلام اس سیلاب بلا میں بہ جائے اور جیسا کہ اس وقت کے اہل نظر اور درد مند مسلمان مصنفین نے خطرہ ظاہر کیا ہے، اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جائے کہ دفعۃً تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام شروع ہو گئی، اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور مسلمان بادشاہ نہ کر سکے، وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام دیا، اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے اس ناقابلِ تسخیر قوم کا اسلام سے سحر اور مسلمانوں کے فاتح کا اسلام سے فتوح ہو جانا ہے، تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق و باد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا، اور عالم اسلام کو بزورِ شمشیر فتح کر لینا، اتنا عجیب واقعہ نہیں، اس لئے کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان بیماریوں، کمزوریوں، کاشکار تھا، جو بالعموم تمدن و تہذیب کی انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہوا کرتی ہیں، اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں، اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی اور خون خوار خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معمایہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں

یہیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست و پا مسلمانوں کے دین کی حلقہ گمبوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادی اور سیاسی طاقت کھو چکا تھا، اور جس کے پیروؤں کو تاریخی سخت ذلت اور تحارت کی نظر سے دیکھتے تھے، پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوتِ اسلام (PREACHING IN ISLAM) میں استنجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکسترے پھراٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنہوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت شکلیں پیش آئیں کیونکہ دو مذہب اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی جس وقت بد مذہب اور عیسائی مذہب اور اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنہوں نے ان تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پائمال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں“

”اسلام کے لئے ایسے وقت میں بد مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا، اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی، مغلوں کے طوفانِ ہلاکت سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا، وہ مشہور و معروف شہر جو ایک زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے اور جہاں ایشیا کے ارباب علم و فضل آباد تھے، اکثر جلا کر خاک کر دیئے گئے تھے، مسلمانوں کے عالم اور نقیہ یا تو قتل کئے گئے، یا ان کو غلام بنایا گیا، خانانِ مغل جو اسلام کے سوائے اور سب مذہبوں پر مہربان تھے، اسلام کے ساتھ مختلف درجہ کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے، چنگیز خاں نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شرع کے مطابق

لے دعوتِ اسلام (مترجم مولوی عنایت اللہ) ص ۲۴۱، ۲۴۲۔ یہ مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ چینی تاشے والے جب پردہ پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں، تو ایک تصویر میں سفید رازھی کا ایک بڑھا آدمی آتا ہے جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہنچایا ہے (ہر دور تھ پہلی جلد ص ۱۵۹)۔

ذبح کریں ان کو قتل کر دیا جائے، اسی حکم کو تو بلالی خان نے اپنے زمانہ میں از سر نو جاری کیا، اور اس کی پیروی کے لئے مخبر اور مخبروں کے لئے انعام مقرر کئے، اور اس طرح سات برس تک مسلمانوں کو سخت سے سخت آزار پہنچائے، مفلسوں نے اس موقع پر دولت جمع کر لی، اور غلاموں نے آزاد ہونے کے لئے آقاؤں پر ذبیحہ کا الزام لگایا، گیوک خاقان کے عہد میں (۱۲۲۶ء تا ۱۲۳۵ء) جس نے کل انتظام سلطنت دو عیسائی وزیروں کے سپرد رکھا تھا، مسلمانوں کو سخت آذیتیں پہنچائیں، اور غو خان نے بھی جو چوتھا ایلیخان (۱۲۸۳ء تا ۱۲۹۱ء) ہو مسلمانوں پر ظلم کئے، اور عدالت اور مال کے محکموں میں جس قدر سامیوں کے پاس تھے وہ خالی کرالیں، اور ان کا دربار میں آنا بند کر دیا، باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں، انہی مسلمانوں کا مذہب قبول

کیا جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندنا تھا۔

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے، اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں، اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا، ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے، جن مخلصین نے اس خون آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کا نام دنیا کو معلوم ہے، مگر ان کا یہ کارنامہ کسی اسلامی کارنامہ سے کم نہیں، اور ان کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انھوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی تولیت میں دے دیا، جو خدائے واحد کی پرستار اور رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی علمبردار تھی۔

چنگیز خاں کی سلطنت انتقال کے بعد اس کے چار بیٹوں کی چار شاخوں میں بٹ گئی تھی، ان چاروں شاخوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی اور تاتاری خاقان اور ان کی دعوت و تبلیغ اور اثر سے تاتاری قوم مسلمان ہونا شروع ہو گئی، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر تقریباً ساری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی۔

۱۷۰۰ء (جس وقت دیکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہو گیا، اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہنچا

۱۷۰۰ء (تاریخ نسوخت کر دیا گیا) ۱۷۰۰ء (جس وقت دیکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہو گیا، اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہنچا

۱۷۰۰ء (تاریخ نسوخت کر دیا گیا) ۱۷۰۰ء (جس وقت دیکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہو گیا، اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہنچا

پروفیسر آرنلڈ نے "دعوتِ اسلام" میں اس کے جستہ جستہ واقعات لکھے ہیں، چنگیز خاں کے بڑے بیٹے جو جی خاں کی شاخ میں جو سلطنت کے مغربی حصہ سیراد اور اپر حکمران تھے، اشاعتِ اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:-

"مغلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا، وہ برک خاں تھا، جو ۱۲۵۶ء سے ۱۲۶۴ء تک سیراد اور ادا کا خان رہا، اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت لکھا ہے کہ ایک ن وہ ایک کارواں میں پہنچا، جو بخارا سے آتا تھا، اس میں دو مسلمان تاجر تھے، جن کو برک خاں الگ لے گیا، اور اسلام کے تعلق کچھ سوالات ان سے کئے، مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام و ارکان اس خوبی سے بیان کئے کہ سیراد اور ادا کو مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا، وہ اسلام لایا، اس کا حال برک خاں نے اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا، اور اس کو بھی اسلام قبول... کرنے کی ہدایت کی، اس کے بعد برک خاں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا، اسلام قبول کرنے کے بعد برک خاں نے سلطان مصر رکن الدین بیریس سے مصاحبت کر لی، اس مصاحبت کا باعث خود سلطان مصر اس طرح ہوا کہ اس نے سیراد اور ادا کے دو مغلوں کی نہایت خاطر مدارات کی، ان مغلوں کا قصہ یہ ہے کہ جب خان سیراد اور ادا اور ہلاکو خاں فاتح ہند میں عداوت زیادہ بڑھی تو یہ دو مغلوں جو ہلاکو خاں کی فوج میں بھرتی تھے، بھاگ کر شام کے ملک میں چلے آئے اور یہاں سے وہ بڑے اعزاز کے ساتھ قاہرہ پہنچائے گئے، جہاں وہ باہر سے ان کو اسلام قبول کرنے کی ہدایت ہوئی، سلطان رکن الدین نے ان مغلوں میں سے دو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے چند سفیر کئے، اور برک خاں کو ایک خط ان کی معرفت روانہ کیا، جب یہ لوگ سیراد اور ادا سے قاہرہ کو واپس آئے تو سلطان کو خبر دی کہ برک خاں کے اسیروں کے ہاں اور ایک شہزادی کے ہاں ایک ایک امام اور موذن مقرر ہے، اور بچوں کو کتب میں قرآن پڑھایا جاتا ہے، سلطان سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ہم قاہرہ سے

۱۲۶۳ء میں نجم الدین مختار الزاہدی نے برک خاں کے لئے ایک کتاب لکھی جس میں رسالت کو برہان ثابت کیا اور مسلمانوں اور صیائیوں کے

مذہب سے مناظروں کا حال لکھا، ۱۲۶۳ء ابو الغازی قوم ۱۲۶۳ء مقرر یومی قوم ۱۲۶۳ء ایضاً ۲۱۵

روانہ ہوئے تھے تو راستہ میں یرک خاں کے سفیر نے جو سلطان مصر کی خدمت میں اطلاع کے لئے حاضر ہوئے تھے کہ یرک خاں اور اس کی رعایا مسلمان ہو گئی ہے، غرض جب سلطان رکن الدین اور یرک خاں میں رسم اتحاد پیدا ہوئی تو سیراد اور اے بہت مغل مصر میں آئے، جہاں ان کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوئی۔  
تاتاری سلطنت اور خاندان چنگیز خاں کی دوسری شاخ دولت ایلیخانہ میں اشاعتِ اسلام کے متعلق آرنلڈ لکھتا ہے:-

”ایران میں جہاں ہلاکو خاں دولت ایلیخانہ کا بانی ہوا، ترکوں میں اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی (ہلاکو خاں کا بیٹا کوردار جو اپنے بھائی باقا خاں کا جانشین ہوا، دولت ایلیخانہ کا پہلا بادشاہ تھا، جس نے اسلام قبول کیا، ایک عہد نویس عیسائی مصنف نے لکھا ہے کہ کوردار کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی، بچپن میں اس کو اصطباغ ملا تھا، اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا، لیکن کوردار جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے اثر و صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، اور سلطان محمد (یا احمد) نام رکھا، اور جس قدر ہو سکا اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کر لیں، اور اس کے لئے انعام و اکرام اور اختیار اور عزت لوگوں کو بخشی، یہاں تک کہ اس کے زمانہ میں بہت تاتاری مسلمان ہو گئے، اس بادشاہ نے سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر ذیل کے مراسلے سے بھیجی۔

”خدا کی قوت اور قانآن کے اقبال سے سلطان احمد کا فرمان بادشاہ مصر کے نام، بعد تمہید کے واضح ہو کہ خدا نے اپنی عنایت اور ہدایت کی روشنی سے آغاز نوجوانی کے زمانہ میں ہم کو اپنی الوہیت اور وحدانیت کا اقرار کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنے اور اپنے دوستوں اور نیک بندوں کی نسبت خوش اعتقاد رہنے کی ہدایت کی تھی، وہ جس کسی کو ہدایت پر لانا چاہتا ہے، اس کے دل کو مذہبِ اسلام قبول کرنے کے لئے

۱۸۸۸ء تقریبی ۱۸۸۸ء ایضاً ۲۲۲ء و صاف نے اس بادشاہ کو مسلمان ہونے سے پہلے کوردار اور مسلمان ہونے کے بعد احمد

لکھا ہے۔ ۱۸۸۸ء (راوی بیوٹوم ۲ ص ۶)

کھول دیتا ہے ہم اس وقت سے آج تک دین کا بول بالا کرنے اور مذہب اسلام اور مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کرنے پر اہل رہے یہاں تک کہ والد بزرگوار اور برادر بزرگ کی طرف سے حکمرانی کی نوبت ہم تک پہنچی اور خدانے اپنی مہربانی سے ہماری امیدوں کو پورا کیا، اور حکومت و سلطنت ہم کو عنایت کی، پھر قریبائی (کورٹائی) مبارک میں جس سے وہ مجلس مراد ہے جس میں تمام بھائی بند اور شہزادے اور بڑے بڑے امیر اور فوج کے سردار مشورہ کرنے کے لئے بیٹھے ہیں، سب نے مل کر یہ اقرار کیا کہ ہمارے برادر بزرگ کے حکم سے فوج کشی کو جاری کیا جائے اور ہماری فوجوں میں سے جن کی کثرت سے زمین باوجود وسیع ہونے کے تنگ ہے اور جن کی صولت اور ہیبت سے سب کے دل کانپتے اور تھراتے ہیں، ایک جم غفیر کو اطراف میں روانہ کیا جائے اور یہ فوج کشی ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ ہو جس کے سامنے بلند پہاڑ جھک جاویں، اور سنگ خارا کے چٹان نرم پڑ جاویں، ہم نے اس مقصد پر غور کیا، جس پر ان کے ارادے پختہ اور ان کی رائیں متفق تھیں، اور ان سب کا خلاصہ جو معلوم ہوا، وہ اس عام نیکی کے خلاف تھا، جس کے جاری کرنے کا ہم ارادہ رکھتے تھے، اور جس سے مراد یہ ہے کہ شعار اسلام کو زندہ کیا جائے، اور جو احکام ہماری طرف سے جاری ہوں، ان سے خونریزی موقوف ہو، اور دنیا کی مصیبت کم ہو، اور دنیا کے اطراف میں امن و امان کی ہوا چلے اور تمام شہروں کے حاکم ہماری شفقت اور مہربانی سے آرام پاویں، کیونکہ ہم خدا کی تعظیم کرتے ہیں، اور خدا کی مخلوق پر مہربان ہیں، اس لئے خدانے ہمارے دل میں الہام کیا کہ ہم مشتعل آگ کو بجھائیں، اور فتنہ و فساد کو فرو کریں، اور جن لوگوں نے ہمارے دی ہے، ان کو اس تدبیر سے مطلع کریں، جس سے دنیا کی بیماریاں اور تکلیفوں کے دور ہونے کی امید ہے، اور جس کو سب پہلے عمل میں لانے کی سب سے آخری علاج سے باز رہنے کا خدانے ہم کو ہدایت کی ہے، اس لئے ہم پیکاروں کو جنبش میں لانے، اور کمالوں پر چلے چڑھانے میں جلدی نہیں کرتے ہیں، اور جب تک حق بات ظاہر نہ ہو، سجت قومی نہ ہو، ہم اس امر کی اجازت نہیں دیتے، شیخ الاسلام قدوة العارفين کی نصیحت سے جو امور مذہبی میں ہمارے سب سے بہتر دگدگار ہیں، ہمارے اس ارادہ کو بونلاج و بہودی کی خواہش پر پٹی ہے، اور اس رائے کو جس سے کامیابی کی امید ہے، پختہ اور مصمم کر دیا، چنانچہ ہم نے یہ فرمان

جاری کیا، جو اسنے والوں کے لئے خدا کی رحمت اور نمانے والوں کے لئے خدا کا عذاب ہے، ہم نے اس فریق کے ماننے والوں کے لئے قاضی القضاة قطب الدین شیرازی اور تائب بہار الدین کو جو اس سلطنت کے علمائے روزانہ کیلئے تھے، تاکہ لوگوں کو ہمارے طریقے سے واقف کریں اور تمام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے جو بات ہمارے دل میں پوشیدہ ہے، سب اس سے آگاہ ہوں، نیز ان سب لوگوں کو اس بات سے مطلع کریں کہ خدا نے ہم کو بصیرت و ہدایت عطا کی ہے اور اسلام ان تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے، جو مسلمان ہونے سے پہلے وقوع میں آئے ہوں، اب تو خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم حق کی اور اہل حق کی پیروی کریں، پس اگر لوگوں کے دل ایسی دلیل کی جستجو میں ہیں جن سے وہ ہم پر بھروسہ کر سکیں، اور ایسی حجت طلب کرتے ہیں جس سے کامیابی کی امید کر سکیں، تو وہ ہماری ان تمام فضیلتوں پر نظر ڈالیں، جو دنیا میں عام طور پر مشہور ہو چکی ہیں، کیونکہ ہم نے خدا کی عنایت سے دین کے نشانوں کو بلند کیا ہے اور ہر ایک حکم جاری کرنے میں اس امر کو پیش نظر رکھا ہے اور شرع محمدی کے قوانین کو بلحاظ ان کی عظمت اور بزرگی کے عین مقتضائے انصاف پر جاری کیا ہے، ہم نے تمام رعیت کے دلوں کو خوش کیا ہے اور جن سے پہلے کوئی برائی یا خطا سرزد ہوئی تھی، ان سب کو یہ کہہ کر معاف کر دیا ہے کہ خدا بھی تمہاری اگلی خطاؤں کو معاف کرے، ہم نے مسلمانوں کے اوقات کی جن میں مسجدیں اور مقبرے اور مدرسے شامل ہیں، اصلاح کی ہے اور تمام خیرات خانوں اور مہمان سراؤں کو جن کے نشانات مٹ گئے تھے دوبارہ آباد کیا ہے اور اوقاف کی آمدنی کو ان کے قدیم دستور اور وقت کرنے والوں کے شرائط کے موافق حقداروں تک پہنچا دیا ہے، ہم نے حکم دیا ہے کہ ہمارے حکام حاجیوں کے معاملہ کو بہتر نشان بھیس، اور ان کے لئے سامان سفر مہیا کریں اور جن رستوں سے وہ سفر کرتے ہیں، ان کو آباد و بے خطر رکھیں اور حاجیوں کے قافلوں کو بآرام تمام روانہ کریں، ہم نے تمام سوداگروں کو جو ملک میں آمد و رفت رکھتے ہیں، پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنے طریقے سے جس طرح چاہیں، سفر کریں اور فوج اور فراغول اور شمنوں کو جو ملک کے اطراف میں مقرر ہیں، سخت ممانعت کی ہے کہ وہ سوداگروں کی آمد و رفت میں کسی طرح کی مزاحمت کریں، تاکہ شہر اور ملک

آباد ہوں، قتلے اور فساد فرود ہوں نیز تلواریں میان میں رہیں اور تمام باشندے آرام و آسائش سے بسر کریں اور  
مسلمانوں کی گردنیں ذلت و خواری کے طوق سے نکل جائیں!

”تاریخ مغلیہ کے ناظرین کو ان صد ہا ظلموں اور متواتر کشت و خون کے ہنگاموں کو پڑھنے کے بعد جو مثل  
اور تاتاریوں نے برپا کئے، اس فرمان کے سٹالو کرنے سے بہت راحت معلوم ہوئی ہوگی، اور تعجب ہوا ہوگا کہ  
ایک مثل فرمانروا کی زبان سے بھی اس قدر فیاضی اور انسانی ہمدردی کے خیالات ادا ہوئے!

”۱۲۸۴ء میں تگودار احمد کے خلاف ایک بغاوت برپا ہوئی جس کا سرغنہ ازغون خاں تھا، تگودار کو اس نے  
قتل کیا، اور خود مالک تخت و تاج بن گیا، ازغون کے عہد حکومت میں (۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۱ء) جو چند سال تک  
جاری رہا، عیسائیوں پر پھر سلطنت کی طرف سے مہربانی ہوئی اور مسلمانوں کو سختیاں اٹھانی پڑیں اور سرکاری  
عہدوں اور نوکریوں سے وہ برطرف کر دیئے گئے، ۱۲۹۵ء تک تگودار کے جانشین اپنے قدیم مذہب شاہان  
کے پیرو رہے، لیکن ۱۲۹۵ء میں البتہ ان کا ساتواں بادشاہ غازان جو خاندان الیخانہ کا سب سے زیادہ باعرب  
اور مسطوت بادشاہ ہوا، مسلمان ہو گیا، اور اس نے اسلام کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا۔

مسلمان ہونے سے پہلے سلطان غازان کی تعلیم و تربیت بد مذہب پر ہوئی تھی اور خراسان میں اس  
بادشاہ نے بدھوں کے لئے مندر تعمیر کر دیئے تھے، بد مذہب کے عالموں کی صحبت سے وہ بہت خوش ہوتا  
تھا، اور یہ لوگ جس وقت دولت مغلیہ کو عروج ہوا تھا، ایران میں کثرت سے چلے آئے تھے، سلطان غازان  
کو مختلف مذہبوں کی تحقیق و تفتیش کا بڑا شوق تھا، اور ہر مذہب کے عالموں سے وہ مذہبی مباحثہ کرتا تھا،  
غازان کا وزیر اور اس کے عہد کا مورخ حکیم رشید الدین تھا، جس کا یہ خیال غالباً صحیح معلوم ہوتا ہے کہ  
سلطان غازان سچی نیت اور عقیدہ سے مسلمان ہوا، اور اپنے تمام زمانہ بادشاہی میں وہ اسلام کا نہایت پابند رہا۔

۱۴ دسمبر ۱۲۲۳ء ۱۲۲۳ء دعوتِ اسلام ۲۵۱، ۲۲۸ء ۵۳ دے گبن ج ۳ ۲۶۵، ۱۳۶۳ء ۵۴ دہوسن قوم ۱۲۵۴ء

۵۵ ایضاً ۲۶۵ ۵۶ دعوتِ اسلام ۲۵۳



مورخ ابن کثیر نے بھی غازان کے اسلام لانے کا ذکر ۶۹۴ھ کے واقعات میں بڑی مسرت کے ساتھ کیا ہے اور ان کے اور دوسرے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سہرا نیک دل مسلمان ترک میر تو زون کے سر ہے جن کی تلقین اور سعی سے تاتاری سلطان نے اسلام قبول کیا، ابن کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں :-

”اس سال چنگیز خاں کا پرپوتا غازان بن ارغون بن ایغابن تولی بن چنگیز خاں تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور ایرتوزون رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرت باسلام ہوا، اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا، اس روز سونا چاندی اور سوتی لوگوں کے سر پر بچھا دیکئے گئے، اس نے اپنا نام محمود رکھا، اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی، بہت سے مندر اور گرجے گرا دیئے گئے، اور ان پر جزیرہ مقرر کیا بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں اور انصاف کیا گیا، لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں اور ہیکل (؟) دیکھے اور اللہ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا“

”آرنلڈ لکھتا ہے کہ ۱۲۰۳ء میں غازان کا بھائی سلطان بن محمد خدا بندہ کے نام سے تخت ایران پر بیٹھا، اس سلطان کی ماں عیسائی تھی اور چین میں اس کی تعلیم و تربیت بھی عیسوی طریقہ سے ہوئی تھی اور نکوس کے نام سے اس نے اصطباغ پایا تھا، لیکن ماں کے مرنے پر وہ اپنی بیوی کے کہنے سے مسلمان ہو گیا، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ نکوس خاں یعنی سلطان خدا بندہ کے مسلمان ہونے سے مغلوں میں بڑا اثر پیدا ہوا، غرض اس زمانہ سے قلم و ایغانیہ میں اسلام سب مذہبوں پر غالب آ گیا“

اس خاندان کی تیسری شاخ میں جو بلاد متوسطہ پر قابض تھی اور جس کا بانی چغتائی بن چنگیز خاں تھا، اشاعتِ اسلام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے :-

”بلاد متوسطہ میں جو چغتائی ابن چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حصہ میں آئے تھے، دعوتِ اسلام کے حالات

۱۲۰۳ء آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۱۲۰۳ء البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۳ ص ۳۴۴

۱۲۰۳ء ابن بطوطہ ج ۲ ص ۵۴۰ ۱۲۰۳ء دعوتِ اسلام ص ۲۵۴

کا پتہ کم چلتا ہے، اس سلسلے میں پہلا بادشاہ جس کو نور اسلام کی برکت ملی، وہ براق خاں تھا جو چغتائی خاں کا پرپوتا تھا، اور جس نے تخت نشین ہونے کے دو برس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین (۱۲۶۶ء تا ۱۲۷۱ء) اپنا نام رکھا، لیکن یہاں شروع زمانہ میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی، چونکہ براق خاں کے مرنے کے بعد جو مغل مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا، اور چودہویں صدی عیسوی سے پہلے اس حالت کی اصلاح نہ ہو سکی، البتہ طر مشرین خاں جس نے ۱۳۲۲ء سے ۱۳۳۳ء تک سلطنت کی، جس وقت مسلمان ہوا، تو چغتائیہ مغلوں نے بالعموم اسلام اختیار کر لیا، اور جب ایک فوج انھوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا تو وہ مضبوط دل سے اس مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور مذہبوں پر غالب آنا جو حریت مقابل تھے، یقینی امر نہ تھا، کیونکہ طر مشرین کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیئے، اور جب تک کاشغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم و ضعف سے خود مختار ہو گئی تھی، اسلام کی حمایت نہ اٹھا، اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی، سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خاں (۱۳۶۳ء تا ۱۳۷۰ء) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کاشغر میں آئے، اور انھوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا، شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گذر ہوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکلیں کسو کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے، شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اہلبی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی ممانعت بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے، اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے، یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا، اور

حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے اس کو اب سمجھاؤ دین برحق سے تمہارا کیا مطلب ہے میں کر شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا اب موم کی طرح نرم ہو گیا شیخ نے حالت کفر کا ایسا ہیبت نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہو گیا لیکن اس نے کہا کہ اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا اس لئے کچھ عرصہ کے لئے تم سکوت کرو جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا چنتا یہ سلطنت اب حصہ ہو کر چھوٹی چھوٹی عملداروں میں تقسیم ہو گئی تھی اور برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عملداروں کو شامل کر کے پھر قلم و چنتا کی مثل ایک سلطنت قائم کرے اس عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن کو چلے گئے اور یہاں سخت بیمار پڑے جب موت کا وقت قریب آیا تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ ہوگا تم اس وقت اس کے پاس جانا اور میرا سلام پہنچا کر بے خوف و خطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا چند سال کے بعد تغلق نے باپ کا تخت حاصل کر لیا تو ایک دن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہنچا کہ باپ کی وصیت کو پوری کرے لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضور ہی نہ ہوئی آخر کار اس نے مجبور ہو کر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصباح تغلق کے خیمہ کے قریب ڈان کہنی شروع کی تغلق کی جب نیند خراب ہوئی تو غصہ ہوا اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا تغلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا وہ کلہ پڑھ کر مسلمان ہوا اس کے بعد اس نے اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی اور اس کے زمانہ میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہو گیا جو چغتائی ابن چنگیز خاں کی اولاد کے تسلط میں رہتے تھے یہ

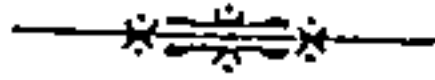
بعض ترکی مورخین کی تاریخوں میں یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ تغلق تیمور نے اپنے شکاری

کی طرف اشارہ کر کے کمال حقارت سے شیخ جمال الدین سے پوچھا کہ یہ بہتر ہے کہ تم بہتر ہو؟ شیخ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ کتاب تعلق تیمور کے دل میں یہ بات چھب گئی اور اس نے اس کی تفصیل دریافت کی اور پوچھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی اس پر تعلق تیمور نے اس سے خواہش کی کہ اس کی تخت نشینی کے بعد وہ اس کو اپنی زیارت سے مشرف کریں اور پھر وہ واقعہ پیش آیا، جو اوپر مذکور ہوا، پھر حال اتنا محقق ہے کہ تعلق تیمور کے اسلام لانے اور بالواسطہ کا شغز اور سلطنت چغتائی میں اسلام کی اشاعت کا ظاہری سبب شیخ جمال الدین ہیں، حتیٰ کہ دل سے نکلے ہوئے ایک فقرہ نے اور ان کی قوت ایمانی اور اخلاص و درو نے وہ کام کیا، جو ہزاروں تقریریں اور لاکھوں شمشیریں نہیں کر سکتیں "جَزَاةُ اللّٰهِ عَنِ الْاِسْلَامِ دُنْيَا خَيْرٌ مِنَ الْجَزَاءِ" چنگیز خاں کی چوتھی شاخ کے متعلق (جس کا بانی اوگتائی خاں تھا، اور جس میں منگو خاں و قوبلای خاں جیسے نامور فرمانروا گزے ہیں اور جو تاتاری سلطنت عظمیٰ کے مشرقی حصہ پر قابض تھی) آرٹیکل لکھتا ہے:-

تمام سلطنت منلیہ میں ہر جگہ ایسے مسلمان موجود تھے جو منکرین کو خفیہ طور پر مسلمان کر لیتے تھے، اوگتائی خاں (۱۲۲۹ء-۱۲۲۷ء) کے عہد میں حاکم ایران گزنائی کا حال لکھا ہے کہ وہ اول بدھ مذہب کا پیرو تھا، پھر اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، تیمور خاں کے زمانہ میں (۱۳۲۹ء-۱۳۳۱ء) خان اندرانے جو قوبلای خاں کا پوتا تھا، اور چین میں صوبہ کانسوہ کا حاکم تھا، اسلام قبول کیا، اور ٹانگوت میں اس نے بہت لوگوں کو مسلمان کیا، بلکہ جو فوج اس کے تخت میں تھی اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہو گئے، تیمور خاں نے اندرانے کو اپنے دربار میں بلایا اور کوشش کی کہ اندرانے کو اسلام چھوڑ کر بدھ مذہب قبول کرے، لیکن اس نے انکار کیا اور قید میں بھیج دیا گیا، تھوڑے عرصہ کے بعد اندرانے قید سے رہا کر دیا گیا، کیونکہ ٹانگوت کی رعایا جس کو اپنے حاکم کے ساتھ بہت الفت تھی، بغاوت پر آمادہ ہو چکی تھی۔

غرض اس طرح پوری تاتاری قوم جس نے پورے عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا تھا اور جس کے سامنے کوئی اسلامی طاقت ٹھہر نہیں سکتی تھی، چند برس کے عرصہ میں اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی، اور اسلام نے دوبارہ اس کا ثبوت دیا کہ اس کو اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دام محبت میں اسیر کرنے کی عجیب و غریب قدرت حاصل ہے، تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے، بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، بڑے بڑے عالم اور فقیہ اور بڑے بڑے باخدا اور ویش پیدا ہوئے، اور انھوں نے بہت سے نازک موقعوں پر اسلام کی پاسبانی کا فرض بھی انجام دیا۔

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے  
پاساں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے



## مولانا جلال الدین رومیؒ

### علم کلام و عقلیت کا بحران

ساتویں صدی میں سارا عالم اسلام علم کلام کے مسائل و مباحث سے گونج رہا تھا، جو شخص علم کلام کی اصطلاحات اور معتزلہ و اشاعرہ پھر اشاعرہ و حنابلہ کے مختلف ذمہ مسائل سے واقف نہیں ہوتا تھا، وہ پڑھا لکھا انسان نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی صدی کی ابتدا میں (۶۰۶ھ میں) امام رازی نے انتقال کیا تھا، جنہوں نے علم کلام کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا تھا، کہ اس کی صدائے بازگشت کے علاوہ کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تھی، عالم اسلام کے علمی و فکری حلقے استدلال و قیاس کے خوگر تھے، کسی شے کا وجود، کسی چیز کی حقیقت، دین کا کوئی عقیدہ اس وقت تک قابل تسلیم نہیں سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ اس کو عقلی دلائل، منطقی ترتیب اور فلسفیانہ مقدمات سے ثابت نہ کر دیا جاتا۔

منظلمین اشاعرہ نے عام زندگی میں اگرچہ معتزلہ اور فلاسفہ پر فتح حاصل کر لی تھی، اور ان کے علم کلام کے مقابلہ میں اعتزال و فلسفہ کی آواز پست ہو چکی تھی، لیکن اعتزال کی روح اور عقلیت خود اپنے فاتحین کو مفتوح بنا چکی تھی، اشاعرہ کے علم کلام میں معتزلہ کی عقلیت پرستی کی روح سرایت کر گئی تھی، انہوں نے بھی عقل کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ وہ ذات و صفات کے نازک اور ماورائے عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل و تفصیلات میں آزادانہ بحث کر سکے، انہوں نے بھی ظواہر و محسوسات کو بڑی حد تک

فیصلہ کن سمجھ لیا تھا، انہوں نے بھی دینی مسائل کے اثبات اور حقائق اشیاء کے وجود کی بنیاد استدلال و قیاس پر رکھی تھی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ تمام عالم اسلام پر ایک لفظی و استدلالی ذوق غالب تھا، علم کلام نقل و نقل ہو کر رہ گیا تھا، جس میں عرصہ سے کوئی جدت پیدا نہیں کی جاسکتی تھی، اس کے حلقہ میں مدتبائے دراز سے امام ابو الحسن اشعری یا حجة الاسلام غزالی صاحب تہذیب و ذہن و طباع پیدا نہیں ہوئے تھے، قیاس و استدلال کے غلو نے دماغوں کو خواہ کتنی بولانی بخششی ہو، دلوں کی حرارت اور یقین کی روشنی کو نقصان پہنچایا تھا، متکلمین نے اپنی قوت استدلال اور مقدمات و نتائج کی آراستگی سے معترضین کی زبانوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ قلوب کو سکینت و ایمان و اہل شک و ارتباب کو یقین و اذعان عطا کرنے میں ناکام رہے تھے، ان کے اس طریق بحث و استدلال نے دماغوں اور دلوں میں بیسیوں گرہیں ڈال دی تھیں، جن کو علم کلام سلجھانے سے قاصر تھا، وجدان "جو علم و یقین کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے، علم کلام کی مسلسل بے اعتنائیوں بلکہ تحقیر کی وجہ سے بالکل معطل ہونا جا رہا تھا، ظاہری جو اس خمسہ کے علاوہ کسی اور باطنی حاستہ کا وجود تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا، اس لئے بہت سے وہ مسائل و حقائق جو حاستہ باطنی کے بغیر محسوس و معلوم نہیں کئے جاسکتے تھے، محل اعتراض بنے ہوئے تھے، اور ان کے انکار و نفی کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا تھا، عرض سارا عالم ایک کلامی بحر میں مبتلا تھا، اور سب پر ایک "عقلی ظاہریت" پھالی ہوئی تھی، امت کی قوت عمل او اس سے بڑھ کر "حرارت عشق" جو اس امت کا سرمایہ، اس کی طاقت کا سرچشمہ اور نبوت کا فیضان ہے، سرد ہوتی جا رہی تھی، دل سوز سے خالی، اور "حرارت عشق" سے عاری ہوتے جا رہے تھے، فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو ایک مدرسہ میں تبدیل کر دیا تھا، جس میں قیل و قال تو بہت تھی، مگر زندگی، اور محبت، معرفت، اور نگاہ، نایاب تھی، اہل قلوب کے روحانی جزیروں میں البتہ عشق کا سرور اور یقین کا نور پایا جاتا تھا، ورنہ عالم کا عالم الفاظ کے طلسم کا گرفتار اور ظواہر و محسوسات کا پرستار تھا۔

## صاحبِ دل متکلم کی ضرورت

ایسی حالت میں عالمِ اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقت ور شخصیت کی ضرورت تھی جو دل درد مند اور فکرِ جہند دونوں سے فیضیاب ہو جس کے لئے عقلیات کا سمندر پایاب ہو چکا ہو اور الفاظ و ظواہر کا طلسم ٹوٹ چکا ہو جو اپنی گرمی عشق اور سوزِ دروں سے اس یخ بستہ عالمِ اسلام میں زندگی کی نئی حرارت پیدا کر دے اور عقل کے اس نگار خانہ میں عشق کا صورت پھونک دے جو ایک ایسے نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھے جو دماغوں سے زور آزمائی اور مخالفتیں کی زبان بند کر دے بجائے دماغ کی شکن دور کر دے اور دل کی گره کھولے اور ان کو سکینت و ایمان اور یقین و اطمینان سے بھر دے یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ (م ۶۷۲ھ) کی تھی جن کی مثنوی علمِ کلام کی بے اعتدالیوں اور عقل کی ہوس پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلانِ جنگ ہے اور ایک ایسے نئے علمِ کلام کی بنیاد جس کی بدلتے ہوئے عالمِ اسلام کو سخت ضرورت تھی۔

## مختصر حالات

مؤلف "مرآة المثنوی" نے اپنی (غیر مطبوعہ) تصنیف "صاحب المثنوی" میں مولانا کے حالات نہایت تفصیل و تحقیق سے لکھے ہیں یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ قاضی محمد حسین گورکھپوری مرحوم اس دورِ آخر میں مثنوی اور صاحبِ مثنوی کے بہت بڑے شیدائی اور محقق عالم تھے ان کی کتاب "مرآة المثنوی" سے متعلق لطیفی میں اپنا جواب نہیں رکھتی، "مرآة المثنوی" کے علاوہ (جو طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہے) ان کی دو اور مختصراً تصانیف ہیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئیں۔ (۱) صاحب المثنوی (۲) نقد المثنوی۔ ان دو کتابوں کی اشاعت ادبیاتِ رومی میں ایک گراں قدر اعزاز اور ایک بڑی خدمت ہوگی صاحب المثنوی دار المصنفین میں زیر طبع ہے راقم سطور کو ان کے صاحبزادے مولانا محمد حسین کی عنایت سے اس پیش بہا کتاب سے استفادہ و اقتباس کا موقع ملا، جزاء الشکر۔



## خاندان اور والدین

محمد نام، لقب جلال الدین، شہرت مولانا روم یا مولانا رومی کے لقب سے ہے، آپ کا نسب باپ کی جانب سے نو واسطوں سے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مل جاتا ہے، اور ماں کی جانب سے حضرت علیؓ کے تیسرے بیٹے سے۔  
مولانا کے آباؤ اجداد کرام بلخ واقع خراسان کے رہنے والے تھے، مولانا کی وہیں پیدائش ہوئی مولانا کے پدری و مادری سلسلہ میں اجلہ علماء اور سلاطین وقت ہیں، مولانا کی دادی ملکہ جہان شاہان خوارزم کے خاندان سے تھیں۔

مولانا کے والد کا نام محمد اور لقب بہار الدین ولد تھا، ان کی ولادت غالباً ۵۲۳ھ میں ہوئی حضرت بہار الدین ولد نو عمری ہی میں تمام علوم میں کامل و ماہر ہو گئے تھے، آپ کے علم و فضل کی کیفیت یہ بھی کہ اقصائے خراسان سے مشکل فتاویٰ آپ ہی کے پاس آتے تھے، مجلس کا طریق بادشاہوں کا ساتھ تھا، سلطان العلماء خطاب بھی تھا، معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا، ظہر کے بعد اپنے خاص اصحاب کے حلقہ میں حقائق و معارف بیان فرماتے، دو شنبہ اور جمعہ کو عام وعظ کہتے، ہیبت نمایاں رہتی، اور ہمیشہ متفکر معلوم ہوتے۔

## مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

آپ کے صاحبزادہ مولانا جلال الدین رومی ۶ ربیع الاول ۶۰۳ھ کو پیدا ہوئے، سلطان العلماء کے مریدان خاص میں ایک بلند پایہ بزرگ سید بہان الدین محقق ترمذی تھے، سلطان العلماء نے آپ ہی کو مولانا کا اتالیق مقرر فرمایا، اور ۴-۵ سال کی عمر تک مولانا آپ ہی کے زیر تربیت رہے، اور اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد آپ ہی کے زیر ہدایت منازل سلوک طے کئے۔

لے حال واقع ملک افغانستان - (ندوی)

## والد کی بلخ سے ہجرت

مولانا کے والد ماجد کا اترجیب زیادہ بڑھا، اور آپ کی دعوت و نصیحت کو حد سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا، اور مریدوں کی تعداد بے شمار ہو گئی تو بعض علماء عصر کو رشک ہونے لگا، حضرت سلطان العلماء اپنے وعظ میں مذہب حکمائے یونان کی مذمت فرمایا کرتے کہ کچھ لوگوں نے کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے، اور فلسفیوں کے ازکار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنایا ہے، یہ لوگ کیوں کر نجات کی امید کر سکتے ہیں اس پر ملاذمت سے علماء ظاہر کے دلوں میں آپ کی طرف سے کدورت بیٹھ گئی، مگر چونکہ خوارزم شاہ آپ کا نہایت معتقد تھا، ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا، اتفاق کہ ایک روز سلطان آپ کی زیارت کو آیا تو دیکھا کہ مجمع نہایت کثیر ہے، ایک عالم سے جو دکاب شاہی میں تھے، مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا کثیر مجمع ہے، فاضل مذکور کو موقع ملا، اور کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو، اور تدارک مشکل ہو جائے، یہ بات خوارزم شاہ کے دل میں بیٹھ گئی، اس نے پوچھا کہ کیا تدبیر کرنا چاہئے، فاضل مذکور نے

لے عام طور پر تذکروں میں ہے کہ یہ مکالمہ امام فخر الدین رازی سے ہوا، جو سلطان کے ساتھ تھے، مصنف صاحب المثنوی کی تحقیق ہے کہ یہ ایک تاریخی غلطی ہے، جو منقول علی آری ہے، اس لئے کہ حضرت بہار الدین ولد نے بلخ کو ۶۰۹ھ یا ۶۱۰ھ میں ترک کیا ہے، امام رازی نے ۶۰۶ھ میں اپنے وطن ہرات میں انتقال کیا، یہاں انہوں نے اپنے انتقال سے کئی سال پیشتر سے مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ مولانا روم کے فاضل سوانح نگار بدیع الزماں فرزند الفرج کی محققانہ کتاب زندگانی و مولانا جلال الدین محمد ابھی ایران سے شائع ہو کر آئی ہے، کی بھی یہی تحقیق ہے کہ یہ روایت تاریخی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہے، اور ان کی بنیاد بھی یہی ہے کہ بہار الدین ولد کی ہجرت بقول اکثر ۶۱۰ھ کا واقعہ ہے، اور امام فخر الدین رازی ۶۰۶ھ میں ہرات میں انتقال کر چکے تھے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۲۰۔

قاضی تلمذ حسین مرحوم فرماتے ہیں، ممکن ہے یہ عالم سید بہار الدین رازی ہوں، جو خوارزم شاہ کے مقربین میں تھے، اور

طبقات ناصری ۲۲۵ میں ان کا ذکر آتا ہے (ہندی)

سلطان صلاح الدین کے فرزند الملک النظار نے قاضی بہاء الدین ابن شداد کی تحریک سے جو اجلہ علماء میں سے تھے، ۵۹۱ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کئے تھے، جس کی وجہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوٰا بن گیا تھا۔

حلب میں مولانا مدرسہ حلاویہ میں قیام پذیر ہوئے اور کمال الدین ابن الحدیم سے استفادہ کیا مولانا یہاں اگرچہ تحصیل علم میں مشغول تھے، مگر آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ بقول سپہ سالار جو مشکل مسائل کسی سے حل نہ ہوتے تھے، وہ آپ ہی حل کرتے تھے اور ایسے وجوہ بیان کرتے تھے، جو کسی کتاب میں درج نہ ہوتے۔

حلب سے مولانا دمشق تشریف لے گئے، یہاں آپ نے مدرسہ مقدسیہ میں قیام فرمایا، دمشق اس وقت مجمع علماء تھا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ دمشق میں شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی، شیخ ابو صد الدین کرمانی، شیخ صدر الدین قونوی سے مولانا کی صحبت رہا کرتی، اور باہم دگر حقائق و معارف بیان ہوتے تھے۔

۶۳۴ھ یا ۶۳۵ھ میں آپ نے دمشق سے واپس آ کر قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا، سید بہان الدین کے انتقال (۶۳۷ھ) کے بعد ۵ سال تک آپ علماء ظاہر کے لباس میں رہے، اور علمی و تدریسی مشاغل میں ہمہ تن منہمک رہے، ۶۳۸ھ میں شیخ محی الدین ابن عربی نے انتقال کیا، جو بزم علم آپ کے گرد جمع تھی، اس کے اکثر افراد قونیہ میں آ گئے، جن میں شیخ صدر الدین بھی تھے، مشرق کی طرف سے جو علماء و فضلاء وہاں کی تباہیوں سے پریشان ہو کر روم کا رخ کرتے تھے، وہ بھی اکثر قونیہ کو اپنا لجا و ماویٰ بناتے، اس طرح قونیہ اس زمانہ میں مدینۃ العلماء بن گیا، اور ان علماء میں مولانا کی حیثیت سب سے بلند تھی، اس زمانہ میں مولانا کے وہی اشتغال تھے، جو علماء ظاہر کے ہوتے ہیں، یعنی درس و تدریس، وعظ و تذکیر اور فتاویٰ نویسی، مولانا بہت زیادہ وقت مشغول تدریس میں صرف کرتے، خود آپ کے مدرسہ میں چار سو سے زیادہ طلبہ تھے۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا کا دوسرا مشغول یا فرض و وعظ کہنا تھا، فتویٰ نویسی کا مشغول بھی مستقل

تھا، بیت المال سے مولانا کے لئے ایک دینار مقرر تھا، اسے اسی فتویٰ نویسی کا معاوضہ تصور فرماتے تھے اور اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ جب فقر کا رنگ غالب ہوا، اور مجلس میں مستغرق رہنے لگے اس وقت بھی حکم تھا کہ جس وقت کوئی فتویٰ آئے فوراً خبر کی جائے، قلم و دوات ہمہ وقت ساتھ رہتا تھا۔

## انقلابِ حال

یہ حالت ۶۳۲ھ تک قائم رہی اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، اور مولوی جلال الدین قنوی کو مشہور روزگار مولانا کے روم بنا دیا، یہ واقعہ مولانا کی شمس تبریزی سے ملاقات اور ان کی ذات سے شفیقتگی و قنایت تھی۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریزی کا نہ شد

## شمس تبریزی

(محمد بن علی بن ملک داد) شمس تبریزی کا نسب اور وطن کیا تھا؟ آپ کے مخالفین نے جہاں اور الزامات آپ پر لگائے تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ کا نسب نامہ معلوم ہے۔

نے درو اصل و نے نسب پیدا است می نہ دانیم ہم کہ اوز کجا است

آپ بچپن سے اعلیٰ استعداد اور جذبہ عشق و محبت کے حامل تھے، مناقب العارفین میں خود آپ ہی کی زبانی منقول ہے کہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں

لے بعض تاریخوں میں ہے کہ آپ حسن بن صباح اسماعیلی کے جانشین و رفیق و طریق کیا بزرگ امید کا نسل سے تھے، ان کے والد جلال الدین حسن جب منصب الامت پر فائز ہوئے تو انھوں نے اپنے بزرگوں کا طریقہ ترک کر کے صحیح اسلامی عقائد اختیار کئے، اور نو مسلم

کے لقب سے مشہور ہوئے، لیکن یہ روایات مشتبہ اور قابلِ بحث ہیں، ملاحظہ ہو زندگانی مولانا جلال الدین محمد ص ۵۲، ۵۳ (ہندی)

تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی، علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابو بکر سلہ بان کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیخ زین الدین سنجاسی کے مرید تھے، بعض روایتوں میں دوسرے نام لئے گئے ہیں، ممکن ہے آپ نے سب سے اکتساب فیض کیا ہو۔

جب آپ کو اس طرح سیری نہ ہوئی تو آپ اطراف عالم میں مردانِ خدا کی تلاش میں پھرنے لگے، یہ سفر اس طرح کرتے تھے کہ خود آپ کی ولایت و کمال سے لوگ آگاہ نہیں ہوتے تھے، ندریاہ پہنتے، اور جہاں جاتے سرانے میں قیام کرتے، دروازہ میں قیمتی قفل لگا دیتے کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے، مگر اندر سوائے پوربہ کے کچھ نہ ہوتا، کثرتِ سفار کی وجہ سے لوگ آپ کو شمس پرندہ کہنے لگے تھے، تبریز، بغداد، اردن، الروم، قیصریہ و دمشق کا سفر فرمایا، معاش کا یہ طریقہ تھا کہ ازار بند بن لیا کرتے، اور اسی کو بیچ کر کام چلاتے تھے، غذا کی کیفیت یہ تھی کہ دمشق میں ایک برس رہے، ہفتہ میں ایک پیالہ سری کا شوربا اور وہ بھی بے روغن پی لیا کرتے، کسی کو اپنی صحبت کا متحمل نہیں پاتے تھے، اکثر یہ دعا فرماتے کہ خدا یا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔

## مولانا کی ملاقات اور تعمیر عظیم

آپ کے شیخ نے آپ سے فرمایا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے، اسے روشن کر آؤ، دو شنبہ ۲۶، رجبی الاخریٰ ۶۴۲ھ کو تونہ پہنچے اور شکر فرشتوں کے محل میں قیام فرمایا، ایک روز دیکھا کہ مولانا سوا چلے آ رہے ہیں، اور لوگ گرد و پیش استفادہ کر رہے ہیں، شمس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضات و علوم کی غرض کیا ہے؟ مولانا نے کہا آداب و شریعت کا جاننا، شمس نے کہا نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسالی ہو جائے اور حکیم سنالی کا یہ شعر پڑھا ہے

لہ بدیع الزماں فرزا نے بجا سے زین الدین سنجاسی کے رکن الدین سنجاسی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ سنجاس زینجان کے تابع

ہے، ۵۰۰ سالہ، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کو اس روایت کی صحت میں کلام ہے، (ندوی)

علم کر تو ترانہ بستاند جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولانا اس سے متغیر و متحر ہوئے، اور تیر نشانہ پر بیٹھا۔

مولانا حضرت شمس کو ہمراہ لے کر اپنے مقام پر آئے اور بقول افلاکی چالیس روز تک حضرت شمس کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے جس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا، پہ سالار نے لکھا ہے کہ چھ ماہ تک صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں دونوں بزرگ عزت نشین رہے، سوائے شیخ صلاح الدین کے کسی کی مجال نہ تھی کہ حجرہ میں داخل ہو سکے۔

شمس کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقا لوتہ و اذواق کی نئی دنیا عطا کی وہ خود فرماتے ہیں

شمس تبریزی بارہ حقیقت بنمود از فیض قدم اوست کہ ایماں داریم

ابھی تک مولانا اساتذہ دوراں تھے اور خود صاحب سجادہ تھے اور علماء و طلبہ و صوفیہ مستفید طالب

اب مولانا مستفید طالب تھے اور شمس تبریز صاحب فیض و ارشاد مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد فرماتے ہیں

شیخ استاذ گشت نو آموز درس خواندی بخدش ہر روز

گرچہ در علم فقہر کامل بود علم نو بود کو بوسے بہ نمود

خود مولانا اپنی زبان سے فرماتے ہیں

زاہد بودم تر نہ گویم کردی سرفتنہ بزم و بادہ جویم کردی

سجادہ نشین باوقار سے بودم بازیچہ کو دکان کویم کردی

نتیجہ یہ ہوا کہ شمس کی ملاقات کے بعد مولانا نے درس و تدریس، و عظ گوئی وغیرہ سب یک قلم

لے صاحب المثنوی کی مختلف روایات میں سے اس روایت کو انتخاب کیا گیا ہے یہ روایت تذکرہ دولت شاہ کی ہے ۱۱۹۶ھ

فروزانہ نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو نقل کر کے ان سے بے اطمینانی کا اظہار کیا، اور شمس سے مولانا کے تاثر و فریفتگی کا سبب کسی

امکان کے اندر اور تصرف کو قرار نہیں دیا بلکہ مردان خدا کی تلاش عشق و اہل عشق سے مولانا کی مناسبت فطری کو قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو زندگانی جلال الدین محمد غزالی (۱۱۹۶ھ)

ترک کر دی، خود فرماتے ہیں:۔

عطار دوار دفتر پارہ بودم      زدشت او زمانے می نشستم  
چو دیدم نوح پیشانی ساقی      شدم مست و قلم ہارا شکستم

## شورش عام

مولانا جب اس طرح ہر بات میں حضرت شمس کی پیروی کرنے لگے، اور تمام تعلقات منقطع ہونے لگے، تو یہ امر مولانا کے شاگردوں اور مریدوں پر سخت شاق گذرا، ایک شورش کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، ایک برس ہی کے ساتھ گونہ حیرت بھی شامل تھی، شمس کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے، مریدوں کا خیال تھا کہ ہم نے عمریں مولانا کی خدمت میں گذاریں، مولانا کی کرامتوں کو دیکھا، تمام اطراف و اکناف میں آپ کی شہرت کا باعث ہوئے، اب ایک بے نام و نسب شخص آیا، اور مولانا کو سب سے الگ کر لیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس و تدریس و عطا سب بند ہو گئے، ضروری کوئی سا حری یا مکار شخص ہے، ورنہ اس کی کیا ہستی ہے کہ ایسے پہاڑ کو تنگ کی طرح بہا لے جائے۔

غرض سب کے سب شمس کے دشمن ہو گئے، مولانا کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، ادھر ادھر ٹہل جاتے تو برا بھلا کہتے، اور رات دن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے کہ کسی طرح حضرت شمس کو وہاں سے نکالیں کہ پھر حسب سابق مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہو سکیں۔

## شمس کی غیبت

حضرت شمس الدین ان لوگوں کی گستاخیوں کا تحمل کرتے رہے، اور سمجھتے رہے کہ مولانا کی وفور عقیدت کی وجہ سے یہ لوگ اس طرح آزرده ہیں، مگر جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب انجام اس کا

فتنہ و فساد پر ہوگا تو آپ ایک دن خاموشی کے ساتھ قونبرہ سے نکل گئے، افلاک کی نے اس غیبت اول کی تاریخ روز

پنجشنبہ کیم شوال ۱۲۳۳ھ دی ہے اس طرح بار اول قونبرہ میں آپ کا قیام سوا برس رہا۔

شمس کی جدائی مولانا پر سخت شاق گذری، مریدوں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے برعکس واقع ہوا، اس کے بجائے کہ شمس کے چلے جانے کے بعد مولانا ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، جو کچھ توجہ تھی، وہ بھی جاتی رہی، اور ان ناقصوں کی وجہ سے اصحاب صدق و وفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہو گئے۔

## مولانا کی بیقراری اور شمس کی واپسی

بقول پہ سالار انقطاع کلی کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی کہ دمشق سے شمس الدین کا خط اچانک مولانا کے نام آیا، اس خط کے پانے کے بعد مولانا کی کچھ حالت بدلی، اور شمس کے شوق و عشق میں سماع کی جانب متوجہ ہوئے، اور جن لوگوں نے حضرت شمس کے خلاف حرکات میں شرکت نہیں کی تھی، ان پر حسب سابق عنایت فرمانے لگے، اس عرصہ میں مولانا نے حضرت شمس کی خدمت میں چار منظوم خطوط لکھے جن میں اپنی کیفیت اور اشتیاق ملاقات کی بیباکی کا ذکر کیا ہے، پہلے نامہ شوق میں فرماتے ہیں ۷

ایھا النور فی الفواد تعال غایة الوجد والمراد تعال

ایھا السابق الذی سبقت منک صدوقۃ الوداد تعال

چوں بیائی زہے کشاد و مراد چوں نیائی زہے کساد تعال

انت کا شمس اذ دنت و نأت یا قریباً علی البعاد تعال

اس اشار میں شورش بہت کچھ فرو ہو گئی، اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب لوگوں نے شمس کی مخالفت

ترک کر دی ہے، مولانا نے شمس کو واپس بلانے کی تدبیر کی، صاحبزادہ سلطان ولد سے فرمایا کہ تم میری طرف سے

اس شاہ مقبول کی طرف جاؤ، اور یہ لے جا کر ان کے قدموں پر نثار کرو، اور میری جانب سے کہو کہ جن



مریدوں نے گستاخی کی تھی، وہ سب صدق دل سے توبہ کرتے، اور التجا کرتے ہیں کہ جو خطا ہوئی درگزر فرمائیں،

اور اس جانب قدم رنجہ فرمائیں، ان کے ہاتھ جو نیا زنا رکھیں اس میں اس مفارقت سے اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔

کہ ازاں دم کہ تو سفر کر دی  
از حلاوت جدا شدیم چو موم  
ہمہ شب چو شمع مے سوزیم  
ز آتش جفت وز انگبیں محروم  
در فراق جمال تو مارا  
جسم ویران و جان ازویوں بوم  
ہاں غناں را بدیں طرف برتاب  
زفت کن پیل عیش را خرطوم  
بے حضورت سماع نیست حلال  
ہمچو شیطان طرب شدہ مروجوم  
یک غزل بے تو ایچ گفتم نشد  
تار سید آں مشرفہ مفہوم  
پس بذوق سماع نامہ تو  
غزل پنج و شش بشد منظوم  
شام از تو چو صبح روشن باد  
اے بتو فخر شام وارمن و روم  
سلطان ولد حضرت شمس کو عزت و احترام شاہانہ کے ساتھ قونیہ لائے۔

## شمس کی دوبارہ غیبت

حضرت شمس کے قونیہ پہنچنے پر مولانا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جن لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں، سب نے آ کر معافی مانگی، ایک مدت تک یہ صحبت بے کدورت اسی طرح برقرار رہی اس اثنا میں شمس کے ساتھ مولانا کا اخلاص و اتحاد پہلے سے زیادہ بڑھتا گیا، مگر اس دورِ ختمی کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ پھر آزر دگی کے اسباب پیدا ہو گئے، حضرت شمس کا قیام مولانا کے تابخانہ کے قریب ہی والان صنف میں ایک طرف تھا، شمس وہاں اپنی اہلیہ کے ساتھ جن سے قونیہ میں عقد ہوا تھا، مقیم تھے، مولانا کے سنبھلے صاحبزادہ (چلی علی الدین) جب مولانا کے گھر جاتے تو اسی طرف سے ہو کر گذرتے، مولانا شمس الدین

کو یہ بات ناگوار ہوتی، کئی مرتبہ شفقانہ طور پر سمجھایا، علاء الدین کو یہ بات شاق گزری، ان کے دل میں کچھ اس بات سے بھی کدورت تھی، کہ حضرت شمس الدین سلطان ولد پر زیادہ نظر عنایت رکھتے ہیں، اس کا چرچا لوگوں سے بھی کیا، جو لوگ اس قسم کے موقع کے منتظر تھے، انھوں نے اور بھی حاشیے چڑھائے اور کہنے لگے کہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک بیگانہ نے آکر مولانا کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے اور فرزند کو گھر میں آنے نہیں دیتا۔

حضرت شمس الدین نے محض لطف و حلم کی وجہ سے مولانا سے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، مگر جب معاملہ حد سے گزر گیا تو سلطان ولد سے برسبیل حکایت یہ فرمایا کہ ان لوگوں کے حرکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ میں اس طرح غائب ہوں گا کہ پھر کسی کو پتہ نہ چلے گا، مولانا کی بعض غزلوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا بھی بالکل اس سے بے خبر نہ تھے، بلکہ ان کو اس کا اندیشہ تھا، اور انھوں نے اشعار میں اس سے باز رہنے کی منت سماجت کی ہے۔

بہر حال لوگوں میں حضرت شمس الدین کے خلاف خیالات پھر جوش زن ہو گئے تھے اور آپ خود ہی آزرده خاطر ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دفعتاً غائب ہو گئے۔

ناگہان گم شد از میان ہمہ تار و دازل اندہان ہمہ

## مولانا کی بیٹیاں

مولانا جب صبح کو مدرسہ تشریف لائے، اور شمس کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے اور سلطان ولد

یہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قونیہ میں کچھ لوگوں نے حضرت شمس کو قتل کر دیا، اور مولانا نے فرمایا: *لَا تَفْعَلْ اِنَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُحْكَمُ مَا يُرِيدُ*

لیکن فرزند الغر نے غیبت کی اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ سلطان ولد سب سے قریب تراور حالات سے باخبر تھے ان کی روایت اس

باب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے، اس لئے شمس کے قتل کی روایت قابل اعتبار نہیں، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر شمس

قتل کر دیئے گئے ہوتے، اور مولانا کو اس واقعہ کا علم ہوتا، تو ان کی تلاش میں یہ سرگردانی نہ ہوتی (زندگانی ص ۵۳-۵۴) (ندوی)

کے خلوت خانہ پر جا کر آواز دی، "بہاء الدین پختہ ہے، برخیز و طلب شیخت کن کہ باز مشام جان را از فولک"

لطف او خالی می یابیم۔"

دو تین روز ہر طرف جستجو کرتے رہے، مگر کہیں حضرت شمس کا پتہ نہ چلا، اس مرتبہ شمس کی غیبت سے مولانا کا حال پہلے سے بھی زیادہ متسیر ہو گیا۔

شیخ گشت از فراق او مجنون بے سرو پا ز عشق او چو ذوالنون

جو لوگ حضرت شمس کی آزدگی کا باعث ہوئے تھے، مولانا نے ان سب کو قطعاً اپنی صحبت سے خارج کر دیا، لیکن سابق کے برخلاف اس مرتبہ اپنے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا، یہ سلسلہ کا واقعہ ہے۔ حضرت شمس کے غائب ہو جانے کے بعد مولانا نے دو روز ہر طرف آپ کی تلاش کی، مگر جب کسی طرح آپ کا کچھ پتہ نہ چلا، تو مولانا کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، طریق سماع تو آپ پہلے ہی اختیار کر چکے تھے، اب یہ حالت ہوئی کہ ایک دم سماع کے بغیر نہیں گزرتا تھا، مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے، اور آشکار و نہان شور و فریاد کرتے تھے، تمام شہر میں غلغلہ مچ گیا، اسی زمانہ میں مولانا نے حضرت شمس کے فراق میں بہت کثرت سے اور نہایت ہی دل دوز غزلیں کہیں، آپ کی درد انگیز فراقیہ غزلیں زیادہ تر اسی زمانہ کی ہیں۔

اس تمام جان گدازی و بے قراری کے باوجود مولانا کے دل سے یہ خیال محو نہ ہو سکا کہ روسیوں کی خانہ جنگی، مصریوں کی ترک تازی اور تاتاریوں کی تاراجی کے باعث سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے، معلوم نہیں، اس عالم آشوب میں حضرت شمس پر کیا گزری؟!

شمس الدین کے غائب ہو جانے کے بعد آپ کے اشتیاق میں مولانا کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص جھوٹوں بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولانا لباس تک اتار کر اس کی نذر کرتے، شکرانہ دیتے، اور بہت کچھ اظہار شکر کرتے۔

## سفر شام اور سکون خاطر

اسی جوش و خروش کے عالم میں مولانا نے سفر کا ارادہ کیا، اور شام کی طرف روانہ ہو گئے، آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے، اسی طرح دمشق پہنچے، اور وہاں بھی لوگوں کے دلوں میں آتش عشق بھڑکادی، تمام لوگ حیران تھے کہ ایسا عالم و فاضل شخص کیوں اس طرح دیوانہ ہو رہا ہے، شمس تبریز کیا چیز ہیں جو کہ ایسا فرد فریدان کے پیچھے یوں مارا مارا پھر رہا ہے، یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب دمشق میں شمس کا کچھ پتہ نہ چلا، اس وقت مولانا نے فرمایا کہ میں اور شمس دو نہیں ہیں، وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں، ذرہ کی استی آفتاب ہی سے ہے، اور قطرہ کی تری دریا ہی سے ہے، پس فرق کیا ہوا، چند روز بعد اپنے شام سے روم کی جانب مراجعت فرمائی۔ چند برس قونیہ میں قیام فرمایا، مگر پھر عشق نے جوش کیا، اور کچھ لوگوں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور آخر پھر... قونیہ تشریف فرما ہوئے، اور اس مرتبہ یہ خیال لے کر آئے کہ میں خود عین شمس ہوں، شمس کی جستجو کیا تھی، درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا، اس مرتبہ قونیہ اس خیال کے ساتھ واپس آئے کہ شمس میں جو کچھ تھا، وہ خود مجھ میں موجود ہے۔

اس مرتبہ دمشق سے واپس آنے کے بعد مولانا حضرت شمس کے ملنے سے بالکل مایوس ہو گئے تھے، مگر جس کیفیت کو آپ شمس میں ملاحظہ فرماتے تھے، اسے اب خود اپنے میں ملاحظہ فرمانے لگے، سلطان ولد کے الفاظ ہیں کہ "اگرچہ مولانا قدس الشہداء شمس الدین تبریزی و اعظم الشہداء بصورت درد عشق نیافت یعنی در خود بیافت زیراں حال کہ شمس الدین را بود حضرتش را ہماں حاصل شد"

### شیخ صلاح الدین زرکوب

دمشق سے دوسری مرتبہ واپس آنے کے بعد مولانا کچھ دنوں ساکن رہے، اس کے بعد آپ نے شیخ

صلاح الدین کو اپنا ہمزاد و خلیفہ بنایا، ۶۴۷ھ میں آپ نے ان کو اپنا جلیس خاص بنایا، اور حضرت شمس الدین کے بجائے ان کو اپنا معین و دساز قرار دیا۔

شہ صلاح الدین زبید شمس دین گشت اور اندریں دزیش معین  
حال و قالش از وجودش کی فرود سربائے نادر ازوے می شنود

شیخ صلاح الدین قونیہ کے قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، غریب الدین کی اولاد تھے جو اہی گیری کیا کرتے تھے، خود شیخ صلاح الدین نے نزدیکی کا پیشہ اختیار کیا، ابتدائے حال سے امانت و دیانت میں شہور تھے، سید بہان الدین جب قونیہ آئے تو آپ ان کے مرید ہو گئے، اور ان کی نظروں میں اختصاص خاص پیدا کیا، سید کے انتقال کے بعد مولانا سے تجدید بیعت کی، انتقال سے دس برس قبل مولانا سے آپ کو وہ قرب حاصل ہوا، اس دس سالہ مدت میں آپ مولانا کے خلیفہ خاص رہے، شیخ نے یکم محرم ۶۵۷ھ میں انتقال فرمایا۔

لوگوں میں اس قرب و اختصاص سے پھر شورش پیدا ہوئی، اب لوگوں کو شکوہ تھا، کہ ان سے تو شمس تبریزی ہی بہتر تھے، وہ بہر حال صاحب علم تھے، یہ صاحب تو ہیں کہ رہنے والے ہیں، سب جانتے ہیں کہ ایک عامی آدمی ہیں، مگر پھر ورق کوٹتے رہے، اب مولانا کے رفیق بنے ہیں، حیرت ہے کہ مولانا اس رتبہ اور پایہ کے باوجود ایسے شخص کی تعظیم و تکریم میں یہ مبالغہ کرتے ہیں، شیخ نے سنا تو فرمایا کہ لوگوں کو ملال اس کا ہے کہ مولانا نے مجھے سب میں مخصوص کر لیا، مگر اصل بات کو نہیں سمجھتے کہ مولانا خود اپنے پر عاشق ہیں، میں تو محض ایک جلیلہ ہوں۔

۱۔ فرودانفر لکھا ہے: مولانا از دیار شمس زومید گشت بنامی دل و ہنگامی ہمت رخصتے در صلاح آوردار شیخی و خلیفتی، در شکر کی جنود لکھا ہے  
منسوب فرمود و یاران را باطاعت سے امور ساخت، ۹۳ (ندوی) ۱۷ بدیع الزمان فرودانفر زندگانی مولانا جلال الدین  
میں لکھا ہے: مولانا بکوری چشم منکران خود ویدہ بر صلاح الدین گاشت وہاں عشق و دل باخگی کہ با شمس داشت بائے زیادہا  
وازا انجا کہ صلاح الدین مرے درام و نرم و جذب و ارشادش بنوع دیگر بود شورش و انقلاب مولانا آرام تر گردید و از بے قراری

بقرار باز آمد و برائے نکستن خمار ہجران شمس از پیمانہ وجود و طلب ہائے سبکی نوشید، ص ۱۰۲-۱۰۳

دش برس کی خدمت و صحبت کے بعد شیخ ناگہاں بیمار ہوئے اور حکیم محرم کو نہایت طمانیت قلب کے ساتھ اس دارِ غرور سے دارِ سرور کی طرف سفر کیا۔

## چلی حسام الدین

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے چلی حسام الدین ابن اخئی ترک کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، چلی حسام الدین مولانا کے ممتاز مریدوں میں سے تھے اور مولانا کے انتقال کے بعد ابرس تک مولانا کی خلافت کے فرائض انجام دیئے، آپ اصلاً ترک اور وطناً رموی تھے، اور روم کے مشہور اور ذی اثر خاندانِ اخئی سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی آپ کو ارادت تھی اور ان لوگوں کے فیض سے بھی آپ پیش از پیش متمتع ہوئے تھے۔

حضرت حسام الدین چلی نے اپنے تمام ملازموں اور غلاموں کو حکم دے دیا کہ اپنے طور پر کام کریں، آہستہ آہستہ اپنا کل ملک مولانا کی خدمت میں صرف کر دیا، آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کر دیا، مولانا کا پاس ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ مولانا کے وضو خانہ میں کبھی وضو نہ کرتے، سخت سخت سردی ہوتی، بروت پڑتی ہوتی، مگر گھر جا کر وضو کر کے آتے، دوسری طرف مولانا بھی آپ سے اس طرح پیش آنے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مرید ہیں۔

۱۰۳۰ھ چلی ترک زبان میں سیدی کا ہم معنی ہے، ۱۰۳۰ھ فردوزانفر نے ان کی تاریخ ولادت ۱۰۳۰ھ لکھی ہے ۱۰۳۰ھ مولانا کو جو کچھ فتوحات ہوئیں سب چلی کے پاس بھیج دینے، صاحبزادہ سلطان ولد نے ایک مرتبہ نکایت کی تو فرمایا کہ واشر باشر تاشر کہ اگر صد ہزار کمال زاہد را حالت مختصہ واقع شود و ہم ہلاکت یا شد و مارا گیتانان باشند آن را ہم بحضرت چلی فرستیم مولانا کو ان کے بغیر ایسا وسیع شکی نہیں ہوتی تھی جس مجلس میں چلی نہ ہوتے مولانا کی طبیعت میں جوش و گرمی نہ پیدا ہوتی اور اسرار و معرفت کی باتیں نہ کرتے، جن لوگوں کو یہ حقیقت معلوم تھی وہ مجلس میں سب سے

زیادہ اس کا اہتمام کرتے کہ حضرت چلی موجود ہوں، تاکہ دریا کے فیض جاری ہو (ملاحظہ ہو زندگان ۱۰۵)۔ ندوی

## ثنوی کی تحریک

ثنوی شریف کی تصنیف اسی زمانہ کا کارنامہ ہے اس میں حضرت حسام الدین کی تحریک کو بہت بڑا دخل ہے، بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا "ثنوی شریف کا وجود میں آنا آپ ہی کی وجہ سے ہوا"۔

## رفقا کے انتخاب کا سبب

مولانا کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی، شمس الدین کے بعد صلاح الدین اور صلاح الدین کے

لہ فرزا نے لکھا ہے کہ ثنوی کی تالیف چلی حسام الدین کی فرمائش و طلب سے ہوئی، انھوں نے لکھا ہے کہ چلی دیکھتے تھے کہ مولانا کے اجاب مقبولین شیخ عطار و سنائی کی تصنیفات و کلام کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں، مولانا کی غزلیات کا اگرچہ بڑا ذخیرہ ہے، مگر اس میں حقائق تصوف و دقائق سلوک سے زیادہ مولانا کی گرمی طبع و جوش عشق ہے، وہ موقع کے منظر تھے، ایک رات مولانا کو تنہا دیکھ کر انھوں نے عرض کیا کہ کوئی کتاب حدیقہ سنائی یا منطق الطیر کے طرز پر لکھی جائے، مولانا نے سنتے ہی اپنے عمار سے ایک کاغذ نکالا، جس میں ۱۸ شعر لکھے ہوئے تھے، پہلا شعر وہ تھا جس کو ثنوی کا آغاز اور مطلع بنا نصیب ہوا۔

بشنوا ز نے چوں حکایت می کند      و ز جدائی ہا شکایت می کند

آخری مصرعہ تھا۔ ع

پس سخن کوتاہ باید و السلام

پس ثنوی کی تالیف کا آغاز تھا، مولانا برجستہ اشعار زبان مبارک سے ادا کرتے اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے، لکھ لینے کے بعد

حسام الدین اس کو بلند طور پر خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے، بعض مرتبہ پوری پوری رات اسی مشغلہ میں گزر جاتی، اور ثنوی کی تالیف شاہ سے

صبح تک جاری رہتی، ثنوی کی جلد اول مکمل ہوئی تھی کہ حسام الدین کی اہلیہ نے انتقال کیا، اور حسام الدین کی طبیعت پر سخت اثر پڑا، اور وہ مضمحل ہو گئے،

ان کے اضمحلال سے مولانا کی طبیعت بھی رگ گئی، اور دو سال تک ثنوی کا سلسلہ بند رہا، پھر دوبارہ حسام الدین کی تحریک اور تقاضا سے اس کا

سلسلہ شروع ہوا، اور مولانا کی وفات تک جاری رہا، یہ مدت ۵ سال کی تھی (زندگانی مولانا جلال الدین محمد ۱۱۸-۱۱۶)۔ ثنوی

بعد حسام الدین آپ کے ہمراز و دمساز رہے، بلکہ سلسلہ خیال کو اور آگے بڑھایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سید بہار الدین ترمذی بھی اسی زمرہ میں داخل تھے، اگرچہ دوسری حیثیت تھے، سید موصوف کے انتقال اور شمس کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولانا نے اس طرح گزارا گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی محسوس کرتے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا کے باطن میں جو کمالات مخفی تھے، ان کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی، ”دیوان و مثنوی“ انہی حضرات کی تحریک باطنی کے شواہد ظاہری ہیں، صرف حسام الدین کی عدم فرصت کی وجہ سے مثنوی شریف کی تصنیف دو برس معلق رہی۔

مولانا نے جن اصحاب کو اپنی ہم نشینی کے لئے منتخب کیا، ان کے انتخاب کی وجہ کشف و کرامت نہیں تھی، آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبب جنسیت ہو کرتی ہے، خود مولانا نے سلطان ولد کے سوال پر فرمایا کہ میں مناسبت جنسیت کی وجہ سے ان کو خاص طور پر دوست رکھتا ہوں، فرمایا کہ جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے، اس کا نتیجہ شیشیانی نہیں ہوتا، حقیقی محبت اور مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی شیشیانی نہیں ہوتی، چنانچہ اہل غرض دوستوں کو آخرت میں یہ تمنا ہوگی کہ **يَا لَيْتَنِي لَمْ آتَخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا**، ”مجان مثنوی کی صفت یہ ہوگی **الْاِخْلَاقُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِينَ**“

خود فرماتے ہیں:-

موجب ایماں نہ باشد معجزات      لیک جنسیت بود جذب صفات

## مولانا کی وفات

سپ سالار کا قول ہے کہ مولانا کے انتقال سے قبل قونیہ میں چالیس روز زلزلہ آتا رہا، افلاک کا بیسٹا ہے کہ مولانا ہنوز صاحب فراش تھے کہ سات روز برابر زلزلہ رہا، تمام لوگ عاجز آ گئے، مولانا سے طلب امداد کی فرمایا زمین بھوکی ہو گئی ہے، لقمہ چوب چاہتی ہے، جلد کامیاب ہو جائے گی، اور یہ رحمت تم لوگوں سے



رفع ہو جائے گی، اور اس زمانہ میں یہ غزل ارشاد فرمائی ہے۔

یا ایں ہمہ مہر و مہر بانی      دل می دہت کہ خشم رانی  
دیں جملہ شیشہ ہائے جان را      در ہم شکنی بہ کن تڑائی

چلیپی حسام الدین کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ صدر الدین اکابر درویشوں کے ساتھ مولانا کی عبادت کو آئے، مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور فرمایا خدا شفا ئے عاجل عطا فرمائے، امید ہے کہ صحت کلی حاصل ہو جائے گی، مولانا نے فرمایا، اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو، عاشق و معشوق میں بال کا پیرا ہن رہ گیا ہے، کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور نور میں شامل ہو جائے۔

مرض ہی میں یہ غزل شروع کی، حسام الدین چلیپی لکھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

رد سر بنہ بیا لین تنہا مرا رما کن      ترک من خرابے شب گرد بتلا کن  
مایم و موج سودا شب تا بروز تنہا      خواہی بیا بنجنا خواہی برو جفا کن  
از من گریز تا تو ہم در بلا نیفتی      بگزیں رہ سلامت ترک رہ بلا کن  
مایم و آب دیدہ در کنج غم خزیدہ      بر آب دیدہ ما صد جائے آسا کن  
خیرہ کشی است مارا دار دو بے پوخارا      بکشد کشش نہ گوید تدبیر خوں بہا کن  
بر شاہ خورویان واجب وفا بنا شد      لے زرد روئے عاشق تو صبر کن وفا کن  
دردیست غیر مردن کا ترا دو ابنا شد      پس من چکو نہ گویم کان درد را دو اکن  
در خواب ددش پیری در کوئے عشق دیدم      بادست اشار تم کرد کہ عزم سوئے ما کن

عین انتقال کے قریب فرمایا ہے۔

گر مومنی و شیریں ہم مونس مرگت      در کافری و تلخی ہم کافرست مردن

۵، جمادی الاخریٰ ۶۶۲ھ کو بوقت غروب آفتاب حقائق و معارف بیان فراتے ہوئے انتقال

فرمایا انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۶۸ برس تین ماہ کی تھی۔

جنازہ کو جب باہر لائے، قیامت کا ازدحام برپا ہوا، ہر قوم و ملت کے لوگ ساتھ تھے، اور سب روتے جاتے تھے، یہودی اور عیسائی تو ریت و انجیل پڑھتے جاتے تھے، مسلمان ان کو ہٹاتے، مگر وہ باز نہیں آتے تھے، فساد کا اندیشہ ہوا، جب یہ خبر پروانہ کو پہنچی، تو اس نے راہبوں اور قسیوں سے پوچھا کہ تمہیں اس امر سے کیا تعلق ہے، انہوں نے کہا کہ ہم نے انبیاء سابقین کی حقیقت کو انہی کے بیان سے سمجھا اور اولیاء اکمل کی روش کو انہی کی روش سے جانا، وہ لوگ اسی طرح تالوت کے ساتھ رہے، ہجوم کی حالت یہ رہی کہ تالوت صبح سویرے مدرسہ سے روانہ ہوا تھا، اور شام کے قریب قبرستان پہنچا، آخر بوقت شب یہ آفتاب فقر و تصوف دیدہ ظاہر سے نہاں ہو گیا۔

## اخلاق و خصوصیات

مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:۔

مولانا جب تک تصوف کے دائرہ میں نہیں آئے، آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان رکھتی تھی، ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلبہ بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا، سلاطین و امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی، درس و تدریس، افتاد و افادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن وہ کھپلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی، ورنہ زیادہ ترجمت و معرفت کے نشہ میں مرشار رہتے؟

## ریاضت و مجاہدہ

ریاضت و مجاہدہ حد سے بڑھا ہوا تھا، پچھ سالہ برسوں ساتھ رہے ہیں، ان کا بیان ہے کہ

اے مین الدین پروانہ حاکم قونیہ۔

میں نے کبھی ان کو شبِ خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، بچپن اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا تھا، قصداً لیٹتے نہیں تھے، نیند غالب ہوتی تو میٹھے میٹھے سو جاتے، ایک غزل میں فرماتے ہیں:-

چہ آساید بہر پہلو کہ خسپد کسے کہ خار دارد او نہالین  
 سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو  
 پر سر رکھ لیتے کہ وہ لوگ بے تکلف ہو کر سو جائیں، وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو خود اٹھ بیٹھتے، اور ذکر و شغل میں مصروف  
 ہوتے، ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمہ خفتند و من دل شدہ را خواب نبرد ہمہ شب دیدہ من بر فلک اتارہ شرد  
 خوابم از دیدہ چناں رفت کہ ہرگز ناید خواب من ز ہر فراق تو بنوشید و ببرد  
 روزہ اکثر رکھتے تھے، اور مسلسل کئی کئی روز کچھ نہ کھاتے تھے۔

## نماز کی کیفیت

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے، اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا، نماز میں نہایت استغراق  
 ہوتا تھا، سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشا کے وقت سے نیت باندھی،  
 اور دو رکعتوں میں صبح ہو گئی، مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے، فرماتے ہیں:-

چو نماز شام ہر کس نہد چراغ و خوانے منم و خیال یارے غم و نوحہ و فغانے  
 چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نماز در مسجد بسوزد چو درد در سداذانے  
 عجب نمازستان تو بگو درست بہت آن کہ نداند اوزمانے نہ شاندا و مکانے  
 عجب درد رکعت ست این عجب چہارم آستین عجب چہ سورہ خواندم، چوندا شتم زمانے  
 در حق چگونہ کو بیم؟ کہ نہ دست ماند ز دل دل دوست چوں تو بردی بڑاے خدا مانے

بخدا خیر نہ دارم چو نمازی گزارم کہ تمام شدر کوئے کہ امام شرفلانے  
ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں  
سے تر ہو گئی، جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم کر ریخ ہو گئے، لیکن وہ اسی طرح نماز میں مشغول رہے۔

## زہد و قناعت

مزاج میں انتہا درجہ کا زہد و قناعت تھی، تمام سلاطین و امراء نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے،  
لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے، جو چیز آتی، اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلی خسام الدین کے  
پاس بھجواتے، کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی، اور مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد اصرار  
کرتے تو کچھ رکھ لیتے، جس دن گھر میں کھانے کا سامان کچھ نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے، اور فرماتے کہ آج ہمارے  
گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

## قیاضی و ایثار

قیاضی و ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کرتا یا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر دے دیتے،  
اسی لحاظ سے کرتا عبا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا تھا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

## بے نفسی اور قنایت

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ راہ میں جا رہے تھے، ایک تنگ گلی میں ایک کتا سر راہ سو رہا تھا، جس سے  
راستہ رک گیا تھا، مولانا وہیں رک گئے، اور دیر تک کھڑے رہے، اوہر سے ایک شخص آ رہا تھا، اس نے کتے کو  
بٹا دیا، مولانا نہایت آزرده ہوئے اور فرمایا کہ ناحق اس کو تکلیف دی۔

ایک دفعہ دو شخص سر راہ لڑے تھے اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ اوعین! تو ایک کہے گا تو دوسرے کا، اتفاق سے مولانا کا ادھر گزر ہوا، آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہو کہ تم مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سونو گے، دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

## کسبِ حلال

معاش کا یہ طریقہ تھا کہ اوقات کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزینہ مقرر تھا، چونکہ مولانا مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے اس لئے اس کے معاوضہ میں فتویٰ لکھا کرتے تھے، مریدوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی فتویٰ لائے تو گوئیں کسی حالت میں ہوں، ضرور خبر کرو تا کہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ہو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدر الدین کو ہزاروں روپیہ کا وظیفہ ہے اور آپ کو کل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں، مولانا نے کہا کہ شیخ کے مصارف بھی بہت ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی انہی کو ملنے چاہئیں۔

## اہل دنیا سے کیسوی

مولانا کو باطنی امرا و سلاطین سے نفرت تھی، صرف حسنِ خلق کی وجہ سے ان کی لیتے تھے اور نہ ان کی صحبتوں کو سوا دور بھاگتے تھے، ایک دفعہ ایک امیر نے معذرت کی کہ اشغال سے فرصت نہیں ہوتی، اس کے گم حاضر ہو سکتا ہوں، معاف فرمائیے گا فرمایا: "معذرت کی ضرورت نہیں، میں آنے کی نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں!"

ثنوی معنوی اور اس کا علمی و اصلاحی مقام و پیغام

## ثنوی معنوی

مولانا کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پرہوش طبیعت پائی تھی، عشق ان کی فطرت

میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، ظاہری علم اور عقلیات کے توغل نے اس آگ کو دبا رکھا تھا، شمس تبریز کی آتشیں صحبت نے ان کی فطرت کو چھڑ دیا، اور تربیت و ماحول نے اس پر جو پورے ڈال دیئے تھے، وہ دفعۃً اٹھ گئے، اور وہ سراپا سوز و ساز بن گئے۔

شعلہا آخر زہر مویم دید از رگ اندیشہ ام آتش چکیدہ  
اس مقام پر پہنچ کر عارف کے ہرٹن موسے صدا آتی ہے کہ۔

در جہان یارب ندیم من کجاست نخل سینا یم کلیم من کجاست  
یہی وجہ تھی کہ ہمد و ہمزاز کے بغیر ان کے لئے جینا محال تھا، شمس تبریز کے بعد جب تک ان کو صلاح الدین زرکوب اور صلاح الدین زرکوب کے بعد جب تک ان کو حسام الدین چلی نہیں مل گئے، ان کی بے قرار طبیعت کو سکون نہیں ہوا۔ ع۔

شمع راتنہا طلیدن سہل نیست

یہی آتش سوزاں تھی جو ان کو کشاں کشاں سماع کی طرف لے جاتی تھی، اور وہ اس سے قوت اور غذا حاصل کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

پس غذائے عاشقاں آمد سماع کہ از واپسند خیال اجتماع  
قوتے گیرد خیالات ضمیر بلکہ صورت گرد از بانگ صغیر  
آتش عشق از نوا ہا گرد تیز آچنانکہ آتش آن جوز ریز

اسی سوز نے ان کے ساز کو چھیرا اور خاموش رہنا ان کے لئے ناممکن کر دیا اس لئے ان کے بقول۔

جوش نطق از دل نشان دوستیت بستگی نطق، از بے الفتی است  
دل کہ دلبر دید کے ماند ترش بلبیل گل دیدہ کے ماند خمش

۱۰۰ اقبال در ثنوی اسرار خودی ۱۰۰ ایضاً ۱۰۰ ثنوی ص ۱۹۰۔ نزل کشور اشاعت نہم ۱۰۰ ایضاً ۱۰۰ ایضاً ۱۰۰

اس ساز سے جو نغمے نکلے ان کے مجموعے کا نام ثنوی ہے یہ ان کے خیالات و حالات و واردات و  
تاثرات اور مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہے اس میں صاحب کلام کا سوز و درد، جوش و مستی اور ایمان  
یقین بکھرا ہوا ہے اور یہی اس کی عالمگیر مقبولیت اور بے نظیر تاثیر کی اصل وجہ ہے۔ ع  
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا ابو

### عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید

مولانا کا علمی نشوونما تمام تراشاعرہ کے علمی ماحول میں ہوا تھا، وہ خود ایک کامیاب مدرس اور معقولی  
عالم تھے، توفیق الہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہنچایا، اور قال سے حال خبر سے نظر الفاظ  
سے معانی اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی طلسم سے ترقی کر کے حقیقت و معنی تک پہنچے تو ان کو  
فلسفہ و علم کلام کی کمزوریوں اور استدلال و قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا، اور فلاسفہ و متکلمین اور اہل  
استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی، تو انہوں نے بڑی قوت  
اور وضاحت کے ساتھ علم کلام پر تنقید کی، وہ چونکہ اس کوچہ کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں، اس لئے وہ کوچہ  
کہتے ہیں، وہ ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے، اور اس کی واقعیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس عصر کے فلسفہ و عقلیات کا سب سے زیادہ زور جو اس ظاہری پر تھا، ان جو اس خمسہ کو علم اور  
حصول یقین کا سب سے زیادہ مستند اور قابل وثوق ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اور جو چیز ان کی گرفت میں نہ آسکے،  
اور ان کے ذریعہ اس کی تصدیق نہ ہو سکے، اس کی نفی اور اس کے انکار کی طرف رجحان روز بروز ترقی  
کر رہا تھا، معزز اس حیثیت کے سب سے بڑے نقیب تھے، اس جو اس پرستی نے ایمان بالغیب کو بہت نقصان  
پہنچایا تھا، اور شریعت اور وحی کے پیش کیے ہوئے حقائق کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا کر دی

لے اقبال بال جبریل۔

تھی، مولانا اس جو اس پرستی اور اس کے پر جوش و کیلوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

چشم حس را ہست مذہب اعتزال	دیدہ عقل است سنی در وصال
سخرہ حس انداہل اعتزال	خولش راستی نمایند از صنلال
ہر کہ در حس ماند او معتزلی است	گر چه گوید سنیم از خای است
ہر کہ بیرون شد ز حس سنی ولست	اہل بنیش اہل عقل خویش بیست

انہوں نے جا بجا ثابت کیا ہے کہ ان جو اس ظاہری کے علاوہ انسان کو کچھ جو اس باطنی عطا ہوئے ہیں، یہ جو اس باطنی جو اس ظاہری کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع اور وسیع ہیں، فرماتے ہیں:-

پنج حصے ہست جزایں پنج حس	آن پوزر سرخ و این حسہا چوس
اندر ان بازار کاہل محشر اند	حس مس را چوں حس زر کے خرد
حس ابدان قوت ظلمت می خورد	حس جان از آفتابے می چورد

ان کے نزدیک کسی چیز کے انکار کے لئے یہ ثبوت بالکل کافی نہیں کہ وہ دیکھنے میں نہیں آتی، یا جو اس اس کی تصدیق نہیں کرتے ان کے نزدیک باطن ظاہر کے پیچھے نہاں اور دوا میں فائدہ کی طرح اس میں نہاں ہے، منکرین باطن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

حجت منکر ہی آمد کہ من	غیر ازین ظاہر نمی بینم وطن
بیچ نذریشد کہ ہر جا ظاہر است	آن ز حکمت ہائے نہاں فخرست
فائدہ ہر ظاہرے خود باطنیت	ہیچو نفع اندردوا با مضمربست

ان کا کہنا ہے کہ منکرین اپنی اس ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کی عادت کی وجہ سے ان حقائق باطنی کی دید سے محجوب اور اصل غایت و مقصد سے محروم ہیں:-



چونکہ ظاہر ہاگرتقداحمقوں اُن دقاتق شدازیشاں بس نہاں  
 لاجرم محبب گشتند از عرض کہ دقیقہ فوت شد در مقررص<sup>لہ</sup>  
 سو اس سے آگے بڑھ کر وہ عقل پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ عالم غیب کے حقائق اور انبیاء کے علوم و معارف  
 کے بارہ میں عقل بھی کوتاہ اور نارسا ہے اس کے پاس قیاس کی کوئی بنیاد نہیں اور وہ اس عالم کا کوئی  
 تجربہ نہیں رکھتی دریا سے شور کارہنے والا آب شیرین کا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟

اے کہ اندر چشمہ شور است جات تو چہ دانی شط و جیون و فرات<sup>۱</sup>  
 وہ اس عقل کو جو محسوسات اور مقدمات کی پابند ہو عقل جزوی کے نام سے یاد کرتے ہیں ان کے  
 نزدیک اوہام و شکوک اس کا ثمرہ عالم ظلمات اس کا وطن ہے وہ عقل کے لئے باعث بدنامی اور انسان  
 کے لئے سبب ناکامی ہے اس عقل جزوی سے دیوانگی اچھی!

عقل جزوی آفتش وہم ست وطن زانکہ در ظلمات شد اورا وطن<sup>۳</sup>  
 عقل جزوی عقل را بد نام کرد کام دنیا مرد را بے کام کرد<sup>۴</sup>  
 زیں خرد جاہل ہی باید شدن دست در دیوانگی باید زدن<sup>۵</sup>

وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود اس عقل دور اندیش کا تجربہ کیا ہے اور اس نتیجہ تک پہنچا ہوں۔  
 آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را<sup>۶</sup>  
 پھر وہ ایک سیدھی اور عام فہم بات کہتے ہیں کہ اگر عقل دینی حقائق و معارف کے ادراک کے لئے  
 کافی ہوتی تو اہل منطق و استدلال اور ائمہ کلام سے بڑے عارف اور دین کے محرم اسرار ہوتے۔

اندریں بحث از خرد رہیں بدے فخر ازی را ز دار دین بدے<sup>۷</sup>  
 ان کے نزدیک انسانوں کے ساختہ پر داختہ علوم، علم حقیقی کے لئے حجاب اور سالک کے لئے

انتشار و اضطراب کا موجب ہیں اس لئے یقین و معرفت کے لئے ان میں اضافہ و ترقی کے بجائے کمی اور ان سے گلو خلاصی کی ضرورت ہے، فرماتے ہیں:-

گر تو خواہی کت شقاوت کم شود      جہد کن تا از تو حکمت کم شود  
حکمتے کز طبع آید و ز خیال      حکمتے بے فیض نور ذوا بجلال  
حکمتے دنیا فزاید ظن و شک      حکمتے دینی برد فوق فلک

ان کے خیال میں استدلال مقدمات کی ترتیب اور نتیجہ کا استخراج ایک مصنوعی طریقہ ہے اور اس سے بہت محدود اور ناقص نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں اس سے دینی حقائق کا ثابت کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے لکڑی کے مصنوعی پاؤں کے ذریعہ آزادانہ چلنا پھرنا اور سفر طے کرنا، ان کی تمثیل ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ:-

پائے استدالیان چوبیس بود      پائے چوبیس سخت بے تمکین بود

ان کے نزدیک علم کلام اور متکلمانہ بحث و استدلال سے یقین کی کیفیت اور حلاوت ایمانی حاصل نہیں ہوتی اس لئے کہ منکلم جو تقلیداً متقدمین کے دلائل و براہین کو نقل کر دیتا ہے اور آموختہ سنا دیتا ہے خود بے روح اور ذوق و کیفیات یقین سے محروم ہے۔

آن مقلد صد دلیل و عد بیان      بر زبان آرد ندارد هیچ جان  
چونکہ گویندہ ندارد جان و فر      گفت اورا کے بود برگ و ثمر

وہ اس عقل جزوی کے بجائے جو محسوسات و معلومات اور تجربات کی پابند اور دنیا کے اندر محدود ہے اس عقل ایمانی کے قائل ہیں جو خود عقل کے لئے رہتا اور اس کے لئے چراغ راہ ہے اور جو اس سے وہ نسبت رکھتی ہے جو عقل جزوی جسم کے ساتھ اور جس کے بغیر یہ عقل عقل کہلانے کی مستحق نہیں اس لئے اس کو عقل عقل

کہہ سکتے ہیں، عقل عقل ان لوگوں کا حصہ ہے جو نورا ایمان اور دولت یقین سے بہرہ ور ہیں۔

بند معقولات آمد فلسفی شہسوار عقل عقل آمد صفی

عقل جزوی سے انسان کے دفتر کے دفتر سیاہ ہیں، عقل عقل سے عالم مطلع انوار ہے۔

عقل دفتر ہاگند یکسر سیاہ عقل عقل آفاق وارد پُر زماہ

از سیاہی و سپیدی فارغ است نور ماہش بردل و جان بانغ است

عقل ایمانی شہر کے لئے پاسبان کا حکم رکھتی ہے، عقل جزوی کا تقاضا خوف و ہراس اور دنیا کے

اندیشے ہیں، عقل ایمانی کا تقاضا اطمینان و سکون اور خواہشات نفس سے حفاظت ہے۔

عقل ایمانی پوشمنہ عادل است پاسبان و حاکم شہر دل است

عقل درتن حاکم ایمان بود کہ ز ہمیش نفس در زندان بود

ان کے نزدیک جس طرح جو اس عقل کے تابع اور محکوم ہیں اسی طرح عقل پر روح کو تفوق اور حکومت

حاصل ہے، روح ایک اشارہ میں عقل کی سیکڑوں گرہیں کھول دیتی ہے، اور جکیوں میں اس کی مشکل آسان کر دیتی ہے۔

حسن اسیر عقل باشد اے فلاں عقل اسیر روح باشد ہم بدان

دست بستہ عقل را جان باز کرد کار ہائے بستہ را ہم ساز کرد

فلسفی اولی معقولات اور ابتدائی معلومات کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی عقل نے

ابھی دروازہ سے باہر قدم ہی نہیں نکالا ہے۔

فلسفی گوید ز معقولات دون عقل از دلہن می ناید برون

فلسفی خود اپنی عقل و فکر کا مارا ہوا ہے، وہ ایسا بد قسمت مسافر ہے کہ اس کی پشت منزل کی طرف

اور رخ صحرای کی طرف ہے اس لئے وہ جس قدر تیز قدم بڑھاتا ہے، منزل مقصود سے دور ہو جاتا ہے۔

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت کو بد و کوراسوے گنج است پشت  
 کو بد و چنڈاں کہ افزوں می دود از مراد دل جدا ترمی شود  
 فلسفی دنیا کے علوم سے باخبر بڑا وسیع النظر صد ہا چیزوں سے آشنا مگر اپنے سے نا آشنا ہے  
 حالانکہ سب سے بڑا علم خود شناسی ہے۔

صد ہزاراں فضل دارد از علوم جان خود را می نداند این علوم  
 داند او خاصیت ہر جوہرے در بیان جوہر خود چون خرے  
 قیمت ہر کالہ می دانی کہ چلیت قیمت خود را ندانی از احمقیست  
 جان جملہ علمہا این ست این کہ بدانی من کیم در یوم دین  
 وہ اپنے زمانہ کے عالم و مکالم کو حکمت یونانی سے حکمت ایمانی کی طرف ہجرت کی دعوت دیتے ہیں  
 جو حقیقی علم اور حکمت ہے۔

چند چند از حکمت یونانیان حکمت ایمانی را ہم بخوان  
 وہ کہتے ہیں کہ تزکیہ نفس سے صحیح معرفت نفس حاصل ہوگی، لوح دل عقیقی صاف ہوگی، حکمت  
 ایمانی کے نقوش اتنے ہی روشن اور اجاگر ہوں گے اس وقت بغیر کتاب و استاد کے انبیاء علیہم السلام  
 کے علوم و معارف وارد ہوں گے اور حکمت کے دہانے کھل جائیں گے۔

نوش را صافی کن زا و صاف خود تا بہ بینی ذات پاک و صاف خود  
 بینی اندر دل علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا  
 دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

آئینہ دل چون شود صافی و پاک نقشہا بینی برون از آب و خاک

لہ تنوی ص ۵۵۵ ۵۵۵ ایضاً ص ۵۵۵ ایضاً ص ۵۵۵ ایضاً۔

روزِ دل گر کشادست و صفا می رسد بے واسطہ نورِ خدا

## دعوتِ عشق

ساتویں صدی میں علم کلام اور عقلیت کی جو سرد ہوا عالم اسلام میں مشرق سے مغرب تک چلی تھی اس سے دل کی انگلیٹھیاں سرد ہو گئی تھیں، اگر کہیں عشق کی چنگاریاں تھیں تو راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ورنہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک افسردہ دلی بلکہ مردہ دلی چھائی ہوئی تھی، اور کہنے والا دیر سے کہہ رہا تھا کہ۔

بھی عشق کی آگ اندھیرے مسلمان نہیں خاک کا ڈھیرے

اس سرد اور خواب آور فضا میں مولانا نے "عشق" کی صدا بلند کی، اور اس زور سے بلند کی کہ ایک بار عالم اسلام کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔

مولانا نے کھل کر عشق کی دعوت دی اور محبت کی کرامت اور عشق کی کرشمہ سازیاں بیان کیں۔

از محبت تلخا شیریں شود	وز محبت مسہا رزیں شود
از محبت درد ہا صافی شود	وز محبت درد ہا شافی شود
از محبت سخن گلشن می شود	بے محبت روضہ گلخن می شود
از محبت سنگ روغن می شود	بے محبت موم آہن می شود
از محبت سقم صحت می شود	وز محبت قہر رحمت می شود
از محبت مردہ زندہ می شود	وز محبت شاہ بندہ می شود

وہ عشق کی طاقت و نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جسم خاک از عشق بر افلاک شد . کوہ در رقص آمد و چالاک شد  
عشق جان طور آمد عاشقا طور مست و خرم و موسیٰ صغفا

وہ فرماتے ہیں، عشق نہایت غیور خود دار ہے، وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا، جس نے ایک بار اس کا مزہ چکھ لیا، اس نے پھر کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو . عجب چیز ہے لذت آشنائی

وہ دو عالم سے بیگانہ اور دنیا کا سب سے بڑا مست و دیوانہ ہے۔

بادو عالم عشق را بیگانگی اندر و ہفتاد دو دیوانگی

وہ شاہوں کا شاہ اور مطلوبوں کا مطلوب ہے، بادشاہوں کے تخت و تاج اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔

سخت پہاں است و پیدائشش جان سلطانان جاں در حسرتش

غیر ہفتاد و دولت کیش او تخت شاہان تختہ بندے پیش او

اس فقر جو راور عشق غیور کا جب وہ تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو خود ان پر جوش و سرستی کی کیفیت

طاری ہو جاتی ہے، اور وہ بخود ہو کر کہتے لگتے ہیں۔

ملک دنیا تن پرستان را حلال ما غلام ملک عشق بے زوال

وہ کہتے ہیں کہ عشق کی ہی وہ بیماری ہے جس سے بیمار کبھی شفا نہیں چاہتا، بلکہ اس میں اضافہ

و ترقی ہی کی دعا کرتا ہے۔

جملہ رنجوران شفا جو بند و این رنج افزون ہوید و درد و چین

خوبتر زین سم ندیدم شربتے زین مرض خوشتر نباشد صحتے

لیکن وہ ایسی بیماری ہے کہ پھر کوئی بیماری نہیں ہوتی۔

۱۵۳ ایضاً ۲۳۴ ۱۵۴ ایضاً ۲۳۴ ۱۵۵ ایضاً ۲۳۴ ۱۵۶ ایضاً ۲۳۴

آن کلامت می رہاند از کلام وان سقامت می جهانداز سقام  
بیماری بھی ایسی بیماری ہے کہ ہزار صحتیں اس پر قربان، اس کی کلفت ایسی کلفت ہے کہ ہزاروں  
راحتیں اس پر نثار۔

پس مقام عشق جانِ صحت است زنجہایش حسرت ہر راحت است<sup>۱</sup>  
یہ عشق پاکباز اگر گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے کہ طاعتیں اس کے سامنے بیچ ہیں، اس سے ایک گھڑی  
میں جو ترقی حاصل ہوتی ہے، وہ ساہا سال کی ریاضت سے میسر نہیں۔

زین گنہ بہتر نباشد طاعتے ساہا نسبت بدین دم ساعتے<sup>۲</sup>  
راہ عشق میں جو خون بہے وہ کسی پانی سے کم پاک نہیں، شہید عشق کو ہمارے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔  
خون شہیدان راز آبِ ولی تراست این خطا از صد صواب اولی تراست<sup>۳</sup>  
عاشق وہ جگر سوختہ و دل باختہ ہیں کہ ان پر عام انسانوں کے قوانین جاری نہیں کئے جاسکتے، جو  
گاؤں سراسر ویران ہو گیا ہو اس پر خراج کیسا؟

عاشقان را ہر نفس سوزید نیست بردہ ویران را خراج و عشریت<sup>۴</sup>  
عشق آدم کی میراث اور زیر کی و چالا کی شیطان کا سرمایہ ہے۔

داند آں کو نیک بخت و محرم است زیر کی زابلیس و عشق از آدم است<sup>۵</sup>  
زیر کی و چالا کی میں اپنے دست و بازو (عقل و خرد) پر اعتماد ہوتا ہے، عشق میں کسی کے دامن سے  
وابستگی ہوتی ہے اور سپردگی، زیر کی و چالا کی، نشاوری، (پیراکی) کافن ہے، "عشق" کشتی نوح، زیر کی و  
چالاک کو اس طوفان میں بچتے اور ساحل تک پہنچتے اور صاحبِ عشق کو غرق ہونے کب دیکھا گیا ہے؟  
زیر کی بساچی آمد در بحار کم زہد، غرق است او پایان کار

۱۵ ثنوی ۵۹۵ ۱۵ ایضاً ۱۵ ایضاً ۱۳۹ ۱۵ ایضاً ۱۵ ایضاً ۳۳۲

عشق چوں کشتی شود بہر خواص کم بود آفت، بود اغلب خلاص<sup>۱۵</sup>  
 عقل کی ہوشمندی، عشق کی حیرانی پر قربان کر دینے کے قابل ہے، وہ ہوشمندی محض ظن و قیاس  
 ہے، اور یہ حیرانی شاہدہ و عرفان۔

زیر کی بفروش و حیرانی بجز زیر کی ظنیت، حیرانی نظر<sup>۱۶</sup>  
 مولانا عشق کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب بننا تو ہر ایک کے بس میں نہیں، لیکن عاشق  
 بننا ممکن ہے، اگر خدائے تم کو محبوب نہیں بنایا ہے تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو۔

تو کہ یوسف نستی، یعقوب باش ہجو او باگریہ و آشوب باش  
 تو کہ شیریں نستی فرہاد باش چوں نئی لیلیٰ تو مجنوں گرد فاش<sup>۱۷</sup>  
 وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عاشق بننے میں جو مزہ ہے، اور ترقی ہے، وہ محبوب  
 بننے میں کہاں؟ اگر محبوبان عالم کو اس دولت سرمد کا پتہ چل جائے، محبوبوں کی صفت سے نکل کر عشاق<sup>۱۸</sup>  
 کی صفت میں شامل ہو جائیں۔

ترک کن معشوقی و کن عاشقی اے گمان بردہ کہ خوب و فائق<sup>۱۹</sup>  
 لیکن "عشق" کی یہ دولت بیدار کسی مردہ و ناپائدار محبوب کے لائق نہیں، عشق خود زندہ ہے،  
 اسے ایک زندہ و پائندہ محبوب چاہئے۔

عشق بر مردہ نباشد پائدار عشق را بر حئے جان افزائے دار<sup>۲۰</sup>  
 اسی زندہ و پائندہ حئی و قیوم محبوب سے عشق جاوداں کی تشقی و استواری ہے، اسی سے اس کی  
 تازگی اور آبیاری ہے۔

عشق زندہ در رواں و در لہر ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر



عشق آن زندہ گزین کو باقیست و ز شراب جانفزایت ساقیست

عشق آن بگزین کہ جملہ انبیاء یافتند از عشق او کار دکیست

حسن کی اس بارگاہ عالی میں عشق کو اپنی نارسائی کا شکوہ نہیں ہونا چاہئے کہ حسن ازل سدا

عشق نواز اور دوست طلب ہے۔

تو لگو مارا بداں شہ باز نیست با کریاں کار ہا دشوار نیست

یہ عشق دیکھنے میں ایک بیماری ہے جو دل کی شکستگی سے پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری بڑی جان لیوا

ہے، لیکن آدمی اگر اس کو برداشت کر لے جائے تو اس کا نتیجہ معرفت حقیقی اور حیات ابدی ہے۔

عاشقی پیدا است از راری دل نیست بیماری چوں بیماری دل

علت عاشق ز علتہا جداست عشق اضطراب اسرار خداست

یہ بیماری سب بیماریوں کی دوا اور ہر قسم کے نفسانی و اخلاقی امراض کے لئے شفا ہے، جن روحانی

امراض کے علاج سے طبیب مالوس اور معالج و مصلح دست بردار ہو چکے ہوں اور کوئی تدریس کارگرنہ ہوتی

ہو، عشق ایک نگاہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، برسوں کا مرض جب عشق کے ہاتھوں اپنے روحانی امراض

کہنہ سے شفا پاتا ہے، تو سرور و بیخودی کے عالم میں پکارا ٹھکتا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سو دئے ما اے طبیب جملہ علتہا کے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس

عشق ایک شعلہ ہے جو خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتا ہے اور محبوب کے سوا کسی کار و ادار

نہیں، وہ بڑا موٹا بڑا غیور ہے۔

عشق آن شعلہ است کو چوں بر فروخت ہر چیز معشوق باقی جملہ سوخت

۱۰۰ غنوی ص ۱۰۰ ایضاً ص ۱۰۰ ایضاً ص ۱۰۰ ایضاً ص ۱۰۰

تیغ لادری قتل غیر حق براند      در نگرزاں پس کہ بعد از لاپروماند  
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت      شاد باش لے عشق شکر ت سوز رفت

یہ عشق الہی ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں، زمانہ کی وسعت بھی اس کے لئے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستان سرائی کے لئے کوتاہ ہے، یہ اس حسن ازلی کا قصہ ہے، جس کا ناول ہے نہ آخر، اس لئے یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعترافِ عجز ہی مناسب ہے۔

شرح عشق ازین گویم بردوام      صد قیامت بگذرد و ان ناتمام  
زانکہ تاریخ قیامت را حد است      حد کجا آنجا کہ وصفِ ایزد است

## جہانِ دل

لیکن عشق جس کی دعوت مولانا اس جوش و خروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی اور بیداری اور دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں، ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی دل کی طاقتوں اور وسعتوں سے غفلت اور ناواقفیت بڑھتی جا رہی تھی اور دماغ کی عظمت کا سکہ دلوں پر پٹھیتا جا رہا تھا، دماغ روشن اور دل سرد ہوتے جا رہے تھے، معدہ زندگی میں مرکزی مقام حاصل کرتا جا رہا تھا، مولانا نے دل کی عظمت و وسعت کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے عجائبات و فتوحات بیان کئے، اور یاد دلایا کہ انسان اپنے اس جسمِ خاکی میں کیسا سدابہار باغ رکھتا ہے، اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے، جس میں ملک کے ملک گم ہو جائیں، جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں۔

امین آباد است دل لے مردماں      حصن محکم موضع امن و امان  
گلشن خرم بکام دوشاں      چشمہا و گلستان در گلستان

انہوں نے بتلایا کہ دنیا کے باغات چند دنوں کے مہمان، لیکن نخل دل سدا جوان اور باغ دل بہار  
بے خزاں ہے، جسم کا باغ برسوں میں لگتا ہے اور دم میں اجر جاتا ہے، دلوں کے باغ لگنے میں دیر نہیں  
لگتی، مگر اس کی رعنائی اور تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔

گلشنے کو نقل رویدیکم است      گلشنے کو عقل روید خرم است

گلشنے کو تن دیدگر و تباہ      گلشنے کو دل دید و افرتاہ

وہ تلقین کرتے ہیں کہ جسم کو جوان بنانے کی سعی لاکھ اور سکندر کی طرح "چشمہ جوان" کی ناکام  
تلاش کے بجائے عشق کے آب حیات کا ایک جرعمہ نوش جان اور دل کی زندگی کا سامان کرنے کی ضرورت  
ہے تاکہ صحیح معنی میں زندہ دلی اور نشاطِ روح حاصل ہو اور ہر دور زندگی میں تو انائی و رعنائی محسوس ہو۔

دل بجز تادائما باشی جوان      از تجلی چہرہ ات چوں از عنوان

طالب دل شو کہ تا باشی چو مل      تا شوی شادان و خنداں چو گل

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو! دل وہ نہیں ہے جو سینہ میں دھڑکتا ہے اور خواہشاتِ نفس  
اور بواہوسی کی آماجگاہ ہے، جو محبت کی لذت سے نا آشنا، تقین کی دولت کے محروم، ذوق و شوق سے خالی  
ہے، جس کی کلی کبھی کھلتی نہیں اور جس کی قسمت کبھی حکمتی نہیں، یہ دل نہیں، پتھر کی ایک سیل ہے۔

تنگ و تاریک است چون جان بہو      مینوا از ذوق سلطان و دود

نے دراں دل تا پ نور آفتاب      نے کشاد عرصہ نے فتح باب

یہ دل اپنی ساخت اور اپنی صورت، شکل، جسامت کے لحاظ سے ویسا ہی ایک دل ہے، جیسے اہل  
دل کا بیدار و بیتاب دل، لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو سوائے لفظی اشتراک و جسمانی مشابہت کے  
دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، وہ بھی پانی ہے، جو چشمہ صافی میں رواں ہے اور وہ بھی پانی ہے، جو کسی دلدل

یا کچھ کے اندر ہے، لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے جس سے پیاس بھی بجھائی جاسکتی ہے اور ہاتھ بھی صاف ہو سکتے ہیں، دوسرا پانی میں مٹی کا اتنا جز ہے کہ اس سے پانی کا کالینا مشکل ہے، یہی فرق دل اور دل میں ہے، ایک دل مادہ پرست اور بواہوس، ایک بے حس و مردہ دل انسان کا ہے، ایک دل ایسا روا دلیا کا ہے جس کی بلندی سامنے آسما بھی پست اور جس کی وسعت آگے سائے عالم کی وسعت گرد ہے، اس لئے سوچ سمجھ کر کہو کہ ہمارے پہلو میں بھی دل ہے

تو ہی گوئی مراد دل نیز ہست      دل فراز عرش اشد نہ بہ پست  
در گل تیرہ یقین ہم آب ہست      لیک ازاں آبت نیاید آبدست  
زانکہ گر آب است مغلوب گل است      پس دل خود را لگو کاین ہم دل است  
آن دے کر آسما نہا برتر است      آن دل ابدال یا پیغمبر است

لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہر حال دل ہے اور خدا کے یہاں کوئی دل مردود نہیں، وہ ہر دل کا خریدار ہے، اس لئے کہ خریداری سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہیں۔

کالہ کہ بیچ خلقش سنگرید      از خلافت آن کریم آن را خرید  
بیچ قلبے پیش او مردود نیست      زانکہ قصدش از خریدن بود نیست

پھر وہ فرماتے ہیں کہ معدہ کے قفس زریں کو چھوڑ کر دل کی آزادستی کی سیر کرو، اور خدا کی قدرت کا تماشادیکھو، تمہارے اور خالق کے درمیان بڑا حجاب ہی معدہ اور شکم پرستی ہے، تم اس حجاب سے نکلے کہ تم کو اس بارگاہ عالی سے سلام پہنچے۔

معدہ را بگذار سوئے دل خرام      تاکہ بے پردہ زحی آید سلام

مقام انسانیت

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پیہم مظالم، مسلسل جنگوں کے نتیجے میں عام انسانوں میں

زندگی سے بیزاری اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس کہتری پیدا ہو گیا تھا، اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا تھا، عجیبی تصوف نے فنائیت، انکار ذات اور خود شکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت کی تھی کہ خود نگری اور خود شناسی جس پر حرکت، جدوجہد اور کشمکش موقوف ہے، ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی، انسانوں کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول اور لوازم بشریت سے انسلخ، تجرد و تفرید کی تبلیغ، اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی، اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا تھا، عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہو گیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات اور شعر و شاعری میں تحقیر انسانیت کی روح سرایت کر گئی تھی، اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارہ میں بے اعتمادی، ناامیدی، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی، اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا، وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور زرقیات سے غافل تھا، مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہو گئی، اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا، مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعر و شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا "أَحْسِنِ تَقْوِيمَ" کے خطاب سے یاد فرمایا ہے، یہ لباس موزوں خاص طور پر اسی کے لئے قطع کیا گیا ہے اور اس کی قامت پر راست آتا ہے۔

کہ گرامی گوہر است ایے دوست جان  
"أَحْسِنِ تَقْوِيمَ" از عرشش فزون

"أَحْسِنِ تَقْوِيمَ" ذر ذالین، بخوان  
"أَحْسِنِ تَقْوِيمَ" از فکرت برون

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے سوا اور کس کے سر پر کرامت کا تاج رکھا گیا ہے اور کَرَّمْنَا اور

أَعْطَيْنَاكَ کے خطاب سے شرف کیا گیا ہے؟!

ایچ کرَّمْنَا شنیدیں آسمان      کہ شنیدیں آدمی پر غمان  
تاج کرَّمْنَا ست برفرقِ سرت      طوقِ أَعْطَيْنَاكَ آویز برت

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصہ کائنات اور مجموعہ اوصافِ عالم ہے انسان کیا ہے ایک کوزہ

میں دریا بند ہے اور ایک مختصر سے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے۔

آفتابے دریکے ذرہ نہاں      ناگہاں آں ذرہ بکشاید بان  
ذرہ ذرہ گرد و افلاک و زمین      پیش آں خورشید چوں حبت از کین  
بحرِ علمے در نمی پنہاں شدہ      در نہ گزرتن عالمے پنہاں شدہ

انسان آفرینش عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسوس ہے اسی سے اس عالم کا رنگ و بو

اور زندگی کی آبرو ہے اس کی طاعت تمام موجودات پر فرض ہے۔

ہر شرابے بندہ آں قد و حد      جملہ ستان را بود بر تو حسد  
ایچ محتاج مے گلگون نے      ترک کن گلگونہ تو گلگونے  
جو ہر است انسان و چرخ اور اعرض      جملہ فرع و سایہ اندو تو عرض  
علم ہوئی از کتب ہائے فسوس      ذوق بوش تو ز حلوائے سبوس  
خدمتت بر جملہ ہستی مفترض      جو ہرے چون عجز دارد با عرض

یہی نہیں بلکہ انسان منظر صفاتِ الہی ہے، وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا

عکس نظر آتا ہے۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۵ء، ۲۷ ایفام ۱۹۹۵ء، ۲۷ ایفام ۱۹۹۵ء، ۲۷ ایفام ۱۹۹۵ء، ۲۷ ایفام ۱۹۹۵ء

آدم اصطرلاب او صاف علوست      وصف آدم منظر آیات اوست

ہر چہ دروے می نماید عکس اوست      ہر چہ عکس ماہ اندر آ بچوست

خلق را چوں آب دان صا و زلال      و ندر و تابان صفات ذوا بجلال

علم شان و عدل شان و لطف شان      چوں ستارہ چرخ در آب روان

اس سب کے فرمانے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تعریف اور اس کی قدر و قیمت کا بیان

اب بھی مکمل نہیں اور سچ پوچھئے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر گویم قیمت آں ممتنع      من بسوزم، ہم بسوزد مستح

اس رفعت و بلندی کے بعد خدا کے سوا انسان کا کون خریدار ہو سکتا ہے اور کون اس کی قیمت

لگا سکتا ہے، حیف ہے کہ انسان خود اپنی قیمت نہ جانے اور ہر قیمت پر ہر ایک کے ہاتھ بک جانے کے لئے

تیار ہو، وہ بڑی دل سوزی سے فرماتے ہیں۔

اے غلامت عقل و تدبیرات و ہوش      تو چرائی خویش را از اداں فروش

پھر فرماتے ہیں کہ انسان کا سودا ہو چکا ہے، اللہ اس کا خریدار ہے، اور وہی انسان کا سچا قدر دان ہے

مشری ماست اللہ اشتری      از غم ہر مشتری ہین بر تر آ

مشری جو کہ جو یان تو است      عالم آغاز و پایان تو است

لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے جو جوہر انسانیت سے آراستہ اور حقیقت انسانیت سے

آشنا ہیں ان انسان نما آدمیوں کا ذکر نہیں جو انسانیت کا نول اور صورت ہی صورت ہیں جو اپنے نفس کے

مائلے ہوئے اور خواہشات نفس کے قلیل ہیں، یہ آدمی نہیں ہیں آدمی کی بے جان تصویریں ہیں۔

ایں نہ مردانند اینہا صورت اند      مردہ نان اند و کشتہ شہوت اند

۱۵۱۲ مثنوی ۱۵۱۵ ایضاً ۱۵۱۵ ایضاً ۱۵۱۵ ایضاً ۱۵۱۵ ایضاً ۱۵۱۵ ایضاً

ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی یہ حقیقی انسان کیاب اور عنقا صفت تھا، عام طور سے وہی انسان ملتے تھے جو پوپالیوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے، مولانا ان بہائم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اگٹا گئے تھے اور ان کو "انسان" کی تلاش تھی، اپنی تلاش تھی، اپنی تلاش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمہ کی شکل میں بیان فرماتے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہی گشت گردِ شہر      کروام و دو بلو لم و انسائم آرزوست  
زیں ہمران سست عناصر دم گرفت      شیر خدا و رستم و ستائم آرزوست  
گفتم کہ یافت می نہ شود جسته ایم ما      گفت آن کہ یافت می نشود آئم آرزوست

## دعوتِ عمل

مولانا کا تصوف اور ان کی تلقین، تعطل، بے عملی اور رہبانیت کی مبلغ نہیں، وہ عمل، جدوجہد، کسب اور اجتماعی زندگی کے داعی اور مبلغ ہیں، رہبانیت اور ترک دنیا کو اسلام کی روح کے منافی اور تعلیمات نبوت کا مخالف سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اگر اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو جمعہ و جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کیوں ہوتی، فرماتے ہیں:

مرغ گفتش خواجہ در خلوت مایست      دین احمد را ترتیب نیک نیست  
از ترتیب نہی فرمود آں رسولؐ      بدعتے چوں در گرفتے اے فضول  
جمہ شرط است و جماعت در نماز      امر معروف و ز منکر احتراز  
در میان امت مرحوم باش      سنت احمد ہل محکوم باش

ان کے زمانہ میں توکل تعطل محض کا مراد بن کر رہ گیا تھا، کسی قسم کی احتیاط و انتظام توکل



کے منافی سمجھا جاتا تھا، اور بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، مولانا نے توکل کا شرعی مفہوم بیان کیا، اور کسب کی ترغیب دی، اور اس کی فضیلت بیان کی "اعتقلا و توکل علی اللہ" کا مضمون حدیث بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

گفت پیغمبر باواز بلند	با توکل زانوے اشتر بہ بند
رمز اکا سب حبیب اللہ شنو	از توکل در کسب کاہل مشو
ز توکل کن تو با کسب اے عمو	جہد می کن کسب می کن موبو
جہد کن جدے نہاتا وار ہی	در تو از جہدش بہانی اہلی

انہوں نے کمزور جانوروں کی زبان سے توکل و تعطل کے وہ تمام دلائل نقل کر دیئے ہیں جو عام طور پر ضعیف الہمت اشخاص پیش کیا کرتے ہیں یہ دلائل بڑے معقول اور روزنی معلوم ہوتے ہیں، پھر ان کا تفصیل سے جواب دیا ہے، شکر کا جواب مولانا کے اصلی خیالات کا آئینہ ہے۔

شکر کی زبان سے وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو جو اعضا و جوارح اور جو صلاحیتیں اور طاقتیں دی گئی ہیں ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کوشش اور جہد و جہد مطلوب ہے، اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاؤڑا دے دے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے وہ زمین کھودے، یا چٹان توڑے اس کے لئے زبان سے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں، اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے تو اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور جسمانی قوت سے کام لیں، اور اپنے ارادہ و اختیار کو عمل میں لائیں، اس بنا پر سعی و عمل اور کسب و جہد علیٰ خدا کی مرضی اور فطرت کا اشارہ ہے اور تعطل اور ترک عمل منشاء الہی کے خلاف اور کفران نعمت ہے، صحیح توکل یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے اور نتیجہ کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیا جائے، کیونکہ کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے، فرماتے ہیں:-

لے اذن باندد و پھر اللہ پر توکل کرد ۲۶

گفت شیر آری دلے رب العباد  
 تردبانے پیش پائے ما نہاد  
 پایہ پایہ رفت باید سوئے بام  
 ہست جبری بودن اینجا طمع خام  
 پائے داری چوں کنی خود را تو لنگ  
 دست داری چوں کنی پنہاں تو چنگ  
 خواجہ چوں بیلے دست بندہ داد  
 بے زبان معلوم شد اور امراد  
 چوں اشارتہاں را بر جان نہی  
 دروقائے آن اشارت جان وہی  
 پس اشارت ہاں اسرار ت دہد  
 بار بردار دزد تو کار ست دہد  
 سعی شکر نعمت قدرت بود  
 جبر تو انکار آن نعمت بود  
 شکر نعمت نعمت افزون کند  
 کفر نعمت از کفست بیرون کند  
 ہاں محسب اے جبری بے اعتبار  
 جز بزیر آن درخت میوہ دار  
 تا کہ شاخ افشاں کند ہر لحظہ باد  
 بر سر خفتہ بریز و نقل و زاد  
 گر تو کل می کنی دو کار کن  
 کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

پھر شیر کی زبان سے وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جدوجہد اور سعی و عمل سنت انبیاء اور طریق اولیاء ہے، پھر وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مال و اولاد دنیا نہیں ہے، جس کی شریعت میں مذمت ہے اور جو خدا کی رحمت سے دور ہے وہ عقلت کی زندگی ہے، وہ فرماتے ہیں:-

شیر گفت آئے و لیکن ہم بسیں . جہد ہائے انبیاء و مرسلین  
 حق تعالیٰ جہد شان را راست کرد . انچہ دیدند از جفا و گرم و سرد  
 جہد می کن تا توانی اے کیا . در طریق انبیاء و اولیاء  
 چہیست دنیا از خدا غافل بدن . نے قماش و نقرہ فرزند و زن

مال را گر بہر دین باشی حمول      نعم مال صالح گفت آن رسول  
 بہد حق است و دوا حق است و د      منکر اندر نفی جہدش جہد کرد

وہ صرف اپنے زمانہ کے عوام ہی پر تنقید نہیں کرتے، اور صرف ان غلطیوں ہی پر نہیں ٹوکتے جن کا تعلق علمی اور دینی حلقوں سے ہے، بلکہ وہ پوری جرأت کے ساتھ اس طبقہ کی بھی تنقید کرتے ہیں جن کے ہاتھ میں زمام حکومت تھی، وہ بر ملا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اور بازیچہ اطفال بن گئی ہے، مطلق العنان شخصی سلطنت کے زمانہ میں یہ تنقید بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے، مگر مولانا کی حق گو زبان خاموش نہیں رہتی اور فرماتے ہیں:-

حکم چوں بردست زنداں اوقاد      لاجرم ذوالنون بزندان اوقاد

چوں قلم در دست غدارے بود      لاجرم منصور بردارے بود

چوں سفیہاں را بود کار و کیا      لازم آمد یثیثون الانبیاء

حکومت کے غلط ہاتھوں میں ہونے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے اپنے زمانہ کی شکایت فرماتے ہیں:-

حکم چوں در دست گمراہے بود      جاہ پندارید و در چاہے قناد

احمقاں سر در شدستند وز بیم      عاقلان سراکشیدہ در کلیم

### عقائد و علم کلام

مولانا نے عقلیات و حیات پر صرف تنقید اور اپنے زمانہ کے علم کلام کی بے اعتدالی، ظاہر پرستی اور لفظی معرکہ آرائی پر گرفت ہی نہیں کی، اور صرف باطنی احساسات و وجدان اور روح سے کام لینے اور عشق کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کلامی مسائل و مشکلات کو اپنے مخصوص انداز سے حل کرنے

اور اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرنے اور دل نشیں کرنے کی کوشش بھی کی ہے، گویا مولانا کی دعوت اور ان کا فلسفہ صرف سلبی اور ناقدانہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایجابی اور عملانہ بھی ہے، جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو نشل ہو کر رہ گئے ہیں، اور جن گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑ گئی ہیں، مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی اور وہ بدیہی حقائق اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں اور واقعات ہیں، مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضامندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، اور مخاطب کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اس کے دل میں تھی اور مولانا نے اس کی ترجمانی کی ہے، اس طرز کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ مثنوی سے دینی اصول و عقائد اور تکلمانہ مسائل و مباحث کے بارہ میں ایسا اذعان، شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے جو علم کلام کے پورے کتب خانہ سے نہیں پیدا ہوتا اس کے ساتھ ساتھ ایک ذوق و سرور بھی پیدا ہوتا ہے، جو ایک صاحبِ یقین اور صاحبِ عشق ہی کے کلام سے پیدا ہو سکتا ہے۔

مولانا اگرچہ اشعری مکتب خیال کے ایک کہنہ مشوق استاد اور تبحر عالم ہیں، مگر وہ اپنے ذاتی تجربہ اور موہبت ربانی سے عقائد و کلام میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک نئے علم کلام کے بانی ہیں، ان کی روش عام متکلمین اور علمائے عقائد سے بالکل علیحدہ ہے، اور نسبتاً قرآن مجید کے طرز استدلال اور فطرتِ سلیم سے زیادہ قریب ہے۔

## وجود باری

وجود باری کا مسئلہ علم کلام اور تمام مذاہب کا معرکہ الارا اور بنیادی مسئلہ ہے، قدیم علم کلام نے اس کے جو دلائل دیئے ہیں، وہ محض منطقی ہیں، ان سے اذعان اور یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، زیادہ سے

زیادہ آدمی لاجواب ہو کر رہ جاتا ہے، قرآن مجید کا طرز یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں انسان کی فطرت سلیم کو  
اکساتا ہے، اور اس پر اظہار اعتماد کر کے اس کے سوئے ہوئے احساس کو بیدار کر دیتا ہے، وہ پیغمبر کی  
زبان سے بے ساختہ کہلواتا ہے۔

اِنِّیْ اَللّٰہُ شَکُّ فَا طِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ . بھلا اللہ کے بارہ میں بھی شک ہو سکتا ہے، جو آسمان

زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

(ابراہیم - ۱۰)

اس بیساختگی اور استعجاب سے انسان کی فطرت چونک پڑتی ہے اور وہ اپنا صحیح کام کرنے لگتی ہے،  
پھر زمین و آسمان کی پیدائش سے پیدا کرنے والے مصنوعات سے صنایع اور آثار سے موثر کی طرف دفعہ  
دہری ہو جاتی ہے، سارے قرآن مجید میں یہی طرز استدلال ملے گا کہ اللہ کی نشانیاں دیکھو، اور مخلوقات  
سے خالق، اور مصنوعات سے صنایع تک پہنچو، قرآن کے نزدیک خدا کی معرفت کا یہی یقینی، مختصر اور  
بے خطر راستہ ہے۔

اب ہم دکھلائیں گے ان کو اپنے نونے دنیا میں

سَنُرِيْهِمُ الْاٰیٰتِنَا فِی الْاَفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ

اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے

حَتّٰی یَتَّبِعُوْنَ لِحُكْمِ اللّٰہِ ؕ اَوَلَمْ یَكُنْ

ان پر کہ یہ ٹھیک ہے، کیا تیرا رب تھوڑا ہے، ہر چیز

مِرْبٰکَ اِنَّہٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ ۝

پر گواہ ہونے کے لئے۔

(ہم السجدہ ۵۳۷)

مولانا نے بھی فتویٰ میں یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے، وہ جا بجا کائنات سے خالق کائنات  
کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن کرنے والا ان  
ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا، مگر جو کچھ ہو رہا ہے، یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس پر وہ کے پیچھے کوئی  
کرنے والا ہے، لیکن فعل ظاہر اور فاعل مخفی ہے۔

اسپ در جولان ونا پیدا سوار

دست پہنان و قلم بین خط گزار



گرمی بینی تو تند برفت در  
در عناصر گردش و جوشش نگر  
آفتاب و ماہ دو گاہ و خراس  
گردی کردند وی دارند پاس  
اختران ہم خانہ خانہ می روند  
مرکب ہر نفس و سعدے می شوند  
ابراہیم نازیبا نہ آتشیس  
می زند کہ ہاں چنین روزے چنین  
برقلان وادی بار این سو بار  
گو شمالش می دہد کہ گوش دار

پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کو خالق کائنات نے اپنے فائدہ کے لئے نہیں پیدا کیا، بلکہ انسان کے فائدہ اور اس کی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے اس طرح وہ خلق عالم کی مصلحت کو جس میں فلاسفہ و متکلمین سرگرداں ہیں بڑے دل نشین پیرایہ میں بیان کرتے ہیں، اس میں بھی ان کا البیلا پن اور سرور مستی موجود ہے۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ ست  
قصد من از خلق احسان بودہ ست  
آفریدم تاز من سو دے کنند  
تاز شہدم دست آلودے کنند  
نے برائے آں کہ من سو دے کنم  
در برہنہ من قبائے بر کنم  
من نہ کردم خلق تا سو دے کنم  
بلکہ تا بر بندگاں جو دے کنم

## نبوت اور انبیاء

انبیاء علیہم السلام کا تعارف وہ خود ان کی زبان سے کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ وہ طیبیان الہی اور معالجین قلوب ہیں، طیب نبض سے دل تک پہنچتے ہیں، انبیاء براہ راست دل تک پہنچ جاتے ہیں، طیبیوں نے صحت جسمانی کے بقا اور انبیاء دلوں کی شفا اور اخلاق و اعمال کی اصلاح اور اعتدال پر توجہ دی ہے۔

ما طیبیا نیم شاگردان حق  
بجز قلم دید ما را فافلق

آن طبیبان طبیعت دیگر اند      کہ بدل از نیضے بنسگند  
 مابدل بیواسطہ خوش بنکریم      کہ فراست مابہ اعلیٰ منظریم  
 آن طبیبان غذا نید و شمار      جان حیوانی بدیشاں استوار  
 آن طبیبان فعالیم و مقال      لہم ما پر تو نور جلال  
 کایں چنین فعلے تر انافع بود      واں چناں فعلے زرہ قاطع شود  
 این چنین قولے ترا پیش آورد      واں چناں قولے تر انیش آورد  
 آن چناں واں چناں از نیک بد      پیش تو بنیم و بنمایم جد  
 آن طبیبان را بود بوسے دلیل      وں دلیل ما بود وحی جلیل

دلائل نبوت میں بھی وہ عقلی دلائل و مقدمات سے استدلال کرنے کے بجائے عموماً ذوقی اور  
 وجدانی دلائل سے استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی ہر ادائیگی تلافی ہے کہ وہ پیغمبر ہے، وہ سرتاپا  
 اعجاز ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لئے (بشرطیکہ ان میں عناد اور تکبر نہ ہو) وہ خود اپنی نبوت کا دلیل ہوتا  
 ہے، یہی وہ چیز ہے کہ عبداللہ بن سلام نے جمال جہان آرا پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ فرمایا تھا:

وَ اِنَّكَ هَذَا لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ      بخدا یہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔

درد دل ہر کس کہ دانش رامزہ است      رود آواز پیغمبر معجزہ است

وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اور امت کے ضمیر میں ایک ایسی مناسبت ہوتی ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے،  
 امت کا ضمیر اس پر آمنا و صدقنا ہی پکارتا ہے، امت کا ضمیر پیغمبر کی ہر صدا پر وجد کرتا ہے، اس لئے کہ  
 وہ صدق ایسی دلکش، ایسی معصوم اور دنیا میں ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ اس میں اور کسی صدا اور  
 دعوت میں کوئی مناسبت اور کسی اشتباہ کا موقع نہیں، فرماتے ہیں:



چوں پیمیر از بروں بانگے زند جان امت در دروں سجدہ کند

زانکہ جنس بانگ او اندر جہان از کسے نشیندہ باشد گوش جان

آن غریب از ذوق آواز غریب از زبان حق شنود اتنی قریب

وہ کہتے ہیں کہ سننے والوں کو پیغمبر کی صداقت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ان کا کہنا

دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی اور نظام عالم اسی پر قائم ہے، پیاسے کو (بشرطیکہ سچی پیاس ہو) پانی کی دعوت

دی جاتی ہے تو وہ پانی کا ثبوت نہیں مانگتا، بچہ کو ماں دودھ پلانا چاہتی ہے تو وہ دلیل کا انتظار نہیں کرتا

طلب اور محبت اعتماد اور پیش قدمی کے لئے کافی ہے۔

نشتر اچوں گولی تو نشاب در قدح آب است بستان زود آب

ایچ گوید نشتر کیں دعویٰ است رد از برم اے مدعی! مہجور شو

یا بطفل شیر مادر بانگ زد کہ بیامن مادر مہاں اے ولد

طفل گوید مادر اججت بیار تاکہ باشیرت بگیرم من قرار

ان کے نزدیک معجزہ موجب ایمان نہیں ہے، یعنی ضروری نہیں کہ معجزہ دیکھنے والا ایمان

لے ہی آئے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ معجزہ دیکھ کر ایمان لانے والوں کے نام سیرت میں شکل سے

لیں گے، مشاہیر صحابہ وہی ہیں جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ایمان لائے تھے اور اصل

ایمان ان ہی کا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ معجزات تو مغلوب اور لاجواب کرنے کے لئے ہیں اور جو

مغلوب و لاجواب ہوتا ہے، وہ مشکل سے یار غار اور جان نثار بنتا ہے، اصل کشش اور تسخیر کی

چیز جنسیت اور مناسبت ہے۔

موجب ایمان نباشد معجزات بوائے جنسیت کند جذب صفا

یہ ثنوی منہا یہ ایضا

معجزات از پیرِ قہرِ دشمن است      بوائے جنسیت سوے دل بردن است  
قہرِ گردِ دشمن، آما دوست نے      دوست کے گرد بہ بستہ گردنے

انبیاء کے تذکرہ میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے غیور اور خود دار ہوتے ہیں، ان سے استفادہ کے لئے ادب اور نیاز مندی شرط ہے، وہ سلطانِ مزاج ہیں، ان کا منصب یہ ہے کہ وہ فرمائیں اور دوسرے سنیں، معارضہ اور مجادلہ محرومی کا باعث اور حجابِ اکبر ہے۔

گر ہزاراں طالب اندو یک لول      از رسالت بازمی ماند رسول  
ایں رسولانِ ضمیر را ز گو      مستمع خواہند، اسرافیل خو  
نخوتے دازند و کبرے چون شہان      چاکری خواہند از اہل جہان  
تا ادبہا شان بجاگ نادری      از رسالت شان چگونہ بر خوری

فرماتے ہیں کہ اور ایسا کیوں نہ ہو یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کس کا پیام لائے ہیں۔  
ہر ادب شان کے ہی آید پسند      کا دندیشان ز ایوان بلند

## معاد

مولانا کے نزدیک موت حقیقی زندگی کا پیش خیمہ اور انسان کی ترقی کا زینہ ہے، آبادی ویرانی کے بغیر ممکن نہیں، خزانہ جب ہی دستیاب ہوتا ہے، جب زمین کھودی جاتی ہے، جب بنے ہوئے مکان کو ویران کیا جا رہا ہو تو سمجھ لو کہ دوبارہ آباد کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

شاہ جان جسم را ویران کند      بعد ویرایش آبادان کند  
کرد ویران خانہ بہر گنج و زر      وز بہان گنجش کند معمور تر

۱۹۵۱ء      ۲۱ء شاہِ طبیعت      ۳۱ء ثنوی      ۲۱ء ایضا      ۵۱ء ایضاً

اس جسمِ خاکی کی شکست ایک بڑی تعمیر کی علامت ہے، کلی کے چکنے سے سمجھ لینا چاہئے کہ پھل آنے والے ہیں۔

چون شگوفہ ریخت میوہ سر کند چونکہ تن بشکست جان سر بر کند  
 وہ جو اذ مطلق، وہ فیاض برحق، جان جیسی دولت سے کر کیسے بالکل چھین لے گا، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ وہ زار و نزار جان لے کر زندگی جاوداں عطا فرمانا چاہتا ہے، وہ اس خاکدان سے نکال کر وہ نعمتیں عطا فرمانا چاہتا ہے، جو وہم و خیال میں بھی نہیں۔ مَالَاعَيْن رَأَتْ وَلَا اِذْنِ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ

آن کے اکثر کہ چین شاہے کشد سوئے تخت و بہترین جاہے کشد  
 نیم جان بستاند و صد جان دہد انچہ دروہمت نیاید آن دہد  
 ترقی کے مدارج عالیہ کے لئے فنا اور نیستی ضروری ہے، کبھی کسی نے اگلی تختی دھوئے اور پرانے نقش مٹائے بغیر تختی لکھی ہے؟ کبھی مٹی نکالے بغیر زمین کے اندر سے پانی نکلا ہے؟ لکھنے کے لئے آدمی سادہ کاغذ اور بونے کے لئے آدمی خالی زمین ڈھونڈتا ہے۔

روح را اول بشوید بے وقوف آنگہ بروے نوید او حروف  
 وقت شستن روح را بید شناخت کہ مر آن را دفترے خواہند ساخت  
 چون اساس خانہ تو افگند اولین بنیاد را بر می کنند  
 گل بر آزند اول از قعر زمین تا باخر بر کشی ماہ معین  
 کاغذے جوید کہ آن بنوشت نیست تخم کار و موضعے کہ کشتہ نیست

نیستی ہی، نیستی کا استحقاق پیدا کرتی ہے اور خالق کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے، منعم

ہمیشہ فقیروں ہی پر سخاوت کرتے ہیں۔

ہستی اندر عیسیٰ بتواں نمود      مالداران بر فقیر آرنند جود  
تم خود اپنی حالت پر غور کرو، تم برابر ارتقا کے منازل طے کرتے آئے ہو، اور لوٹ پھوٹ کا  
سلسلہ برابر جاری رہا ہے، تم نے ایک جامہ ہستی اتارا، دوسرا پہنا، ایک فنا سے تم نے بقا حاصل  
کیا، اگر تم پہلی حالت پر رہتے، تو تم کو یہ ترقی و کمال کہاں سے حاصل ہوتا، اور تم آب و گل میں مقید رہتے،  
اب آخری ترقی سے کیوں گھبراتے ہو، اور تمہارا ظاہر روحِ قفسِ عنصری سے نکلنے ہوئے کیوں ڈرتا ہے۔

توازن روزے کو درہست آمدی	آتشے یا خاک، یا یادے بدی
گردان حالت ترا بودے بقا	کہ رسیدے مژرا این ارتقا
از تبدل ہستی، اول نماسند	ہستی دیگر بجائے اوفشاند
این بقا با از فنا ہایاستی	از فنایش رو چو ابرتافتی
این فنا با چہ زیان بودت کرتا	بر بقا چفسیدہ اے بے لواء

اس لئے دراصل موت، موت نہیں زندگی کی تہید ہے، اور مرنے کا دن مومن کے لئے شامِ عم

نہیں صبحِ عید ہے۔

آزمودم مرگ من در زندگی است      چون رہم زین زندگی پابندیت<sup>۳</sup>

عارفوں کی موت کو عامیوں کی موت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، ان کو اس جہانِ فانی سے

چھوٹنے کا غم نہیں ہوتا، موت ان کے لئے مزیدہ جانفزا، اور موت کا جھونکا ان کے حق میں بادِ بہاری

بن کر آتا ہے، قومِ عاد پر جو ہوا چلائی گئی تھی، وہ حضرت ہود اور ان کے ساتھیوں کے لئے نسیم بن گئی تھی۔

ہو دگر د مومناں خطے کشید      نرمی شہ باد کا نجای رسید

ہمچنین باو اجل باعارقان نرم و خوش ہجو نسیم بوستان

## جبر و اختیار

جبر و اختیار کی بحث علم کلام کی مشکل ترین بحثوں میں سے ہے، ایک فرقہ اختیار کا منکر اور جبر محض کا قائل ہے، اور عقائد و فرق کی تاریخ میں جبر یہ کے لقب سے مشہور ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبور محض ہوتا، تو وہ خدا کی طرف سے امر و نہی کا مخاطب کیوں بنتا، اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے، کیا کسی نے کسی پتھر کو بھی حکم دینے سنا ہے۔

جبر لیں گوید کہ امر و نہی راست اختیارے نیست دین جملہ خطا است

جملہ قرآن امر و نہی است و عید امر کردن سنگ مرمر را کہ دید

فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور وہ روزمرہ کی زندگی میں اس عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے، کسی پرچھت کی لکڑی گر جاتی ہے، تو اس کو چھت پر غصہ نہیں آتا، سیلاب سامان بہا لے جاتا ہے، تو کسی کو اس پر غصہ اتارتے نہیں دیکھا گیا، ہوا کسی کی پگڑی اڑا لے جاتی ہے، تو کوئی ہوا سے نہیں لڑتا، سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور و بے تصور ہیں، البتہ انسان کے ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں، گو یا صرف وہی صاحب اختیار ہے۔

گر زسقف خانہ چوبے بشکند بر توافد سخت مجروح کند

ایچ خشم آیدت بر چوب سفت ایچ اندر کین او باشی تو وقت

کہ چرا بر من زد و دستم شکست با چرا بر من قناد کرد پست

واں کہ قصد عورت تومی کند صد ہزاراں خشم از تو سرزند

دریاید سیل رخت تو برد بیچ با سیل آورد گیتی خرد

گر بیاید باد و دستارت رلود کے ترا بباد، دل خشنے نمود

خشم در تو شد بیان اختیار تانہ گوئی جبر یا نہ اعتذار

وہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرماتے ہیں کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلہ سے فطری طور پر واقف ہیں،

اور سمجھتے ہیں کہ آلات و جمادات کا کچھ تصور نہیں، کتے کو بھی اگر پتھر مارا جائے تو وہ پتھر پر نہیں لپکتا، بلکہ

انسان کے پیچھے دوڑتا ہے، شتربان اونٹ کو مارتا ہے تو اونٹ کو لکڑی پر غصہ نہیں آتا، شتربان سے انتقام

لینا چاہتا ہے، جب حیوان تک اس حقیقت سے واقف ہیں تو انسان کو جبری بننے سے شرم آنی چاہئے۔

ہچنین گر برسگے سنگے زنی بر تو آرد رود گرد و منثنی

گر شتربان اشترے رامی زند آن شتر قصد زندہ می کند

خشم اشتر نیست با آن چوپا و پس ز مختاری، شتر بردہ است بو

عقل حیوانی چو دانست اختیار این گواے عقل انسان شرم دار

روشن است این لیک از طعم سحر آن خوردند چشم بر بند ز نور

چونکہ کلی میل آن نان خورد نیست روبہ تاریکی کند کہ روز نیست

## علت و معلول

اسباب و علل کے بارہ میں اسلامی فرقوں میں بڑی افراط و تفریط تھی، حکما کے نزدیک کائنات میں

علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے، اور طول کبھی علت، سبب کبھی سبب سے مختلف نہیں ہو سکتا، معتزلہ بھی

اس رائے سے بڑی حد تک متاثر ہیں، ان کا بھی رجحان یہی ہے کہ جو چیز جس کی علت مان لی گئی، جس شے کا

جو خاصہ اور اثر تسلیم کریا گیا، اس میں تغیر و انقلاب کا بہت کم امکان ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بڑی مشکل سے خرق عادت کا وجود تسلیم کرتے ہیں اور کسی شئی کے اپنے خاصہ کے خلاف وقوع پذیر ہونے اور کسی حادثہ کے بغیر سبب کے وجود میں آنے کو بہت بعید سمجھتے ہیں، اشاعرہ دوسرے سرے پر ہیں، ان کے نزدیک کوئی چیز کسی چیز کی علت نہیں، نہ کسی شئی میں کوئی خاصہ اور تاثیر ہے، اس بے اعتدالی اور انتہا پسندی سے بھی نقصان پہنچا، اور ہر شخص کو ہر بات کہنے اور اسباب کے انکار و ترک کا بہانہ مل گیا، اور اس سے ایک بے نظمی اور تعطل پیدا ہوا۔

مولانا کا مسلک ان دونوں سروں کے درمیان ہے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اسباب کی ایک حقیقت ہے، اور علل و معلومات، اسباب و مسببات کا ایک سلسلہ ہے، جس کا انکار نہ ممکن ہے، نہ معقول، عام منہ الشریہی ہے کہ مسببات اسباب کے تابع ہوں، اور اشیاء سے ان کے خواص برآمد ہوں، البتہ خرق عادت ممکن ہے، اور کبھی کبھی اس کا وقوع ہوتا ہے، فرماتے ہیں:-

بیشتر احوال بر سنت رود      گاہ قدرت خارق سنت شود

سنت و عادت نہادہ بامزہ      باز کردہ خرق عادت معجزہ

بے سبب گر عزت با موصول نیست      قدرت از عزل سبب معزول نیست

عام لوگ نہی اسباب کو دیکھتے ہیں، اور معذور ہیں کہ ان کو کچھ اور نظر نہیں آتا:-

حاصل آنکہ در سبب پچیدہ      لیک معذوری ہمیں را دیدہ

فرماتے ہیں کہ بیشک قطع اسباب مناسب نہیں، اسباب کی ایک حقیقت ہے، لیکن سبب الاسباب اس کے

بھی بالاتر حقیقت ہے، وہ سبب الاسباب رب الاسباب اور قادر مطلق ہے، اس طرح اسباب پرستی

نہ کرنے لگو کہ قادر مطلق کو بالکل معزول و معطل سمجھنے لگو۔

اے گرفتارِ سبب بروں میرے  
 ایک عزلِ آنِ سببِ ظنِ میرے  
 ہرچہ خواہد آنِ سببِ آورد  
 قدرتِ مطلقِ سببِ بردرد<sup>۱</sup>

یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اسبابِ صرف وہی نہیں ہیں جو ہمارے علم اور مشاہدہ میں ہیں بلکہ ان اسبابِ ظاہری سے اوپر کچھ اسبابِ اور ہیں جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں، یہ اسبابِ باطنی ان اسبابِ ظاہری کے لئے اس طرح سے سبب اور محرک ہیں جس طرح یہ اسبابِ ظاہری مسببات و نتائج کے لئے سببِ حقیقی اسبابِ ظاہری کو کبھی متحرک و عامل کر دیتا ہے اور کبھی بیکار و معطل کر کے رکھ دیتا ہے، سببِ اعلیٰ اور اصل سببِ ارادہ الہی اور امر الہی ہے۔

سنگ بر آہن زنی آتش جہد  
 ہم با مرتضیٰ قدم بیروں نہد  
 سنگ و آہن خود سببِ آمد و یک  
 تو بالاترنگراے مردِ نیک  
 کایں سببِ را آن سببِ آوردیش  
 بے سببِ شد سببِ ہرگز بخویش  
 این سببِ را آن سببِ عامل کند  
 باز گاہے بے پردِ عامل کند<sup>۲</sup>

ہم جس طرح ان اسبابِ ظاہری کو جانتے پہچانتے ہیں، انبیائے کرام ان اسبابِ حقیقی کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

واں سببِ با کابنیار را بر است  
 آن سببہا زین سببہا برتر است  
 این سببِ را محرم آمد عقل ما  
 واں سببہا راست محرم انبیار<sup>۳</sup>

وہ اسبابِ حقیقی اسبابِ ظاہری کے حاکم اور ان پر غالب ہیں۔

ہست بر اسبابِ اسبابِ دگر  
 در سببِ منگرد راں انگن نظر<sup>۴</sup>

یہ اسبابِ ظاہری اسبابِ حقیقی کے سامنے بہت حقیر و ضعیف ہیں، معاملہ حقیقی اسبابِ ہی سے وابستہ ہے



ایں سبب ہچومریض است و علیل  
ایں سبب ہچو چراغ است و قلیل  
شب چراغت را قیلے تو بتاب  
پاک دان زینہا چراغ آفتاب

انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں چونکہ ساری دنیا اسبابِ ظاہری میں الجھی ہوتی ہے، اور اسبابِ پرستی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے، خالقِ اسباب اور اس کی قدرت مطلقہ بالکل نگاہوں سے اوجھل اور دماغوں سے محو ہو چکی ہوتی ہے، اور عالم کا عالم شرک اور ظواہر و مظاہر پرستی میں گرفتار ہوتا ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام اسبابِ پرست لگاتے ہیں، اور اسباب کے بجائے سبب اور قادرِ مطلق کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہاتھوں سے سلسلہ اسباب کے بالکل خلاف واقعات ظاہر کر کے اور معجزات دکھا کر اسباب کی بے حقیقتی اور کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند  
مجزاتِ خویش بر کیوان زدند  
بے سبب بر بحر ابشکا فتند  
بے زراعت چاش گندم یافتند  
رنگیہا ہم آرد شد از سعی شان  
پشم برابر شتم آمد کشکشان  
جملہ قرآن است در قطع سبب  
عز درویش و ہلاک بولہبے

لیکن اللہ تعالیٰ کی عمومی عادت اور سنت جاریہ اسباب سے مسببات کا وجود ہے، اور اس سے بندوں کو سعی و تعلیم مقصود ہے۔

لیکا غلب بر سبب راند نفاذ  
تا بداند طالے جستن مراد

اسی انداز پر مولانا ان تمام کلامی مسائل اور مذہب کے اصول و عقائد کی تشریح اور تلقین کرتے چلے جاتے ہیں، جن کو منکلمین و اشاعرہ کے مناظرانہ طرز استدلال اور فلاسفہ کی طلسم آرائی نے چیتان او نہایت خشک اور محدود موضوع بحث بنا دیا تھا، مولانا نے ان مباحث و حقائق کو علم کلام اور فلسفہ

کے تنگ کوچے سے نکال کر عام فہم اور عقل سلیم کے وسیع آفاق میں لے جا کر بحث کی، اور دل نشین مثالوں، عام فہم نکتوں اور سادہ و موثر طرز بیان سے ان کو روزمرہ کی حقیقت اور زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

## ثنوی کا اثر

ثنوی نے عالم اسلام کے انکار و ادبیات پر بڑا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں ملیں گی، جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقے کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے، چھ صدیوں سے مسلسل دنیا کے عقلی، علمی، ادبی حلقے، اس کے نعموں سے گونج رہے ہیں، اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے، اس سے ہر دور میں شاعروں کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا، اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتی رہی، معلمین و متعلمین کو اپنے زمانہ کے سوالات و شبہات کو حل کرنے کے لئے اس سے نئے نئے دلائل، دل نشین مثالیں، دلائل و حکایتیں، اور جواب کی نئی نئی راہیں ملتی رہیں، اور وہ اس کے سہارے اپنے زمانہ کی بے چین طبیعتوں اور ذہین نوجوانوں کو مطمئن کرتے رہے، اہل سلوک و معرفت کو اس کے عارفانہ مضامین، دقیق و عمیق علوم اور سب سے بڑھ کر محبت کا پیغام اور سوز و گداز اور جذب و مستی کا سامان ملتا رہا، اور وہ ان کی خلوتوں اور انجمنوں کو صدیوں ترپاتی، اور گراتی رہی، اس لئے ہر دور کے اہل محبت اور اہل معرفت نے اس کو شمع محفل اور تر جانِ دل بنا کر رکھا۔

اس کے مضامین کی تنقید سے بالاتر اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے میرا نہیں، بہت سے فاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہونہی نے اس سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھایا ہے، وحدت وجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لئے دلائل و شواہد مل جاتے ہیں، وہ بہر حال ایک

انسان کا کلام ہے، جو معصوم نہ تھا، اور جس کے مضامین میں اس کے قلبی واردات اور خارجی تاثرات کو بھی دخل ہے، اس سب کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا علمی کارنامہ اور اسلام کی عقلی برتری اور اس کی غیر فانی زندگی کا ثبوت ہے، اس نے عالم اسلام کے فکری تعطل، علمی و ادبی جمود، اور تقلیدی ادب و علم کلام پر کاری ضرب لگائی، اور اسلام کے کاروان فکر کو جو ساتویں صدی میں آمادہ قیام اور نائل بہ آرام تھا، دوبارہ متحرک و سرگرم سفر کر دیا۔

اس کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر دوبارہ مادیت و حسیت کا حملہ ہوا، اور یورپ کے نئے فلسفہ اور سائنس نے قلوب میں شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی، اور ایمانیات و غیبیات کی طرف سے ایک عام بے اعتمادی پیدا ہونے لگی، اس کا رجحان بڑھنے لگا کہ ہر وہ چیز جو مشاہدہ و تجربہ کے ماتحت نہ آسکے، اور جو اس ظاہری اس کی گرفت نہ کر سکیں، وہ موجود نہیں، عقائد کی قدیم کتابوں اور قدیم طرز استدلال و علم کلام نے اس کا مقابلہ کرنے سے معذوری ظاہر کی تو ثنوی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا (جو یورپ کی مادی و سیاسی فتوحات سے کم خطرناک نہ تھا) کامیاب مقابلہ کیا، اور دلوں میں دوبارہ دینی و غیبی عقائد کی وقعت، علوم انبیاء کی عظمت، عالم غیب کی وسعت، اور قلب و روح، ایمان و وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کر دیا، اور فلسفہ و مادیت کے صدہا زخم خوردہ نوجوانوں اور قاضیوں کو جو اتحاد و ارتداد کے دروازہ پر کھڑے تھے، یا ایمان و اسلام کی سرحد عبور کر چکے تھے، دوبارہ ایمان و یقین کی دولت عطا کی، ہندوستان میں ان اہل علم کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو ثنوی کی بدولت دوبارہ دولت اسلام نصیب ہوئی، اور وہ اس کے فیض سے مسلمان اور صاحب ایمان ہیں، بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان فیلسفہ اور مفکر (ڈاکٹر محمد اقبال)

نے شیخ رومی کے فیض و ارشاد اور اپنے تلمذ و استر شاؤ کا جا بجا اعتراف کیا ہے، اور اس کا بڑا اظہار کیا ہے کہ ثنوی نے ان کو ایک نئی روح اور ایک نیا جذبہ عطا کیا ایک جگہ فرماتے ہیں:-

پیر رومی مرشدِ روشن ضمیر      کاروانِ عشق و مستی را امیر  
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب      خمیر را از کہکشان ساز و طناب  
نور قرآن در میانِ سینہ اش      جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش  
از تئے آں نے تو از پاک زاد      باز شورے در نہاد من قنادر  
دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

رومی آں عشق و محبت را دلیل      تشنہ کا مان را کلاش سلسبیل<sup>۱۲</sup>

لیکن اس کے ساتھ وہ شکایت اور احتجاج کرتے ہیں کہ ایک طبقہ نے اپنی نظر اس کے الفاظ اور ظاہری مطالب میں محدود رکھی، اور اس کو جاں گدازی اور دل سوزی کے بجائے نقص و وجد کا ذریعہ بنایا۔

شرح او کردند اور اکس ندید      معنی او چوں غزال از مارید  
رقص تن از حریت او آموختند      چشم را از رقص جان برد و خفتند<sup>۱۳</sup>

لیکن یہ نقص ہمارا ہے، ثنوی کا نہیں، ثنوی اس دور انقلاب میں بھی رفیقِ راہ بن سکتے ہیں، اس مادہ پرست دور کی سب سے زیادہ نایاب جنس سوز و گداز اور محبتِ پاک باز ہے:-

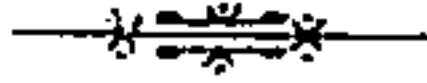
دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے      پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیاک نہیں ہے  
وہ آنکھ کہ ہے سرمہ آفرنگ سے روشن      پر کار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے<sup>۱۴</sup>

یہ دولت بیدار ثنوی سے حاصل کی جاسکتی ہے، عصر حاضر کے نوجوانوں کو وصیت کرتے ہوئے

۱۲ ثنوی کا پس چہ پایہ کردے اقوام مشرق ص ۱۲ جاوید نامہ ص ۱۳ ایضاً ص ۲۳۳ ۱۳ بال جبریل۔

فرماتے ہیں:-

پیر رومی را رفیقِ راه ساز      تا خدا بخشد ترا سوز و گداز  
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست      پائے او محکم فتد در کئے دوست



# INDEX

اَشَارِيہ

(انڈیکس: "تاریخ دعوت و عربیت" حصہ اول)

مترجم

محمد عیاض الدین ندوی



۲۱۶	ابن المرجم الظالم	۲۸۷	ابن دقین العید
۸۸	ابن السیب	۱۱۳	ابن الراوندی
۲۴۹	ابن المقنع	۲۰۱-۳۱۹۸	ابن رجب
۲۲۵	ابن ناصر (محدث)	۱۳۵	ابن رشد
۲۲۷۱۲۲۴۱۲۰۰	ابن نجار	۳۰۲۱۲۹۹۱۲۹۷۱۲۹۵۱۲۸۸	ابن ابی
۱۱۶۱۱۰۸	ابو اسحاق اسفرائینی	۶۳۱۵۲	ابن سعد
۱۹۵۱۱۶	ابو اسحاق شیرازی	۲۰۲	ابن السمانی
۱۸۹	ابوبکر ابن العربی	۲۸۵	ابن سینا
۱۱۲	ابوبکر اسماعیلی	۷۴	ابن شہاب زہری
۱۸۵۱۱۸۳۱۱۶۱۱۰۸	ابوبکر باقلانی	۲۵	ابن جبرائیل
۳۰۱۳۹۱۳۶	ابوبکر بن حزم	۱۸۹۱۱۰۵	ابن عساکر دمشقی
۸۷	ابوبکر بن عیاش	۳۱۸۱۳۰۹۱۳۰۸	ابن العلقمی (مؤید الدین ابوطالب محمد)
۱۱۲	ابوبکر بن صیرفی	۲۲۷	ابن الفارسی
۸۲	ابوبکر خلیل	۱۹۸۱۸۲	ابن قدامہ
۳۲۴	ابوبکر سلیمان	۲۷۸	ابن قرہ ارسلان
۷۹۱۶۵	ابوبکر فریبانی	۲۸۵	ابن قسیم
۲۸۱	ابوبکر محمد بن الطیب	۳۰۷۱۳۰۵۱۲۱۵۱۲۰۷۱۱۹۷۱۸۸	ابن کثیر
۲۷۳	ابو جعفر	۳۳۰۱۳۲۱۱۳۲۰۳۱۸۱۳۰۸	
۲۲۸	ابو حازم	۸۰	ابن ماجہ



۱۰۰	ابوالعباس رقی	۷۵	ابوالحاکم رازی
۹۷	ابوعبد الرحمن شافعی	۱۳۱، ۱۱۹، ۱۱۱-۱۶۱، ۰۳-۹	(امام) ابوالحسن اشعری
۱۰۷	ابوعبد الشرحین خفیف	۳۳۶، ۱۸۵، ۱۸۴	
۱۹۹	ابوعبد الشرحین یوسف البرزالی	۱۰۸	ابوالحسن بابلی
۲۸۱، ۲۷۷، ۲۷۵	ابوالعرفان ندوی	۱۸۹	ابوالحسن بصری
۲۰۱، ۱۰۵	ابوعلی جبالی	۱۰۵	ابوالحسن اجمالی
۱۹۱	ابوعلی فارمدی	۳۱۰	ابوالحسن خزرجمی
۵۶	ابوعمر بن اعلیٰ	۲۹۹	ابوالحسن شاذلی
۳۱	ابوالفرج اصبہانی	۱۶۱، ۱۰	ابوالحسن علی ندوی
۱۹۵	ابوالقاسم ہروی	۱۱۴	ابوالحسن ہروی
۲۸۷	ابومحمد القاسم ابن عساکر	۱۵۵، ۱۵۴، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۶۸	(امام) ابوحنیفہ
۲۳۰، ۱۷۹	ابوسلم خراسانی	۵۷	ابویمان التوجیدی
۲۲۷	ابوالمنظف	۱۹۸	ابوالنخیر حاد
۱۳۰، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴	(امام اکرمین) ابوالعالی عبدالملک جوینی	۸۰	(امام) ابوداؤد سجستانی
۲۲۳، ۱۸۹، ۱۱۴		۱۹۷، ۱۹۵	ابوزکریا تبریزی
۱۱۵، ۱۱۴	ابومنصور ماتریدی	۲۳۹	ابوسعید جبالی
۲۲۳	ابوالنجیب سہروردی	۱۹۸	ابوسعید مخزومی (مبارک بن علی)
۱۳۰	ابونصر اسماعیلی	۲۰۳	ابوسلیمان خطابی
۱۶۳	ابونصرتار	۱۳۴	ابوطالب کی



۲۹	بلاذری	۲۶۱	الویب نجم الدین
۱۱۴	بندار بن حسین	(ب)	
۲۳-۲۵	بودھ	۱۲۷	باب (بابی مذہب بالی)
۱۲۱	بوعلی ابن سینا	۳۲۶	باقا خان
۸۲	بولطی (شافعی)	۲۴۱، ۱۳۴	بازید بسطامی
۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۲-۶۴	(قاضی) بہار الدین ابن شہار	۲۹۸	(قاضی القضاة) ابن جاور
۳۳۲، ۲۷۷-۸۱، ۲۷۷، ۲۷۳		۱-۱۱۹، ۱۷۱، ۱۷۸، ۱۷۵	(امام) بخاری
۲۵۵	(سید) بہار الدین ترمذی	۳۳۱	بدر الدین گوہر تاش
۲۲۴	(شیخ) بہار الدین ذکریا ملتانی	۳۳۵، ۳۳۴، ۳۳۳-۳۳۹	بدیع الزمان فروزانفر
۲۳۹	(سید) بہار الدین رازی	۳۵۲-۵۴، ۳۳۹، ۳۳۱	براق خان
۲۲۹، ۲۲۵، ۲۲۱، ۲۳۹	(سلطان) بہار الدین ولد	۳۲۶، ۳۳۵	برک خان
۲۵۹، ۲۵۵، ۲۵۴، ۲۵۰		۳۵۲	(سید) برہان الدین
	(پ)	۳۳۱، ۳۳۸	برہان الدین محقق ترمذی
۳۱۱، ۲۷۰	پاپائے روم	۶۸	بزاری
۲۵۲	پطرس (راہب)	۳۱۴، ۱۵۷، ۱۵۶	بتانی
	(ت) (ث)	۱۶۵، ۱۶۴	بشر بن حارث
۲۲۵	تاتاری خان	۲۳۷، ۲۳۱، ۲۳۱، ۱۷۲	بشرحانی
۳۱۸	تاج الدین بگی	۱۳۲	بقراط
۲۹۸	(قاضی القضاة) تاج الدین	۱۱۴	بلال بن ابی بردہ

۲۳۱-۲۳	جمال الدین	۸۰	(امام) ترمذی
۲۸۸	جمال الدین حاجب	۱۳۱	ترکان خاتون
۱۷	جنید بغدادی	۳۳۱-۳۳	تغلق تیمورخان
۱۳۴	جنید شبلی	۲۷۷	تقی الدین
۲۴	جو اہر لال نہرو	۳۲۹، ۳۲۶	نگو دارخان
۳۲۵	جو جی خاں	۳۳۷	تلمذ حسین گورکھپوری
۲۲	جے، بیسولنگر (J. BASSMULINGER)	۲۶۸	تنگیو
	(ج)	۲۹۸	(الملك المعظم) توران شاہ
۲۶۵	چاٹیلون	۴۳۰	(امیر) توزون (نوروز بیگ)
۳۳۰-۳۲	چغتائی خاں	۳۳۷	توکل حسین
۲۶۶، ۲۵۹، ۲۵۶، ۲۵۴، ۲۵۳، ۲۱۹	چلیی حسام الدین	۵۷	ثنا بت بن قرہ
۳۴۸	چلیی علاء الدین		(ج)
۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲	چنگیز خاں	۷۰	باخا
	(ح)	۱۲۶	جبرئیل
۱۹۷	(حضرت) حسنؑ	۸۸	جویریہ بن عبدالمکید (محدث)
۶۸، ۳۴	(حضرت) حسینؑ	۹۵	جسرین ولید
۲۱۳	(حضرت) حوآ	۳۳۳	جلال الدین حسن
۱۳۴	حارث محاسبی	۳۲۸، ۳۲۶، ۳۲۵، ۱۷۷	(مولانا) جلال الدین رومی
۲۸۵	حاکم باشر	۳۹۹، ۳۵۷، ۳۳۲، ۳۳۱	

	(س)	حبیب الرحمن خاں شروانی	۷۶
۳۳۹،۳۳۵	(امام) رازی	سجاد بن یوسف	۶۳،۵۶
۲۰۶	راشد	وارہ	۱۹۹
۸۲	ربیع (شافعی)	حسن لہریؒ	۲۲۷،۱۶۵-۶۷۱،۶۳۶،۵۵۵-۵۷۱،۵۳۱،۵۱
۵۶	ربیع بن انس	حسن بن سہل	۷۰
۷۲	ربیع بن صلیح	حسن بن صباح اسماعیلی	۳۲۳
۳۵	رجاء بن حیوہ	حسن بن قحطیہ	۶۸
۲۶۹	رچرڈ	حسن المثنیٰ	۳۳
۳۳۲،۳۲۹	رشید الدین	حلاج	۲۲۹
۳۲۶،۳۲۵	رکن الدین بیبرس	حنبل بن ہلال	۸۶
۳۲۳	رکن الدین سنجاسی	حنین (مغنی)	۳۲
جلال الدین	(مولانا) روم دیکھئے	وشب	۳۱
۲۴	(سز) ریس ڈائس (RHYS DAYIS)	(خ)	
۲۶۶،۲۶۵،۱۲۵۴	ریچی نالڈوائی کرک	(حضرت) خبابؓ	۱۰۰
	(س)	خان اندا	۳۳۳
۵۵	(حضرت) زید بن ثابتؓ	خطیب بغدادی	۱۱۵،۱۷۲
۸۲	(امام) زفر	(ذ) (ذ)	
۸۸	(امام) زہری	دیاند سروتی	۲۶
۶۸	زید بن علی	(حافظ) ذہبی	۱۱۳،۱۹-۱۸۹،۱۸۷،۱۳۳

۳۸۷	سيف الدين آدى	۳۳۳	زين الدين سجاسى
۲۱۲۰	سينٹ پال	۱۸۸۱۸۳۱۱۳۷	زين الدين عراقى
۲۹۹۱۲۸۸	سيوطى	(س)	
(مش)		۳۳	سالم بن عبدالشر
۱۵۵۱۱۵۲۱۹۷۱۸۸۱۸۷۱۸۲۱۸۱	(امام) شافعى	۳۰۵	سالم حسين
۳۵۷۱۱۹۱۱۶۷۱۱۳۷۱۸۲۱۷۱	شبلى نعمانى	۳۵۸۱۳۵۷۱۳۵۵۱۳۴۷۱۳۲۵۱۳۲۲	سپه سالار
۲۳۸	(شيخ) شبلى	۹۵	سجادہ
۲۹۳	شرف الدين عبد اللطيف	۳۳۲	سعد الدين حموى
۲۲۲	شرف الدين عيسى	۳۱۹	(شيخ) سعدى
۲۳۵	(قاضى) شريك	۷۳	سعيد بن ابى عمرو بدنى
۲۳۸	(قاضى) شريك	۵۵	سعيد بن جبير
۵۵	(امام) شعبى	۳۳	سعيد بن المسيب
۱۹۸	(امام) شعرانى	۲۳۷۱۱۵۳۱۷۱	سفيان ثورى
۳۶۱۱۳۵۵۱۳۵۳۱۳۳۳-۵۲	شمس الدين تبريزى	۱۳۲	سقراط
۳۶۱۲۶۱۲۵	شكر آچارى	۳۷۳	سكندر
۳۰۵۱۲۸۸	شهاب الدين البوشامه	۲۳۸۱۵۳۱۵۰۱۳۳-۳۶	سليمان بن عبد الملك
۲۹۹۱۲۲۳	شهاب الدين بهروردى	۷۶	(سيد) سليمان ندوى
۲۶۹	شيردل	۲۰۷۱۱۸۸۱۱۸۷۱۱۶۱۱۶۰	(سلطان) سنجر
۲۶۱	شيركوه اسد الدين	۳۳۵	سیرادادرا

شیطان

۱۲۰۱۲۵۱۲۳۸۱۲۳۷۱۲۳۸

ص ص

ع

۱۲۷۱۲۱

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام

۳۵۱۳۴

(حضرت) عمرؓ

۲۹۲۱۲۹۱

صالح اسماعیل

۳۳۸۱۲۳۸۱۲۳۶۱۸۵

(حضرت) علیؓ

۹۳

صالح بن امام احمد

۲۱۲

(ام المؤمنین حضرت) عائشہؓ

۱۸۸

صدر الدین

۱۶۴

(حضرت) عبدالشکر بن سعودؓ

۳۶۱۱۳۵۶۱۳۴۲

صدر الدین قونوی

۹۱۰۹۰

عادم ابوالنعمان

۲۲۴۱۱۸۳

صدیق حسن خان

۷۹

عاصم بن علی

صلاح الدین الیوبی ۲۶۵۰۷۲۱۲۶۱-۶۳۱۲۵۶۱۲۵۲

۳۴

عاصم بن عمر

۲۴۲۱۳۰۷۱۳۰۴۹۸۱۲۸۵-۸۷۰۲۸۳۱۲۸۲

۲۸۳

عاصد بن الشتر

صلاح الدین زکوب ۳۶۱۱۳۵۹۱۳۵۱-۵۴۱۳۴۵

۳۰۴

عالمگیر اعظم

۴۱

صنعاک بن عبدالرحمن

۲۲۳

(شیخ) عبدالبجار

ط

۲۸۱

(قاضی) عبدالبجار

۳۱۹

طاہر

۹۷

عبدالرحمن بن اسحاق

۱۱۵

(امام) طحاوی

۸۲

عبدالرحمن بن قاسم

۳۳۱

طر مشرف خان

۸۷

عبدالرحمن بن ہدی

۹۵

طیفود

۲۲۲

(شیخ) عبدالرزاق

ظ

۸۸

عبدالرزاق بن ہمام

۳۲۲۱۳۰۲۱۲۹۸

(الملك) الظاہر بیریس

۲۲۳

عبدالعزیز

۳۰۶۱۲۸۲۱۲۷۹

(الملك) الظاہر لاغر از دین الشتر

۲۴۲	عثمان رومی	۲۴۸	عبدالعزیز بن سلیمان
۹۹	عجیف	۲۸۸	عبدالعظیم المنذری
۳۳	عزوه بن زبیر	۱۴۷۱۳۱	عبدالغافر فارسی
۲۸۷، ۲۰۱	(شیخ الاسلام) عبدالدین بن عبدالسلام	۳۰۶	عبدالعفی بن قاتر فراس
۳۰۳، ۳۰۲، ۲۹۷-۹۹، ۲۹۲-۹۳، ۲۸۸		۲۰۳، ۲۰۱، ۱۹۹، ۱۹۷، ۱۹۶	(شیخ) عبدالقادر جیلانی
۲۲، ۳۱	عکرم	۲۲۰، ۲۰۷، ۲۰۶	
۳۰۶	علاءالدین الطبری الظاہری	۱۴۷	عبدالقادر حسنی
۳۴۱، ۳۴۰	علاءالدین کیقباد	۱۹۵	عبدالقادر جرجانی
۳۲۹، ۳۱۰-۱۴، ۳۰۳-۳۴۰	علاءالدین محمد خوارزم شاہ	۹۳	عبدالشہین امام احمد
۳۳، ۳۲	علی بن حسین (زین العابدین)	۳۴	عبدالشہین زبیر
۱۰۱	علی بن مدینی	۲۸۷	عبدالشہین سلام
۱۹۱-۹۳	علی بن یوسف تاشقین	۸۲	عبدالشہین عبدالحکم
۲۶۱، ۲۵۳	عمادالدین زنگی	۱۵۶، ۷۱	عبدالشہین مبارک
۲۷۸	عمادالدین انکاتب	۸۲	عبدالشہین وہیب
۱۸۹	عمر بن ابی الحسن رواسی	۳۳	عبدالشہرا المحض
۳۹، ۳۴-۳۶، ۳۱	(حضرت) عمر بن عبدالعزیز	۳۲	عبدالملک بن مروان
۲۵۸، ۲۴۸، ۲۴۷، ۱۹۱، ۱۴۸-۵۳، ۴۱، ۴۰		۲۲۲	(شیخ) عبدالوہاب
۲۰۱	عمر کیسانی	۱۹۳	عبدالمؤمن
۳۰	عمرو بنت عبدالرحمن	۲۸۱	عبد



البکر	فریابی	۳۲۳۱۲۱۲۱۳۱۰	عنایت اللہ
۷۹	فریبری	۶۶	عوام بن و شب
۲۶۲	فرید الوجدید	(ع)	
۱۸۸	فرید الزمان	۳۳۰	غازان
۲۶۹-۷۱	فریدرک	۱۳۷۱۱۲۹-۳۲۱۵۷	(امام ابو حامد محمد) الغزالی
۷۱	فضل بن حیاض	۱۵۵-۵۸۱۱۵۳۱۱۵۱۱۳۵-۲۹۱۱۳۰-۲۲	
	(ق)	۱۸۳۱۱۸۳۱۱۷۷۱۱۶۸۱۱۶۷۱۱۶۱۱۶۰	
۳۲۶	قآن	۲۳۸۱۱۹۷۱۱۹۵۱۱۹۴۱۱۹۲۱۱۸۶-۹۰	
۳۰۳۳	قاسم بن محمد	۳۳۶۱۳۰۲۱۲۸۸	
۳۰۵	قادر حسینی	۳۳۱	(سلطان) غیاث الدین
۱۰۰	قتیبہ	(ف)	
۲۳۹	قرمطی	۲۸۲۱۲۳۸	(حضرت) فاطمہ
۳۲۸	قطب الدین شیرازی	۲۷۵	(قاضی) فاضل
۹۵	قواریری	۲۸۳	الفارزدین اللہ
۱۸۸	قوام الدین	۲۹۴۱۲۹۳	فخر الدین عثمان
۳۳۳۱۳۱۷	قوبلانی خان	۱۸۷۱۱۶۱۱۱۲۸	فخر الملک طوسی
۲۶۹-۷۱۱۳۵	قیمر	۳۳	فرزدق
	(ک)	۱۷۲	فرعون
۲۷۲	کاشلین	بدیع الزمان	فروردانفر

۱۹۸، ۹۵، ۹۳، ۹۲، ۸۵، ۷۹، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	ماہون	۸۲	(شمس الاثر) کردری
۲۳۱	متنبی	۲۳۳	گرگز
۱۱۹، ۱۱۰، ۱۰۳، ۹۳، ۹۲	متوکل بالشر	۲۵	کسری
۲۶۱	مجاہد الدین ہرروز	۳۴۲	کمال الدین ابن العظیم
۳۰۶	مجاہد الدین ایکب الدویدار		(ک) (ل)
۱۶۲	مجیر الدین	۲۶	گانڈھی جی
۸۲	(امام) محمد	۲۶۶، ۲۶۵	گانی
۳۲۶	(سلطان) محمد (احمد)	۳۱۷	گبن
۱۱۵، ۸۹	محمد البوزہرا	۲۶۸	گودرے
۱۲۵، ۹۹	محمد بن اسماعیل	۳۲۴	گیوگ خاقان
۱۹۷	محمد بن حسن باقلانی	۲۸۱، ۲۶۲، ۶۴، ۲۵۲، ۵۵	(اسٹینلے) لین پول
۱۲۲	محمد بن حسن دہلی یانی		(۳)
۵۵	محمد بن سیرین	۲۳۶، ۱۲۶	سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام
۲۶	محمد بن عبدالحکم	۸۶	(حضرت) ثنی بن حارثہ
۱۹۱-۹۳	محمد بن عبدالشہرت	۲۸۲	(حضرت) معاویہ
۱۸۷، ۱۶۱	محمد بن ملک شاہ	۳۱۵	ماہوج
۹۴، ۹۱، ۶۲	محمد بن فخر روزی	۲۱	مارٹن لوتھر (M. LUTHER)
۹۵	محمد بن نوح	۲۸۲، ۱۵۴، ۱۸۰، ۸۲، ۶۸	(امام) مالک
۳۳۸	محمد بہار الدین	۲۳۷	مالک بن دینار





۱۳۱	فلاسفہ عرب	۳۰۷	سلاطین بنی ایوب
۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۵-۱۴۶-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷-۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰	۳۱۲	سلاطین خوارزم شاہی	
۳۶۲۱۳۳۵۱۱۶۲		۲۰۶۱۶۱	سلاطین سلجوقیہ
۱۲۷	قادانی	۲۵۵۱۱۷	سلجوقی
۲۶۱	قبیلہ روادبیہ	۲۲	سنگھ
۹۷	قبیلہ عبدالقیس	۸۶	شیبان (قبیلہ)
۱۹۲	قبیلہ مصادمہ	۳۰۹، ۳۰۸	شیعہ
۲۶۱	قبیلہ ہذاتہ	۷۲	صابی
۱۰۹	قدریہ	۱۰۹۱۰۵۱۸۴۷۵۱۶۲۱۷۱۵۵-۵۸	صحابہ کرامؓ
۱۱۵	قراطہ	۳۱۹۱۲۲۵۱۱۵۹۱۱۵۸۱۱۵۵۱۱۵۲۱۱۲۱۱۱۲۱۱۱	
۳۲۷	قزلباشی (کورتاشی)	۲۷۳۱۲۷۰۱۲۶۹۱۲۶۴۱۲۵۶۱۲۵۵۱۲۵۳۱۱۹	صلیبی
۵۰	قریشی	۳۱۰-۲۸۱	
۲۷۱، ۲۶۱	کرد	۲۵۴، ۲۰۶	عباسی خلفاء
۱۳۴	کفار و مشرکین	۶۹	عجمی
۱۱۵	کارتیدی	۲۷۱، ۲۵۵، ۲۴۰، ۱۱۲، ۱۹۰، ۱۶۱، ۱۴۹، ۱۴۷، ۱۳۱	عرب
۱۸۶، ۱۸۴، ۱۱۱، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۰، ۸۱، ۸۴	مکملین	۳۱۲، ۳۱۱، ۳۰۱، ۲۸۱	
۳۹۷، ۳۹۶، ۳۶۲، ۳۳۵		۲۵۵، ۲۵۴، ۲۰۲، ۲۰۱، ۱۱۱، ۱۳۱، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	عیسائی
۱۱۲، ۲۰	مجددین	۳۱۹، ۲۷۱، ۲۷۰، ۲۶۸، ۲۶۵، ۲۶۱، ۲۶۰	
۲۰، ۱۱۱، ۱۱۰، ۸۱، ۲۱، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	محدثین	۳۵۷، ۳۲۹، ۳۲۵، ۳۲۱	
		۳۰۶، ۳۰۵، ۲۹۵، ۲۶۱، ۲۶۰	فرنگی



(اسلام آرٹوگرسچیانٹی (ISLAM OR TRUE -

21 CARISTIANITY)

285 اشارات (ابن سینا)

112, 113 الأشعری ابو الحسن

46 الاصابہ فی احوال الصحابہ

4, 132, 130 الأغانی

31-130-4 (رسالہ) الأتلام

184, 186 انجام العوام عن علم الکلام

183, 182 الفیہ

68 امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی

354, 21 انجیل

253, 252, 251, 222 انسائیکلو پیڈیا ریٹرانیکا

25 انسائیکلو پیڈیا ریٹرانیکا اینڈ انٹیکس

113 ایضاح البرہان

125, 122 (ب)

399, 399 بال جبریل

39, 38, 37, 35, 26, 19, 4 البدایہ والنہایہ

33, 32, 31, 30, 33

189 ابرہان

بھگوت گیتا

(ت)

183 اتجاج المکمل

228, 110, 214, 91, 42, 233 تاریخ ابن خلکان

322, 321 تاریخ الخلفاء للسيوطی

178 تاریخ الاخلاق

102, 98-100, 93, 91, 84 تاریخ الاسلام للذہبی

40 تاریخ اصبہان

314 تاریخ الخطا و سقوط روما

10, 195, 142 تاریخ بغداد

9 تاریخ دعوت و عزیمت

92 تاریخ صغیر

95, 50 تاریخ طبری

314 تاریخ عهد وسطی

125, 122 تاریخ فلاسفۃ الاسلام

316, 314, 313, 308, 256-261, 260 تاریخ الکامل

92 تاریخ کبیر

115 تاویلات القرآن

113 التیسین عن اصول الدین





سیرت عمر بن عبد العزیزؓ ۲۰۱۳-۱۳۶-۱۳۵-۱۳۴-۱۳۳-۱۳۲-۱۳۱-۱۳۰-۱۲۹-۱۲۸-۱۲۷-۱۲۶-۱۲۵-۱۲۴-۱۲۳-۱۲۲-۱۲۱-۱۲۰-۱۱۹-۱۱۸-۱۱۷-۱۱۶-۱۱۵-۱۱۴-۱۱۳-۱۱۲-۱۱۱-۱۱۰-۱۰۹-۱۰۸-۱۰۷-۱۰۶-۱۰۵-۱۰۴-۱۰۳-۱۰۲-۱۰۱-۱۰۰-۹۹-۹۸-۹۷-۹۶-۹۵-۹۴-۹۳-۹۲-۹۱-۹۰-۸۹-۸۸-۸۷-۸۶-۸۵-۸۴-۸۳-۸۲-۸۱-۸۰-۷۹-۷۸-۷۷-۷۶-۷۵-۷۴-۷۳-۷۲-۷۱-۷۰-۶۹-۶۸-۶۷-۶۶-۶۵-۶۴-۶۳-۶۲-۶۱-۶۰-۵۹-۵۸-۵۷-۵۶-۵۵-۵۴-۵۳-۵۲-۵۱-۵۰-۴۹-۴۸-۴۷-۴۶-۴۵-۴۴-۴۳-۴۲-۴۱-۴۰-۳۹-۳۸-۳۷-۳۶-۳۵-۳۴-۳۳-۳۲-۳۱-۳۰-۲۹-۲۸-۲۷-۲۶-۲۵-۲۴-۲۳-۲۲-۲۱-۲۰-۱۹-۱۸-۱۷-۱۶-۱۵-۱۴-۱۳-۱۲-۱۱-۱۰-۹-۸-۷-۶-۵-۴-۳-۲-۱

۳۲۲

دی گین

۸۲

سیرة النعمان

۳۲۹۱۳۵۵

دیوان مولانا روم

(ش)

(ذ)

۲۴۸

الشامل

۲۰۳۱۲۰۲۱۱۹۸

ذیل طبقات الختابلہ

۳۰۲

شجرة المعارف

۳۲۱

ذیل المرأة

۸۲

شذرات الذهب فی اخبار من ذهب

(س)

شرح احیاء العلوم ویکھئے

۱۱۹

الرد علی المنطقیین

الشرح والتفصیل فی الرد علی اهل الاثرک التفضیل

۲۸۵۱۱۲۲

رسائل اخوان الصفا

۲۸۵

شقار (ابن سینا)

۲۱۳۱۲۱۲۱۲۱۰۱۲۰۹۱۲۰۶۱۲۰۵

رموز الغیب

(ص) (ض)

۳۲

زنان الثالث

۳۲۵۱۳۳۷

صاحب الثنوی

(ن)

۷۹

صباح سہ

۲۸۸

زاویہ غزالیہ

۲۱

صحف مقدسہ

زندگانی مولانا جلال الدین ۲۲۹۱۲۵۱۳۲۳۱۳۲۹

۱۸۹۱۸۰۱۷۹۱۲۰

صحیح بخاری

۳۵۴۱۳۵۲

۱۸۹۱۸۰

صحیح مسلم

(س)

۸۰

صحیحین

سلطان صلاح الدین (لین پولی) ۲۶۲۱۲۵۴-۵۶

۲۳۷۱۵۱۳۳

صفة الصفوة

۲۸۱۲۷۳۱۲۷۰۱۲۶۵۱۲۶۳

۶۵

صفة النفاق ودم المنافقین

۸۰

سنن ابی داؤد

۲۶۱

صلاح الدین الیوبی (محمد فرید)

۳۶۰

سوانح مولانا روم

الصواعق المرسله

٢٨٦١٢٨٥

٢١٠١٢٠٨

الفتح الرباني

صيد الخاطر ٢٩٠-٢٣١-٢٣٣-٢٣٤-٢٣٥-٢٣٦-٢٣٧-٢٣٨-٢٣٩-٢٤٠-٢٤١

٢٤٨

الفتح القسي في الفتح القدي

٢٥٠١٢٤٥-٢٨

٢٩

فتوح البلدان

١٢٣

٢٠٩١٢٠٨١٢٠٦١٢٠٥

فتوح الغيب

صحي الاسلام

٨١

فتوح الاسلام

(ط)

٦٥

١٢٤

فريخ انسا ميكلو پيڊيان اسلام

طبقات ابن سعد

٢٩٥١٩٢

١٢٦

فضائح الاباحية

طبقات ابن السكيت

٢٩٣٠٢٨٨١١٣١١١١٦ طبقات الشافعية الكبرى

١٦٨

فلسفة الاخلاق وصلاتها بالفلسفة الاغريقية

٣١٩١٣٠٢١٣٠٠١٢٩٩١٢٩٤١٢٩٥

٦٥

فوز الكبير

٢٠٣١٢٠٢١١٩٩ طبقات الكبرى للشعراني

١٨٦١١٨٥

فصل التفرقة بين الاسلام والزندقة

(ع) (غ)

٢١٨١٢١٤١٢١٥١٢١١١٢١٠

فيوض يزداني

١٢٥ عاصمة نفوس المتدين وقاصمة ظهور المعتدين

(ق)

١٢٦

قاصم الباطنية

٣٠٦

الحسيدي المسبوك

٢١٦١١٩٩-٢٠٢

قلائد الجواهر

١١٥

عقائد عضديه

٨٢

قلائد العقود العقيان

٤٩١٤٦

علماء سلف

١٢٦

قواعد عقائد آل محمد

٢٢٢

حوادث الحارث

٣٠٢

القواعد الكبرى

١٩٣١١٨٩١١٦٤١١٣٤

الغزالي

١٣٢

قوت القلوب

(ف)

٦٢

قيام الليل

١٨٣١١٨٢

فتاوى شيخ الاسلام ابن تيمية

۳

ک

۷۱	النامون	۱۱۰۱۰۹	کتاب الابانہ عن اصول الديانہ
۳۶۲، ۳۶۶، ۳۵۵، ۳۵۴، ۳۳۷	ثنوی معنوی	۱۱۳	کتاب الاجتهاد
۳۹۸، ۳۹۷، ۳۸۴-۸۷، ۳۶۳-۷۸		۸۲	کتاب الأم
۳۰۲	مجاز القرآن	۷۰	کتاب الحيوان
۲۶۲	المحاسن اليوسفيه	۸۲، ۳۷	کتاب الخراج
۸۲	المدونه	۲۸۳، ۲۸۲	کتاب النخط والآثار
۳۱۶	مرصاد العباد	۲۸۶، ۴۸۴، ۲۸۳	کتاب الروضتين في اخبار الدولتين
۲۲۴	مرآة الجنان لليافعي	۲۸۸	کتاب العبر
۳۰۵	مرآة الزمان	۱۱۳	کتاب العهد
۳۳۷	مرآة المشنوی	۱۱۳	کتاب الملح
۱۸۹	المستصفی	۱۱۳	کتاب الفصول
۱۵۸، ۱۵۶، ۱۳۴	مستظہری	۱۱۳	کتاب القياس
۱۱۴	مسلم کريڈ (MUSLIM CREED)	۱۱۳	کتاب الموجز
۱۰۱	مستد امام احمد	۲۸۱	الكشف عن اسرار الباطنية
۱۸۹	المعتد	۲۸۱	كشف ما كان عليه بنو عميد
۱۹۸، ۱۸۲	المعنى	۳۲۰	کليات سعدی
۱۲۶	مفصل الخلاف		
۳۰۲	مقاصد الصلاة	۲۳۳، ۲۲۶	افئدة الكبد في نصيحة الولد

ل

۲۲۸۱۸۰

موظا

۱۳۲،۱۳۱

مقاصد القلاصف

(ن)

۱۱۳،۱۱۳

مقالات اسلاميين

۱۲۸

نظام الملك طوسي

۶۹

مقدمه ابن خلدون

۱۶۱

نصيه الملك

۷۹،۷۸

مقدمه فتح الباري

۳۳۷

نقد المتنوي

۳۲۶

مقريري نوم

۲۶۷،۲۶۴،۲۶۲

النوادر السلطانية

۱۶۱

مکتوبات امام غزالي

۲۷۸-۸۱،۲۷۶

۹۲،۸۷

مناقب ابن الجوزي

(و)

۸۱،۶۸

مناقب ابی حنیفہ

۲۲۴

وفيات الاحيان

۹۲

مناقب حافظ ذہبی

۳۳۳،۳۳۰

وہوسن

۳۳۳

مناقب العارفين

(د)

۳۸

مناقب عمر بن عبد العزیز

۳۲۴،۳۲۳

ہوورقہ

۱۸۴،۱۸۳

المنظوم فی تاریخ الملوک والامم

۲۴

ہندوستانی تمدن

۲۵۷،۲۴۹،۱۹۷

۳۲۶

ہیوم

۱۳۶،۱۳۱،۱۳۱

المتقدمین الضلال

(س)

۳۵۴

منطق الطیر

۲۳۶

یوسف زلیخا

۱۸۴،۱۸۲،۱۳۷

منہاج القاصدین

۱۳۶

مواہب الباطنیہ

## مقامات

۱۲۲۱۲۶۱۲۵	اندلس		(الف)
۲۵۶۱۲۵۴۱۲۵۳	انطاکیہ	۳۱۳	اترار
۲۵۳	انطوطوس	۲۴۹	احسا
۲۱۲۱۲۶۹-۲۱	انگلستان	۲۶۱۱۱۹۷	آذربائیجان
۲۵۵	ایڈیسیا	۳۴۴۱۲۷۰	اردن
۳۰۷۱۲۶۱۱۱۹۷۱۱۲۷۱۸۸۱۸۰۱۷۸	ایران	۲۷۱	ارسوف
۳۴۰۱۳۳۹۱۳۳۳۱۳۳۰۱۳۲۹۱۳۲۶۱۳۱۲۱۳۱۱		۳۴۸	ارمن
۷۶۱۷۲۷۲۴	ایشیا	۲۷۲	ارمنیہ
۳۱۰	ایشیا کوچک	۳۱۲۱۱۹۲۱۱۹۱۷۷۶۱۷۳	اسپین
۲۷۱	ایلیہ	۲۷۰۱۲۶۹	آسٹریلیا
	(ب)	۱۲۱	اسفرائن
۹۶	باب البستان	۲۵۶۱۱۹۲	اسکندریہ
۱۹۲	بجایہ	۱۲۸	اصقہان
۳۲۵۱۳۱۳۱۷۵	بخارا	۱۹۲	افغانات
۹۷	برز	۳۳۸	افغانستان
۲۷۰	برگنڈی	۲۲۱۱۸۲۱۷۶۱۷۳۱۵۰	افریقہ
۱۰۷۱۱۰۵۱۸۷۱۸۶۱۷۷۱۷۵۱۷۷	بصرہ	۳۳۰	آقشہر



خ

خراسان ۳۲۰۳۳۸۳۲۹۱۶۰۱۸۶۱۷۶۱۷۱۲۹

خلیج عجم

۳۱۱

خوارزم

۳۱۳

ح

دائرة شاه علم الشرع

۱۶۱۰

دشت

۳۲۰۲۹۱-۹۳۱۲۸۸۱۲۸۷۱۳۶۱۶۷

۲۵۱۲۵۷۱۲۵۸۱۲۵۹۱۲۶۰

دیپا

۳۰۶۱۲۵۶

دوبن

۲۶۱

س خ

رائے بریلی

۱۶۱۰

الرحا

۲۵۵۱۲۵۳

رجب خان

۷۹

رقة

۱۰۰۱۹۶۱۹۵۱۷۱

رلمہ

۲۷۶۱۲۷۰

روس

۳۱۷

روم

۳۵۳۱۳۵۱۳۵۲۱۳۵۳۱۳۵۴۱۳۵۵۱۳۵۶۱۳۵۷۱۳۵۸۱۳۵۹

رے

۳۱۶۱۳۱۷۱۳۱۸

زنجان

س

۳۲۱۳۲۲

سرخس

۸۶

ساڑا

۲۲۱

سرقند

۳۱۴۱۱۱۵

سنجاس

۳۲۳

سویدن

۳۱۷

سویز

۷۶

سیرادورا

۳۲۵

ش

شام ۲۷۱۲۶۷۱۲۶۸۱۲۶۹-۵۶۱۸۷۱۸۰

۳۲۲۱۳۲۳۱۳۲۴۱۳۲۵-۱۳۰۵۱۲۸۹۱۲۸۸-۸۶

۳۵۱۳۴۸۱۳۴۵

شیراز

۱۰۷

ص

صحرانوبہ

۲۷۲

صخرہ

۱۳۶

صقلیہ

۲۷۰۱۲۶۹

صغارا

۸۸

۳۲۲، ۳۲۱	عین جالوت	۲۷۲	صور
	(ف)	۲۹۱	صیدا
۲۶۹-۷۱	فرانس		(ط)
۲۷۰	فلانڈرز	۱۸۹، ۱۱۳۰	طابریان
۲۷۰، ۱۲۶۳-۶۵، ۲۵۶، ۲۵۲-۵۳	فلسطین	۲۵۶، ۲۵۳، ۲۵۴	طرابلس الشرق
	(ق)	۹۵	طرطوس
۲۲۵، ۲۸۵	قاہرہ	۷۶	طنجہ
۲۵۳	قدس	۱۸۸، ۱۸۷، ۱۶۲، ۱۱۳۰	طوس
۳۱۳	قراقرم	۳۱۸	طہران
۳۱۳	قزوین		(ع)
۲۷۲	قسطنطنیہ	۸۸، ۸۷، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	عالم اسلام
۲۹۰	قصیرہ	۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
۲۳۳	قصیرہ	۳۱۲، ۳۱۱، ۲۹۵، ۲۸۷، ۲۸۶، ۲۸۵، ۲۸۴، ۲۸۳، ۲۸۲، ۲۸۱، ۲۸۰، ۲۷۹، ۲۷۸، ۲۷۷، ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۴، ۲۷۳، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۸، ۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۵، ۲۶۴، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۶۰، ۲۵۹، ۲۵۸، ۲۵۷، ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۴، ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۵۱، ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷، ۲۴۶، ۲۴۵، ۲۴۴، ۲۴۳، ۲۴۲، ۲۴۱، ۲۴۰، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵، ۲۳۴، ۲۳۳، ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۳۰، ۲۲۹، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۲۴، ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	
	(ل) (ک)	۳۹۸، ۳۹۷	
۳۳۳، ۳۳۱	کاشغر		
۳۳۳	کانسوا	۱۹۷، ۱۷۵	عمیم
۲۷۲	کردستان	۲۷۱، ۳۳۳	عرب
۲۹۳	کرک	۲۸۱، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۵۴	کرک



۲۳۰	کر و معطر	۲۴۳	انکلاسه
۲۹۵	مناظره	۷۸۱۵۷	ککته
۲۲۰	ملاطیه	۳۱۷	کوفه
۲۵۲	موندسج (بیت اللحم)	۳۳۰	کیمبرج
۱۹۲	مهدیه	۱۱	لارندا
۳۰۵	نابلس	۱۹۷	نکضو
۳۱۴/۱۸۷/۳۹/۱۳۰/۱۱۷/۱۱۶	نیشاپور	۱۱۴/۱۴۹	نارندان
۳۳۹	هرات	۲۵۲/۱۳۷/۸۷/۶۸/۳۶/۳۴/۳۳	نارینه منوره
۳۱۶/۳۱۴	همدان	۳۰۵/۲۶۶	مراکش
۲۲۴/۲۲۱/۱۲۷/۱۲۹/۲۲-۲۶/۱۵۱۹	هندوستان	۱۹۲	مرو
۳۹۸/۳۱۰/۳۰۴/۲۵۰		۳۱۴/۱۸۶	مشرع الزوایا (بغداد)
۲۷۸-۷۱/۲۶۶/۲۶۴/۲۵۶/۲۵۴	یروقم	۱۱۴	مصر
۲۷۹/۲۵۲/۱۹۳/۱۷۱/۱۷۰/۱۶۸	یونان	۲۶۱/۲۵۸/۲۵۶/۱۹۲/۱۱۵/۸۲/۸۰/۷۵	
۳۹۸	یونان	۱۲۸/۱۲۸/۱۲۸/۱۲۸/۱۲۸/۱۲۸/۱۲۸/۱۲۸	
	یمن	۳۲۶/۳۲۵/۳۲۱/۳۱۰/۳۰۶/۲۵۱/۲۹۰-۹۹	
	یروشلم	۲۸۵/۱۹۲/۱۳۵/۱۲۹	مغرب
	یونان	۱۸۸	مقام قلیل

Marfat.com

# منقرقات

بیت المقدس۔ مسجد اقصیٰ ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۳، ۱۳۶

۲۹۲، ۲۸۶، ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۷، ۲۶۲  
۲۰۳

۲۸۸ جامع اموی

۱۳۶ جامع مسجد دمشق

۲۵۱ جامع منصور بغداد

۲۵۳ مسجد عمر

۱۲۶ باب کعبہ

۲۵۴ روضۃ الطہر

۲۰۳ مطاق

۲۲ چوچ

۲۲ کلیسا

دریں گاہیں اولیٰ اور مطالع:

۲۵ الفسٹن کالج بمبئی

۱۶۸ جامعۃ القاہرہ

۳۱۸ طہران یونیورسٹی

۳۲۲ مدرسہ خلاویہ۔ حلب

۳۳۱ مدرسہ خداوندگار

قلعہ نہر و دریا:

۳۲۱ قلعہ ایلیان

۲۶۱، ۲۵۶ قلعہ بانیاں

۲۶۱ قلعہ بعلبک

۲۶۱، ۲۵۶ قلعہ حارم

۲۵۹ قلعہ حصن الاکراد

۷۶ بحر احمر

۳۱۰ بحر خوارزم (آرال)

۱۹۷ بحر قزوین

۲۴ بحر انکابل

۲۴ بحر ہند

۳۱۰ خلیج عجم

۳۰۶ وجلہ

۳۰۶، ۲۵۵ قرات

۲۳۶ کوہ طور

مساجد مقدس مقامات و معجز:

۳۰۷، ۳۱۱، ۳۱۶ بیت اللہ شریف (کعبہ)

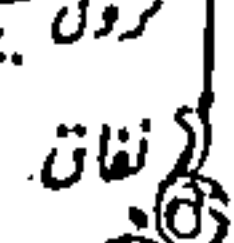


۱۲۶/۱۲۴	جنت	۳۲۹	مذہب شامان
۹۱	جہاد	۲۲۲،۲۰-۲۳۱۰	مذہب عیسائی-مسیحیت
۱۶۴/۱۳۷/۱۲۶/۱۲۴/۱۸۸/۳۶	حج و زیارت	۲۶-۲۸	(عقیدہ) وحدۃ الوجود
۸۸/۸۴/۷۸-۸۱/۷۳-۷۵/۴۰/۲۹	حدیث	۲۲-۲۵/۱۰	ہندومت-ہندو مذہب
۱۸۴/۱۸۳/۱۷۰/۱۳۹/۱۳۳/۱۲۵/۱۸۹			مذہبی، اسلامی اور اصطلاحی الفاظ:
۱۵۹/۱۲۴	حرام	۱۳۳	اجماع
۱۵۷/۱۲۴/۱۹۰	حلال	۱۳۸/۱۳۵/۱۲۶	آخوت
۱۵۷/۱۲۷/۱۳۸	خواجه	۴۳	اسلام
۱۲۷	ختم نبوت	۷۳/۵۳	اسلامی معاشرہ
۱۵۳/۱۳۱/۱۷۷/۱۵۱/۴۰/۳۹/۳۵/۲۹/۱۸۹	خلافت	۱۵۵/۱۵۴	بحث و مناظرہ
۱۲۷	دجال	۱۹۱/۸۱	بیعت
۱۲۶/۱۲۴	دوزخ-جہنم	۱۵۵	تذکرہ
۱۲۴	رسالت	۱۳۷/۱۳۶	ترکیہ
۴۱	رسم حلف-محالفت	۲۲۴/۱۹۱/۱۶۳/۱۳۷/۱۳۶/۱۳۸	تصوف
۱۵۷	رشوت	۸۵	تقدیر
۱۲۶/۱۲۴	روزہ-صیام	۱۵۵/۲۵	توحید
۱۵۱	ری	۴۱/۳۲/۳۱	جاہلیت
۸۵	رؤیت باری	۸۵	جبر و اختیار
۱۲۶/۱۲۴/۱۵۰	زکوٰۃ		
۱۵۱	سبق	۴۷/۳۷	تزیین



وحي ۱۲۶/۱۱۲۳/۱۱۱۱/۸۹۶۵  
 وضو ۱۲۷  
**علوم و فنون:**  
 اخلاقيات ۱۳۳  
 اصول فقه ۱۰۸  
 رياضيات ۱۴۲/۱۳۳/۱۲۲  
 سانس ۳۹۸  
 سنکرت ۲۶  
 سيايات ۱۳۳  
 طبيعات ۱۴۲/۱۳۱/۱۳۴/۱۳۳/۱۳۸/۱۲۲  
 علم الاصنام ۱۲۰  
 علم تصوف ۱۳۶  
 علم الکلام ۱۲۸/۱۲۷/۱۱۸/۱۱۵/۱۱۳/۱۰۸/۱۲۹/۱۲۸  
 ۱۸۶/۱۸۴/۱۶۳/۱۵۵/۱۵۴/۱۴۵/۱۴۱/۱۳۳  
 علم سنييت ۱۲۸  
 علوم شرعيه ۲۸۷  
 علوم عقليه - عقليات ۱۸۹/۱۳۲/۱۲۸/۱۲۲/۱۱۳  
 ۱۹۱  
 علوم نقلیه ۱۹۰/۱۸۹/۱۲۸  
 فقه ۱۵۵/۱۷۴/۱۷۳/۱۲۹

سنت ۱۰۴/۹۰/۲۱۹۸/۱۹۴/۱۹۲/۱۸۹/۱۳۹/۱۳۱/۱۲۹  
 ۲۰۵/۲۸۵/۲۸۳/۲۴۴/۲۴۳/۲۳۳/۲۳۲/۲۳۱/۱۱۱  
 شريعت ۱۲۴  
 صلاة - نماز ۱۲۶/۱۲۴  
 ظهار ۱۵۱  
 عجمي روح ۶۹  
 عربي روح ۶۹  
 عقل اول ۱۲۸  
 فرض واجب ۱۲۷/۱۲۴  
 قيامت ۶۲  
 لعان ۱۵۱  
 مبداء اول ۱۲۴  
 منته ۸۵  
 مستحب ۱۲۷  
 معاد ۱۲۶/۱۲۴/۱۲۳  
 معجزه ۱۸۴/۱۷۷/۱۷۷/۱۳۴  
 ملائکه ۱۵۹/۱۲۶/۱۳۴  
 نبوت ۱۲۴/۱۲۳/۱۱۱/۸۹/۵۷/۵۴/۵۳/۳۹/۱۳۷  
 ۱۳۸/۱۲۷/۱۲۶  
 نزول مسيح ۱۲۷  
 نفاق ۶۳-۶۶



حکومت امویہ - خلافت امویہ ۶۹۱۶۷۱۵۸۱۲۲

۸۲

فقہ اسلامی

۳۵۱۳۱ خلافت راشدہ

۱۶۷۱۱۳-۱۸۲

فقہ شافعی

۱۸۸۱۸۵۱۶۹۱۶۷ خلافت عباسیہ سلطنت عباسیہ  
۳۱۹۱۳۱۸۱۳-۷

۸۲

فقہ مالکی

۳۰۸ خوارزمی سلطنت

۱۲۱۱۲۸۱۲۵۱۲۳۱۱۱۹-۲۱۱۱۱۱۱۱۸۳۱۲۹۱۲۵

۳۲۶ دولت ایلمخانیہ

۳۹۲۳۳۵۱۱۸۲۱۱۵۶۱۱۳۳-۳۶۱۱۳۲۱۱۳۱۱۳۸  
۳۹۸

۳۳۳۱۳۲۹ دولت مغلیہ

۱۶۸

فلسفہ اخلاق

۳۳۳۱۳۳۲ خقانیہ سلطنت

۱۲۱۱۳۳۱۲۸۱۱۲-۲۲۱۸۳ الہیات-الہیات  
۱۳۲۱۱۳۱

۳۱۰۱۲۵۳۱۲۵۲ سلجوقی سلطنت

۷۶

فن اسماء الرجال

۲۸۳۱۳۸۲ عبیدی سلطنت (فاطمی)

۸۵

مسئلہ عدل

۲۵۵ لاطینی سلطنت

۱۳۵

معقولات

۲۵۳ ولایت انطاکیہ

۱۳۲۱۱۳۱۱۱۳۳

منطقیات

### عہد و ادوار:

۸۰ زمانہ صحابہ

۱۲۲۱۱۲۰۱۸۵۱۸۳

زبان:

۸۶۱۵۱۱۳۱-۳۳ عہد اموی

۱۲۰۱۸۳

سریانی

۱۳۸۱۸۰۱۶۵۱۶۳ عہد رسالت - عہد نبوت

۱۲۰۱۲۶۱۲۵

سنگرت

۸۶ عہد صدیقی

۱۲۰۱۳۳

عربی

۳۰۶۱۲۰۶ عہد عباسی

۱۲۰

فارسی

سکے:

۱۲۰

یونانی

### سلطنتیں و حکومتیں:

اشرفی

۳۳۳

تاریخ سلطنت

۲۵۴

واقعہ ارتداد

۳۳۱

چاندی

۲۵۹

واقعہ حصن الاکراد

۷۷۱۶۹۱۳۶

دینار

۶۸

واقعہ کربلا

۶۹

روپیہ

۲۶۴

جنگ حطین

۳۳۱۲۳۲

سونا

۳۲۷

جنگ خارا

۶۹

قنطار

۲۵۹

معرکہ بقیعہ

۷۷

گنی

دیگر مستقرات:

تحرکات و سلاسل طرق:

۲۴-۲۶

بت - مورت

۲۸۵۱۲۲۱۲۱

اخوان الصفا

۲۸۴

بحر

۱۱

جماعت اصلاح و تبلیغ لکھنؤ

۱۸۱

چقاق

۱۲۱

فری مشن

۳۳

حجر اسود

۲۲۱

سلسلہ قادریہ

۱۷۷

زقوم

۲۲۴

طریقہ اسپروردیہ

۱۷۵

شطنج

اہم واقعات و معرکے:

۲۸۸

صلاة الرغائب

۱۲۶

آتش نرود

۳۲۰۱۳۲

صلیب

۱۲۶

ذبح ابراہیم

۲۰۸

صنوبر

۱۲۶

طوفان نوح

۷۰

عنبر

۱۲۶

عصائے موسیٰ

۷۵

فرسخ

۱۰۳

فقہ اعترال

۷۰

مشک

۱۲۳

فقہ باطنیت

۲۸۲

ملوخیہ

۲۰۳/۹

فقہ اتاتار

۹۱

منجیق

۹۵۱۹۴۱۹۱۹۰۱۸۴

فقہ اخلاق قرآن

